

# مکتوباتِ اقبال

سید نذیر نیازی

# مکتوباتِ اقبال

حکیم الامت حضرت علامہ اقبال
کے ان مکتوبات کا مجموعہ جو وقتاً فوقتاً مرتب کے نام
لکھے گئے

مرتبہ
سید نذیر نیازی

ناشر
اقبال اکادمی پاکستان
۹۰۔بی۔۲۔گلبرگ III۔لاہور

سلسلہ مطبوعات اقبال اکادمی پاکستان - لاہور

باراول ——————— ستمبر ۱۹۵۷ء
باردوم ——————— اکتوبر ۱۹۷۷ء
طابع اول ——————— نقوش پریس لاہور
طابع دوم ——————— فالکن پرنٹنگ پریس لاہور

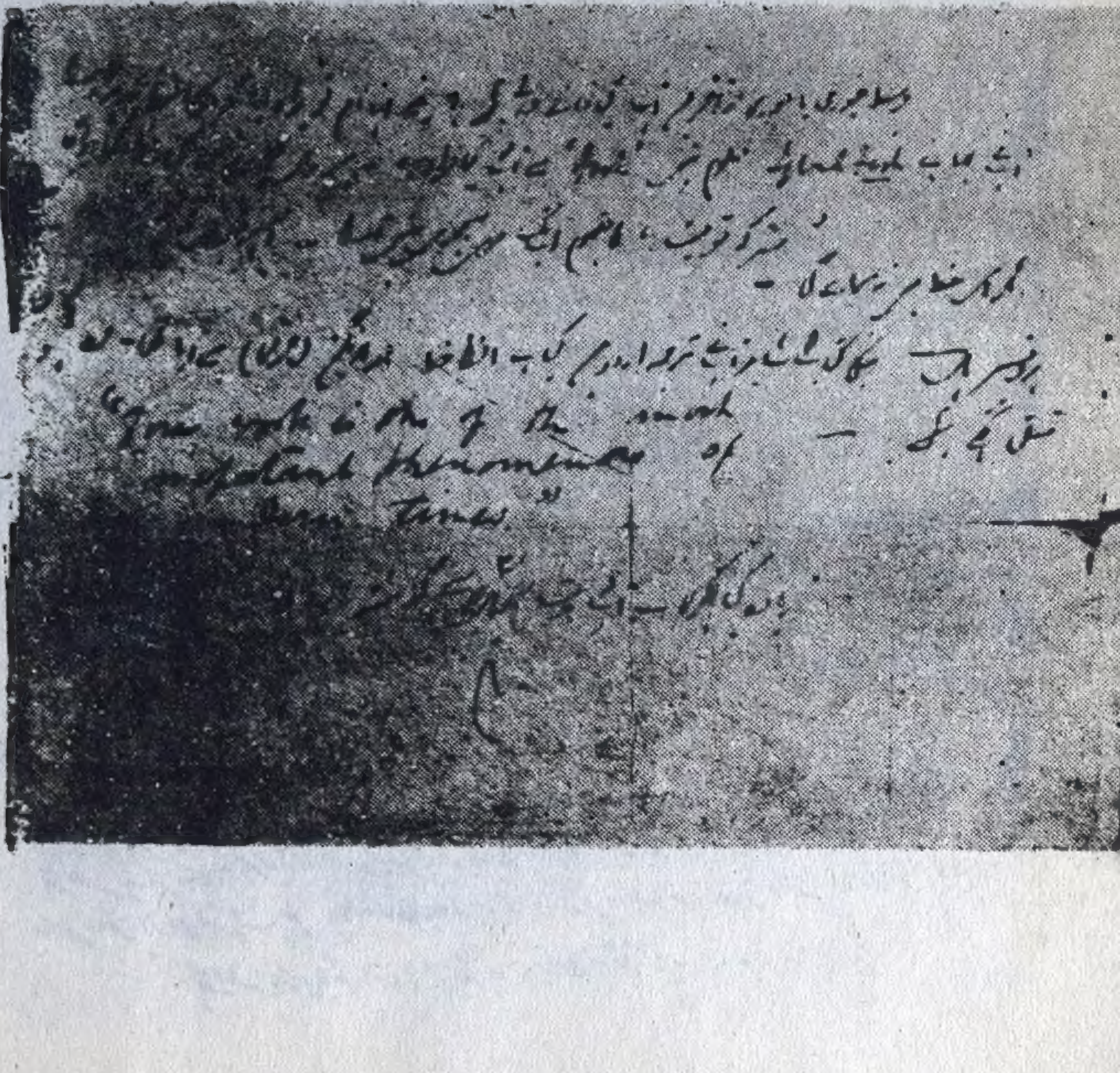
ناشر
اقبال اکادمی ۔ پاکستان ۔ لاہور

ممتاز حسن کے نام

## مشمولات

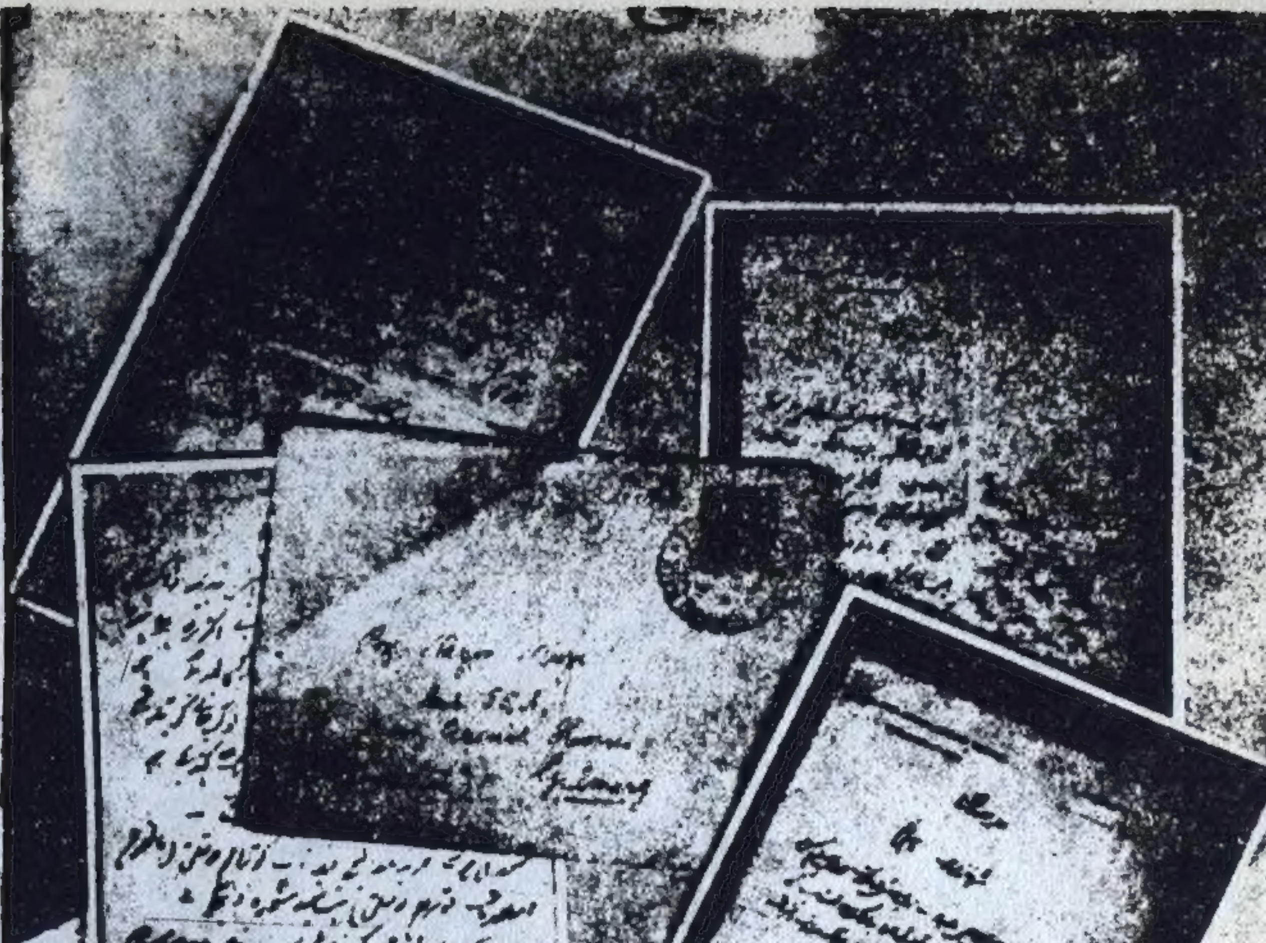
عکسی نقول بعد از سرورق


DR. SIR MUHAMMAD IQBAL.
LAHORE.



"Your work is one of the most important phenomena of our times."


TUCK'S POST CARD



# تمہید

مکتوباتِ اقبال کا یہ نسخہ میں اپنے عزیز دوست اور کرم فرما جناب ممتاز حسن صاحب کے اصرار پر مرتّب کر رہا ہوں۔ جیسا کہ آئندہ صفحات میں عرض کر دیا گیا ہے، حضرتِ علامہ سے باقاعدہ خط و کتابت کا آغاز ۱۹۲۹ میں ہوا۔ ابتدا میں 'پیامِ مشرق' کی طباعت اِس کا سبب بنی۔ پھر انگریزی خطبات تشکیلِ جدیدِ الٰہیاتِ اسلامیہ کے اُردو ترجمے نے اس سلسلے کو اور آگے بڑھایا۔ یہ آج سے چھبیس ستائیس برس پہلے کی بات ہے جب میں دہلی میں مقیم اور جامعۂ ملّیۂ اسلامیہ کے حلقۂ اساتذہ میں شامل تھا۔ ۱۹۳۱، ۳۲، اور ۳۳ میں حضرتِ علامہ خلافِ معمول لاہور سے باہر رہے۔ دو مرتبہ گول میز کانفرنس لندن میں شرکت فرمائی۔ پہلی مرتبہ موتمرِ اسلام کی دعوت پر بیت المقدس تشریف لے گئے۔ دوسری بار فرانس سے ہوتے ہوئے گلستانِ اندلس — قرطبہ اور غرناطہ — کی زیارت کی۔ سفر و سیاحت کے ان ایام میں خط و کتابت کا سلسلہ بڑی حد تک منقطع رہا اور نہ بھی رہتا تو میرے اپنے لیے یہ زمانہ اتنے بڑے ابتلا اور غم و اندوہ کا تھا کہ بجز کسی امرِ ضروری یا حادثۂ الیمہ کی اطلاع کے اور کچھ عرض

کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ ۱۹۳۴ اور ۱۹۳۵ میں البتہ خط و کتابت کی رفتار دفعتہً نہایت تیزی سے بڑھ گئی۔ ۱۹۳۴ کے آغاز میں حضرتِ علامہ دفعتہً بیمار ہو گئے۔ ابتداً ہم سے مشورہ کیا، ایلوپیتھک علاج ہوتا رہا، لیکن مرض کی شدت میں فرق نہ آیا۔ بالآخر حکیم نابینا جناب عبدالوہاب انصاری مرحوم و مغفور سے رجوع کرنا پڑا اور وہ یوں، کہ اپریل ۱۹۳۴ میں مجھے ہفتہ عشرہ کے لیے لاہور آنا پڑا تو میں نے دیکھا کہ حضرتِ علامہ ڈاکٹروں کے علاج، یا شاید یہ کہنا زیادہ بہتر ہو گا کہ ڈاکٹر ان کی صحت سے مایوس ہو چکے ہیں۔ یہ صورتِ حال بڑی تشویش انگیز تھی اور خود حضرتِ علامہ بھی بڑے پریشان اور افسردہ خاطر نظر آتے تھے۔ فرمایا ”سمجھ میں نہیں آتا، ایلوپیتھک علاج نہ کیا جائے تو پھر آخر کیا کیا جائے“۔ میں نے عرض کیا ”حکیم نابینا صاحب کا علاج کیا مناسب نہ رہے گا؟ ۱۹۲۸ میں بھی تو گُردوں کی تکلیف انھیں کی دواؤں سے رفع ہوئی تھی“۔ حضرتِ علامہ کو میری یہ رائے پسند آئی۔ ارشاد ہوا دہلی پہنچ کر حکیم صاحب سے مرض کی ساری کیفیت بیان کروں اور پھر جو کچھ اُن کی رائے ہو لکھ بھیجوں۔ لہٰذا دہلی پہنچ کر میں نے پہلا کام یہ کیا کہ حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضرتِ علامہ کے عوارض، علاج معالجے، طبی اور ڈاکٹری تشخیص، علیٰ ہٰذا غذا اور پرہیز کے جملہ حالات تفصیل سے عرض کر دیے۔ بس یہ دن تھا کہ حکیم صاحب کی خدمت میں حاضری اور حضرتِ علامہ سے خط و کتابت کا جو سلسلہ شروع ہوا آخر مارچ ۱۹۳۶ تک برابر جاری رہا۔

میرا معمول تھا ہر دوسرے یا تیسرے دن، لیکن بعض موقعوں پہ روزانہ حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا اور حضرتِ علامہ کے حالات نامے لفظ بہ لفظ

پڑھ کر سُناتا ۔ پھر حکیم صاحب مرحوم کی تجویز کردہ ادویات، ان کے استعمال، غذا اور پرہیز کے بارے میں ایک ایک بات نہایت تفصیل سے حضرت علامہ کی خدمت میں عرض کر دیتا ۔ حضرتِ علامہ بھی خط و کتابت میں بڑے مُستعد تھے ۔ ان کا ہمیشہ سے معمول تھا کہ ہر خط کا خُود ہی مطالعہ کرتے، خُود ہی اس کا جواب لکھتے اور دیکھتے کہ کسی جُزوی سے جُزوی بات کا ذکر تو نہیں رہ گیا ۔ جواب بھی ہمیشہ اولین فُرصت میں رقم فرماتے ۔ لہٰذا دورانِ علالت میں بھی انھوں نے بڑے طویل مکتوب تحریر فرمائے ۔ کبھی لفافہ، کبھی کارڈ ۔ کبھی ایسا ہوتا کہ ایک ہی دن میں آگے پیچھے دو دو گرامی نامے صادر ہو جاتے ۔ کبھی ان کے باریک اور نستعلیق قلم کی بدولت کارڈ ہی میں ایک پورے لفافے کا مضمون سما جاتا ۔ ان سب مکتوبات میں اگرچہ بظاہر دوا، غذا، علالت، مرض اور اس کی شدت یا کمی ہی کا مذکور ہے لیکن اہلِ نظر ملاحظہ کریں گے کہ یوں بھی ان کی سیرت اور شخصیت کے کئی مخفی پہلو آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں ۔

مارچ ۱۹۳۶ میں مجھے حضرتِ علامہ کے ایما پر دہلی سے لاہور منتقل ہونا پڑا ۔ لیکن حضرتِ علامہ ان دنوں بھوپال میں قیام فرما تھے جہاں اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال اور سید راس مسعود مرحوم کے اصرار پر ان کا علاج بجلی سے ہو رہا تھا ۔ میں اپنے مجموعۂ مکتوبات پر نظر ڈالتا ہُوں تو اس زمانے میں بھی ان کے دو چار گرامی نامے صادر ہوئے ۔ پھر جب حضرتِ علامہ لاہور تشریف لے آئے تو باوجودیکہ میں ہر روز ان کی خدمت میں حاضر ہوتا ـــــ اِلّا یہ کہ کوئی خاص امر مانع ہو ـــــ اور علی بخش بھی پیغام رسانی کے لیے موجود تھا پھر بھی دو ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ

حضرت علامہ نے مجھے خط لکھ کر طلب فرمایا۔ ۱۹۳۷ کے مکتوبات ایسے ہی موقعوں پر لکھے گئے۔

کُل مکتوبات ۱۸۲ ہیں اور سب کے سب راقم الحروف کے نام، بجز ایک کے جو میرے مرحوم دوست سید سلامت اللہ شاہ کو لکھا گیا مگر جس میں خطاب حقیقۃً مجھ ہی سے تھا۔ پھر ایک کارڈ بھی ہے جو خوش قسمتی سے والدِ ماجد قبلہ مرحوم و مغفور کے کاغذات میں دستیاب ہو گیا۔ اس خط کی تاریخ ۲۰ جولائی ۱۹۲۲ ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ حضرت علامہ نے اس کے لیے ایک تصویری کارڈ انتخاب کیا (شاید جلدی میں)۔ مجھے خوب یاد ہے بچپن میں مجھے اس کارڈ سے بڑی دلچسپی تھی محض اس لیے کہ اس کی پشت پر جامع مسجد دہلی کی تصویر ہے۔ اس وقت کیا معلوم تھا آگے چل کر اس کی قدر و قیمت اس قدر بڑھ جائے گی۔ پھر باوجود اختصار اس کا مضمون سوانح نویس کے لیے بڑی دلچسپی کا باعث ہو گا۔ میں یہ خط تبرکاً اس مجموعے میں شامل کر رہا ہوں۔

رہی ان کی ترتیب سو راقم الحروف کا خیال تھا کہ مکتوبات کو محض سنینی اعتبار سے تاریخ وار مرتب کر دینا کافی نہ ہو گا۔ اس لیے کہ کوئی بھی خط ہو اس کا کچھ حصہ واضح ہوتا ہے کچھ غیر واضح۔ لہٰذا میں نے یہی بہتر سمجھا کہ ہر مکتوب کے غیر واضح پہلوؤں کو حتی الامکان باختصار کے ساتھ واضح کر دوں تاکہ اس کا پس منظر بھی قارئین کے سامنے آجائے۔ البتہ دو ایک خطوں میں بعض اسماء اور عبارات محض اس لیے حذف کر دی گئی ہیں کہ ان کی حیثیت بعایت نجی تھی اور اس لیے ان کی وضاحت بھی غیر ضروری۔ بہر کیف میں نے التزام یہ رکھا ہے کہ

اوّل ہر مکتوب کی رعایت سے بعض ایسی باتوں کی صراحت کردی ہے جن کا تعلق اصلی مضمون سے تھا، پھر پورا مکتوب نقل کردیا۔ لیکن اگر کوئی امر اس کے باوجود وضاحت طلب رہ گیا تو اس کی پھر سے وضاحت کردی، بلکہ ضروری معلوم ہوا تو ذیل میں مختصر سے حواشی بھی بڑھا دیے۔ لیکن کہیں کہیں تاکہ یہ توضیحات غیر معمولی طوالت اختیار نہ کرلیں اور قارئین کی توجہ مکتوبات سے ہٹ کر غیر متعلقہ باتوں کی طرف منعطف نہ ہو جائے۔ مجھے امید ہے اربابِ نظر اس ترتیب کو پسند کریں گے۔

اکابر کی تحریریں قوموں کی حیاتِ ذہنی اور ملی کا بڑا قابلِ قدر سرمایہ ہیں، لہٰذا ان کی ترتیب و تدوین میں حد درجے احتیاط اور سلیقے سے کام لینا چاہیے۔ بالخصوص مکتوبات کی ترتیب و تدوین میں کیونکہ یہاں اصل حقیقت ——— احوال، ظروف، واقعات اور معاملات ——— کا صرف ایک پہلو ہمارے سامنے ہوتا ہے اور وہ بھی کچھ دھندلا، کچھ غیر واضح جس سے بڑی بڑی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی، یا پیدا کر دی جاتی ہیں۔ پھر اس دور میں یوں بھی سوانح نویسی ہو، یا شخصیت اور کردار کا مطالعہ اربابِ فن کا رجحان چونکہ معمولاً سوئے فہم، بلکہ یہ کہنا چاہیے سوئے ظن کی طرف ہے جو ایک افسوس ناک امر ہے اور جس کی تہ میں دراصل ایک ایسی نفسیات کام کر رہی ہے جسے نہ تو انسانی شخصیت میں کوئی گہری بصیرت حاصل ہے، نہ اس کی قدر و قیمت کا احساس، لہٰذا ہمیں اس سلسلے میں اور زیادہ احتیاط اور زیادہ نقد و تفحص، اور زیادہ خلوص اور دیانت سے کام لینا چاہیے۔ راقم الحروف کو بہرحال بتشکر اس امر کا اعتراف ہے کہ جس دردمند ہستی کی مخلصانہ رفاقت اور اشتراکِ عمل نے باوجود متعدد دقتوں کے راقم الحروف کے گوناگوں مشاغل

ہیں اس کا ہاتھ بٹایا، اس لئے بروقت اس ضرورت پر ـــــ کہ ہر مکتوب کا پس منظر قارئین کے سامنے ہونا چاہیے ـــــ اسے متنبہ کر دیا، بلکہ اس سلسلے میں بڑے قابلِ قدر مشورے بھی دیئے۔

یہ سب مکتوبات اب اقبال اکیڈیمی، کراچی میں محفوظ ہیں اور میں خوش ہوں کہ اس ملی سرمائے کی حفاظت کا جو گویا قوم کی امانت ہے بہترین ذریعہ پیدا ہو گیا۔ یہ سب کچھ دراصل میرے عزیز اور مخلص دوست جناب ممتاز حسن صاحب معتمدِ مالیات و نائب صدرِ اکیڈیمی کی توجہ اور کوششوں کا نتیجہ ہے۔ جس کے لیے میں ان کا بہ دل ممنون ہوں۔ قارئین جب چاہیں اس مجموعے کے جملہ مکتوبات کا مقابلہ اصل مکتوبات سے کر سکتے ہیں۔ ان کی عکسی نقلیں بھی حاصل کر لی گئی ہیں، ان میں سے چند ایک اس مجموعے میں بھی شامل ہیں۔ امید ہے قارئین کے لیے یہ امر مزید اطمینان کا باعث ہوگا۔

لیکن ایک اور بات ہے جس کا اس سلسلے میں عرض کر دینا غیر مناسب نہ ہوگا اور وہ یہ کہ حضرت علامہ نے یہ سب مکتوبات گویا قلم برداشتہ لکھے۔ وہ جب بھی خط لکھتے قلم برداشتہ ہی لکھتے۔ اس خیال سے نہیں کہ ایک روز اس کی اشاعت بھی ہوگی۔ گویا وہ اس امر سے بے نیاز تھے کہ لوگ ان کی تحریروں کو کیا کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ جو کچھ لکھتے برجستہ لکھتے۔ اس میں عبارت آرائی کا دخل ہوتا، نہ تکلف اور تصنع کا۔ وہ شاید ایک مرتبہ خط لکھ کر پڑھتے بھی نہیں تھے۔ اس سے یہاں یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ حضرت علامہ مرحوم کو فلسفہ و حکمت کا دقیق سا دقیق مضمون بھی نہایت تھوڑے لفظوں میں اور بغیر کسی ایچ پیچ کے اس خوبی سے

بیان کر دیتے کہ فوراً پڑھنے والے کے دل میں جاگزیں ہو جاتا ——— یہ امر بھی ان کے ذہنِ رسا، کمالِ فکر اور پختگیٔ علم پر دلالت کرتا ہے ——— وہاں ہم یہ بھی سمجھ لیتے ہیں کہ دورانِ تحریر میں بعض الفاظ ——۔۔ مثلاً "کہ"، "کا"، "اُن" یا "میں" وغیرہ ——— سہواً اُن سے چھوٹ جاتے۔ یا تذکیر و تانیث کی اُن باریکیوں کو بھی جو ناقدینِ فن اور بالخصوص اہلِ زبان کا خاص موضوع ہیں انھیں متعلق خیال نہ ہوتا۔ کبھی کبھی الفاظ کا تکرار بھی ہو جاتا۔ پھر اگر لکھتے لکھتے کوئی انگریزی لفظ ذہن میں آگیا یا انھیں یہ خیال ہوا کہ مخاطب ان کا مافی الضمیر جب ہی سمجھے گا جب انگریزی لفظ استعمال کیا جائے تو انھیں انگریزی الفاظ کے استعمال میں بھی تامل نہ ہوتا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت علامہ کے اس انداز کو ہم اُردو زبان میں انگریزی الفاظ کی بلا ضرورت ترویج کا ذریعہ بنائیں یا یہ سمجھیں کہ ہماری زبان اداۓ مطلب کے لیے ناکافی ہے۔ ہرگز نہیں۔ حضرت علامہ کے ذہن میں تو ان موقعوں پر یہ مسئلہ ہی نہیں ہوتا تھا جو آج ہم زبان کی بحث میں چھیڑ رہے ہیں۔ اس وقت ان کی توجہ صرف مخاطب پر ہوتی تھی تاکہ وہ ان کی بات آسانی سے سمجھ سکے۔ بہرحال زمانۂ علالت میں تو ان ادبی نزاکتوں سے جن کو تعلق اسلوب اور عبارت آرائی سے ہے ان کی بے نیازی اور بھی بڑھ گئی تھی جس کی وجہ ظاہر ہے ——— پریشانی، علالت اور دوا اور پرہیز کا تکلیف دہ موضوع۔

آخر میں راقم الحروف کا فرض ہے کہ ان سب احباب کا دلی شکریہ ادا کرے جن کی بدولت اسے بعض امور کے متعلق بعض تفاصیل کا علم ہوا، یا

جن کا مشورہ تھا کہ حضرتِ علامہ نے اپنے مکتوبات میں جہاں کہیں کوئی ایسی بات کہی ہے جو اُن احوال و ظروف کی طرف اشارہ کیے بغیر سمجھ میں نہیں آئے گی جن کا تعلق اُس وقت کی سیاسی اور اجتماعی فضا یا اس سلسلے میں خود حضرتِ علامہ کے اپنے خیالات سے ہے اس کی تصریح کر دوں۔ مجھے اعتراف ہے کہ یہ تصریحات کہیں کہیں ضرورت سے زیادہ طویل ہو گئی ہیں۔ لیکن اس کے بغیر چارۂ کار بھی نہیں تھا۔ رہا یہ مسوّدہ سو اس کی تسوید و تکمیل جن ہاتھوں سے ہوئی اُن کا حصّہ اس مجموعے کی ترتیب میں چونکہ راقم الحروف سے کم نہیں، یعنی ایک طرح سے اس میں شریک کار، لہٰذا یہ موقع ادائے سپاس کا نہیں بلکہ اعترافِ حقیقت اور قدردانی کا جس کا اظہار بہرکیف لازم تھا۔

مُرتّب

# تقریب

مجیب صاحب[1] نے کہا "ڈاکٹر صاحب[2] اگر اپنی کتابیں ہم سے چھپوائیں تو کیا اچھا ہو، ہمارے لیے اس سے بڑی سعادت کیا ہوگی"۔

یہ آج سے پچیس چھبیس برس پہلے کی بات ہے جب مجیب صاحب نے مطبع جامعہ کا انتظام نیا نیا اپنے ہاتھ میں لیا۔ انھیں یوں بھی اس زمانہ میں پیامِ مشرق کی تلاش تھی اور پیامِ مشرق کا کوئی نسخہ بازار میں دستیاب نہیں ہوتا تھا۔ لیکن ایک روز باتوں باتوں میں جب اُنھوں نے مجھ سے ذکر کیا تو میں نے کہا

---

۱۔ شیخ محمد مجیب بی۔اے (آکسن)۔ اس زمانے میں اُستاد اور اب امیر (چانسلر) جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔ اعلیٰ تعلیم ابتدا ہی سے آکسفرڈ میں پائی۔ پھر جرمنی تشریف لے گئے۔ ادب، سیاست اور فلسفہ کے علاوہ جرمن، فرانسیسی اور روسی زبانوں کی تحصیل کی۔ طباعت کا فن بھی سیکھا۔ ۱۹۲۷ میں واپس آئے اور آتے ہی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے حلقۂ اساتذہ میں شامل ہو گئے۔ اقبال اور کلامِ اقبال کے شیدائی۔ تصنیفات متعدد ہیں۔ مثلاً تاریخِ سیاست، روسی ادب، وغیرہ وغیرہ۔ کچھ ڈرامے اور افسانے بھی ہیں، علیٰ ھٰذا متفرق مضامین اور مقالے۔

۲۔ یعنی حضرت علامہ۔

"گھبرائیے نہیں، کتابت ہو رہی ہے۔ تیسری اشاعت عنقریب بازار میں آجائے گی۔ ابھی چند دن ہوئے مَیں لاہور گیا تو حضرتِ علامہ نے خود ہی مجھ سے ارشاد فرمایا تھا"۔ مجیب صاحب نے یہ سُنا تو کہنے لگے "اگر ایسا ہے تو کیوں نہ پیامِ مشرق؟ بلکہ پیامِ مشرق پر ہی کیا موقوف ہے حضرتِ علامہ کی ساری تصنیفات مطبعِ جامعہ میں طبع ہوں۔ مَیں نے کہا "سبحان اللہ ایسا ہو سکے تو اور کیا چاہیے، ہم خرما و ہم ثواب۔ کیا مَیں ڈاکٹر صاحب کو لکھ دُوں؟ کیا عجب وہ ہماری درخواست مان لیں"۔

مجیب صاحب کا خیال تھا اور ہم سب اس سے متفق کہ مطبعِ جامعہ کو کچھ ویسی ہی خدمات سرانجام دینی چاہییں جیسی مثلاً آکسفرڈ یونیورسٹی پریس سرانجام دے رہا ہے۔ یہ دُوسری بات ہے کہ حالات اس کے مساعد نہیں تھے۔ لیکن جس طرح جامعہ کا قیام نتیجہ تھا ایک آرزو کا، وہ آرزو جو پُوری نہ ہو سکی، بعینہٖ مطبعِ جامعہ کے قیام میں بھی ایک تمنا مضمر تھی۔ پھر قطعِ نظر اس عقیدت کے جو مجیب صاحب کو حضرتِ علامہ سے تھی اُنھیں ایک دُوسرے واسطے سے بھی ان سے قلبی تعلق تھا[۲]۔ لہٰذا اُنھوں نے با اصرار فرمایا کہ مَیں ان کی درخواست حضرتِ علامہ کی خدمت میں پہنچا دُوں۔ مَیں اس لیے کہ میری حیثیت جامعہ اور حضرتِ علامہ کے درمیان ایک واسطے کی سی تھی۔

---

۲۔ یہ واسطہ حکومتِ پاکستان کے سابق ایڈووکیٹ جنرل شیخ محمد وسیم مرحوم کا تھا۔ وہ مجیب صاحب کے بڑے بھائی اور کیمبرج میں حضرتِ علامہ کے شریکِ درس تھے۔

میں ایک طرف اساتذۂ جامعہ کے حلقے میں شامل تھا، دوسری جانب حضرت علامہ سے نیازمندانہ تعلقات کے علاوہ ان کی دعوتِ فکر کا حامل بھی اور اس لیے میری ہمیشہ یہ آرزو، بلکہ کوشش رہی کہ حضرت علامہ کی توجہ کسی نہ کسی طرح جامعہ کی طرف منعطف ہو جائے۔ میرا خیال تھا تعلیم ملی کے اس نصب العین میں جو جامعہ کے پیشِ نظر ہے کچھ معنی پیدا ہو سکتے ہیں تو جب ہی کہ حضرتِ علامہ کے ارشادات کو دلیلِ راہ بنایا جائے اور جامعہ کی خواہش بھی ـــــ اگر میں غلطی نہیں کرتا ـــــ کچھ ایسی ہی تھی۔ لہٰذا مجھے اس تجویز پر بے حد مسرت ہوئی اور میں نے ایک طویل عریضہ تحریر کرتے ہوئے حضرت علامہ سے درخواست کی کہ اگر انھیں اس تجویز سے اتفاق ہو تو ہم کسی روز حاضرِ خدمت ہو جائیں۔ قارئین کو شاید معلوم نہ ہو کہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں جب شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ جامعہ کے یومِ تاسیس پر علی گڑھ تشریف لائے تو مولانا محمد علی نے حضرتِ علامہ سے بھی درخواست کی تھی کہ لاہور چھوڑ کر علی گڑھ آ جائیں اور جامعہ کی نظامِ تعلیم اپنے ہاتھ میں لیں۔ اسرارِ خودی کے یہ اشعار

حق جوانے مسلمے با تو سپرد
کو نصیبے از دبستانم نبرد

از تو ایں یک کار آساں ہم نشد
یعنی آں انبارِ گِل آدم نشد

اکثر مولانا کی زبان پر رہتے۔ پھر جب وہ دفعۃً جوش میں آ کر مدرسۃ العلوم مسلمانان کے درودیوار کی طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کر ان اشعار کا تکرار کرتے تو ان کی آنکھیں فرطِ جذبات سے اشک بار ہو جاتیں۔ حضرتِ علامہ نے اگرچہ بوجوہ مولانا کی یہ درخواست

قبول نہیں کی، لیکن جامعہ کے حالات سے برابر دلچسپی کا اظہار فرماتے رہے۔ میں جب کبھی لاہور آتا اور اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا تو بار بار جامعہ کا پوچھتے اور اسلامی نقطۂ نظر سے تعلیم و تعلم کے بارے میں بڑے بیش قیمت مشورے دیتے[۴]۔ یہاں یہ عرض کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ اس قسم کی ایک تجویز اس سے پہلے بھی حضرتِ علامہ کی خدمت میں پیش کی گئی تھی اور وہ یوں کہ ۱۹۲۳ میں جب ڈاکٹر صاحب[۵] اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی تشریف لے گئے اور دورانِ قیام میں مطبعِ کاویانی برلین سے دیوانِ غالب کا ایک منقش اور مُطلّا نسخہ شائع کیا، تو بہ سبب اس عقیدت کے جو انھیں حضرتِ علامہ سے تھی مجھے لکھا "میرا جی چاہتا ہے بانگِ درا کی طباعت بھی اسی اہتمام سے مطبعِ کاویانی ہی میں کی جائے"۔ لیکن حضرتِ علامہ کو یہ تجویز پسند نہیں آئی، کیونکہ برلن میں نستعلیق طباعت کا کوئی انتظام نہیں تھا اور حضرتِ علامہ نستعلیق کو کسی طرح بھی نسخ پر قربان کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ عکسی طباعت البتہ ممکن تھی مگر اس کے مصارف بے حد زیادہ تھے، لہٰذا یہ تجویز رہ گئی[۶]۔ البتہ اس مرتبہ مجیب صاحب کی تجویز مان لی گئی۔ حضرتِ علامہ نے انھیں لاہور آنے کی دعوت دی اور فرمایا مجھے بھی ان کے ساتھ آنا چاہیے۔

---

۴۔ یہ سب گفتگو میں زیرِ ترتیب ہیں۔

۵۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں۔ اُس وقت اُستاذ اور پھر شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی۔ تقسیم ہند کے بعد وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ اب گورنر بہار۔

۶۔ افسوس ہے یہ مکتوب ضائع ہو گیا۔

یہ ۱۹۲۹ کا ابتدائی زمانہ تھا۔ ہم لوگ شروع مارچ میں لاہور پہنچے اور سیدھے حضرتِ علامہ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ قیام بھی حضرتِ علامہ ہی کے یہاں رہا۔ حضرتِ علامہ نے بڑی شفقت کا اظہار فرمایا۔ حسبِ معمول جامعہ کے حالات دریافت کیے اور پھر جیسا کہ ان کے نیازمندوں کو معلوم ہے صبح سے دوپہر اور سہ پہر سے شام تک مختلف مباحث پر گفتگو کرتے رہے۔ امورِ تعلیم پر تبصرہ ہوا، سیاسیات پر اظہارِ خیال فرمایا، ادب اور شاعری زیرِ بحث آئی مختصراً یہ کہ اس نہایت ہی پُرلطف اور پُر از معلومات صحبت کے بعد ہم لوگ اسی شام کو دہلی واپس روانہ ہو گئے۔ مجیب صاحب خوش تھے کہ پیامِ مشرق کا مسئلہ حسبِ خواہش طے ہو گیا۔ حضرتِ علامہ نے فرمایا ”کاپیاں لکھی جا رہی ہیں۔ چند روز تک بھیج دی جائیں گی۔ مطبعِ جامعہ کی طرف سے البتہ باضابطہ تحریر آ جانی چاہیے۔“

۱۹۱۸ کے اواخر ہی سے میں بالالتزام حضرتِ علامہ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا تھا۔ یہ میری طالب علمی اور اس وقت کے سیاسی ہندوستان کا بڑا پُرآشوب زمانہ تھا۔ ۱۹۲۰ میں تحریکِ ترکِ موالات مجھے علی گڑھ لے گئی جہاں پانچ برس قیام رہا۔ لیکن ۱۹۲۵ میں جب جامعہ کو خود دہلی منتقل ہونا پڑا تو میں بھی دہلی آ گیا اور ۱۹۳۵ تک یعنی مزید دس برس برابر اس سے منسلک رہا۔ لیکن تعجب ہے کہ اس سارے زمانے میں اگر سال میں دو نہیں ایک مرتبہ تو بالالتزام لاہور آتا اور حضرتِ علامہ کی خدمت میں حاضر رہتا۔ ان کے ارشادات سنتا اور بغرضِ استفادہ خود بھی کوئی بحث چھیڑ دیتا، پھر بھی ایسا کبھی نہیں ہوا کہ علی گڑھ

یا دہلی واپسی پر خط و کتابت کی نوبت آتی ۔ گویا ایک حاضری کی گفتگو دوسری حاضری پر ملتوی ہو جاتی ۔ لیکن پیامِ مشرق کی طباعت نے مستقل خط و کتابت کی تقریب پیدا کر دی ۔ لاہور سے واپس آئے کوئی دو ہفتے گزرے تھے کہ حضرتِ علامہ کا ایک والا نامہ صادر ہوا اور پھر کچھ دنوں کے بعد دوسرا،
حتیٰ کہ یہ سلسلہ باقاعدہ شروع ہو گیا ۔

# ۱۹۱۲

لاہور
۲۰ جولائی ۱۹۱۲

مخدومی جناب قبلہ شاہ صاحب،

السلام علیکم۔ انجمن کی طرف سے مجھے کوئی خط نہیں ملا۔ آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر مگر افسوس ہے میں حاضری سے معذور ہوں۔ جولائی کے آخر میں مجھے چند ضروری کام ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے تو پبلک لائف بوجوہات قریباً ترک کر دی ہے۔ والسلام

آپ کا خادم محمد اقبال

'انجمن' یعنی انجمن نصرۃ الاسلام، دینا نگر جس کی طرف سے والدِ ماجد قبلہ نے حضرتِ علامہ کو دینا نگر آنے کی دعوت دی تھی۔ دینا نگر (ضلع گورداسپور) اس زمانے میں (اور اب بھی) ایک چھوٹا سا قصبہ ہے —— پانچ ساڑھے پانچ ہزار نفوس پر مشتمل، بدنام زمانہ اوڈینہ بیگ صوبۂ پنجاب کی یادگار، اور سکھ دور میں اعیانِ حکومت کا عشرت گاہ —— جہاں بعض غیر مسلموں نے آریہ

سماجی تحریک کی روک تھام کے لیے ایک انجمن قائم کر رکھی تھی اور جس کے سالانہ جلسوں میں اطراف و اکنافِ ہند (قبلِ تقسیم) سے بڑے بڑے مشہور عُلما اور مناظر شریک ہوتے، مثلاً مولانا ثناءاللہ مرحوم و مغفور، مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی مرحوم و مغفور۔

حضرتِ علامہ ۱۹۰۸ میں یورپ سے واپس تشریف لائے۔ لہٰذا یہ امر بڑا معنی خیز ہے کہ چار برس کے اندر ہی وہ "ہُو ہُو پبلک لائف سے برگشتہ خاطر ہو گئے۔"

o

# ۱۹۲۹

## پیامِ مشرق
## تصوّف

میں عرض کر رہا تھا خط و کتابت کا آغاز ۱۹۲۹ میں ہُوا اور تقریب یہی تھی پیامِ مشرق کی طباعت ۔ چنانچہ اس سلسلے میں پہلا مکتوب ۲۴ مارچ کا ہے :

لاہور، ۲۴ مارچ ۱۹۲۹

ڈیئر نیازی صاحب ۔ السلامُ علیکم ۔

کتاب پیام مشرق آج ختم ہو گئی ہے ۔ صرف اغلاط درست کرنے باقی ہیں جو کاتب کر رہا ہے ۔ کل پرسوں تک ختم کر لے گا ۔ آپ نے میرے خط کا جواب نہیں دیا[1] ۔ مہربانی کر کے میرے استفسارات کے جواب جلد دیجیے تاکہ آخری فیصلہ کر سکوں ۔ اُمید ہے آپ کا مزاج بخیر ہو گا ۔ مجیب صاحب سلام قبول کریں ۔

محمد اقبال، لاہور

---

(۱) افسوس ہے یہ مکتوب ضائع ہو گیا یا شاید مطبع جامعہ کے کاغذات میں ملفوف ہو۔

ہفتہ عشرہ میں پیامِ مشرق کی کاپیاں موصول ہو گئیں اور جہاں تک کاروباری امور کا تعلق تھا مجیب صاحب نے براہِ راست خط و کتابت شروع کر دی۔ حضرتِ علامہ کا اصرار تھا کہ ہر بات باضابطہ طے کر لی جائے۔ احباب کو خوب معلوم ہے کہ معاملات میں حضرتِ علامہ کا طرزِ عمل کیسا صاف ستھرا اور اصولی تھا۔

پیامِ مشرق کی طباعت جاری تھی کہ بعض ایسے حالات پیدا ہو گئے جن سے اُمید بندھتی تھی کہ میں شاید مزید تعلیم کے لیے یورپ جا سکوں۔ ارادہ انگلستان اور جرمنی کا تھا اور خیال یہ کہ موضوعِ تحقیق ہو اسلامی تصوف کا مطالعہ۔ میں نے حضرتِ علامہ سے مشورۃً عرض کیا تو ارشاد ہوا:

لاہور ۴ جون ۱۹۲۹

جناب نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

مجیب صاحب کو پروف دیکھنے کی اجازت ہے۔ میرے پاس صرف دو دفعہ پروف آئے ہیں جو میں نے دیکھ کر واپس بھیج دیے تھے۔

مجھے معلوم نہیں آپ کس چیز کے لیے سارٹیفکیٹ مانگتے ہیں۔ آپ خود وہاں سے لکھ کر اور ٹائپ کرکے بھیج دیں۔ میں دستخط کرکے واپس بھیج دوں گا۔

تصوف لکھنے پڑھنے کی چیز نہیں، کرنے کی چیز ہے۔ کتابوں کے مطالعے اور تاریخی تحقیقات سے کیا ہوتا ہے۔ کسی کو کوئی حقیقی فائدہ نہیں پہنچتا۔ نہ کتابوں کے مصنف کو، نہ اس کے پڑھنے والوں کو۔ ہاں

کے علاوہ مجھے اُمید نہیں کہ بمبئی کے تاجر ایسے مضمون پڑھنے والے کو ولایت بھیجیں گے۔ وہ عملی لوگ ہیں، ایسے مضمون اُن کو اپیل نہیں کرتے۔ ضرورت بھی یہی میری مشکل ہے۔ بہتر ہو کہ آپ کسی اچھے ہنر کی تلاش میں ولایت جائیں۔

محمد اقبال

حضرتِ علامہ کی رائے نہایت صائب تھی۔ البتہ انگلستان اور جرمنی کے بعض اہلِ علم کے نام تعارف ناموں کی درخواست کو انھوں نے غلطی سے سرٹیفکیٹ طلبی پر محمول کیا جس کی وجہ بجز اس کے اور کیا ہو سکتی تھی کہ میں اپنا مطلب ٹھیک ٹھیک ادا نہیں کر سکا تھا۔ بہر حال میں نے جواب میں عرض کیا کہ کسی سائنس یا صنعت کی تحصیل تو اب میری استطاعت سے باہر ہے، فلسفہ تاریخ کا موضوع کیا تصوفِ اسلام سے بہتر نہیں رہے گا؟

حضرتِ علامہ نے فرمایا:

جناب نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

میں تصوف پر تاریخ کو ترجیح دیتا ہوں۔ خط کا مسودہ لکھ کر ارسال کر دیجیے میں دستخط کر کے واپس بھیج دوں گا۔ کتاب چھپنے میں دیر

---

۲۔ میں نام بھولتا ہوں شاید فضل بھائی کریم بھائی ٹرسٹ۔ ان دنوں تاجرانِ بمبئی نے ایک وقف قائم کر رکھا تھا جس کی آمدنی سے بیرونِ ہند اعلیٰ تعلیم کے لیے وظائف دیے جاتے تھے۔ میرا خیال تھا مصارف کی زیادتی کے باعث شاید اس وقف سے تھوڑی بہت رقم قرض لینا پڑے۔

ہو رہی ہے۔ معلوم نہیں کیا باعث ہے۔ مجیب صاحب سے کہیے کہ وہ اس
طرف خاص توجہ دیں۔ والسلام

محمد اقبال

لاہور ۱۸ جون ۱۹۲۹

یہ ارشاد میرے اطمینان کے لیے کافی تھا۔ تعارف ناموں کا معاملہ البتہ جوں کا توں رہ گیا۔ وہی حضرتِ علامہ کی شکایت سو میں نے اسے مجیب صاحب تک پہنچا دیا۔

جولائی کا مہینہ یوں ہی گزر گیا۔ اسی اثنا میں پیامِ مشرق کی طباعت مکمل ہو چکی تھی جسے حضرتِ علامہ نے بے حد پسند فرمایا۔ چنانچہ ۲ اگست کا والا نامہ ہے:

جنابِ نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

خط مل گیا ہے۔ ۸۴۳ عدد کتب جامعہ کی دکان[3] سے موصول ہو چکیں۔ باقی کتب جلد بھجوا دیجیے۔ بلٹی میرے نام آئے یا مبارک علی[4] کے نام۔ میرا ارادہ آپ کے مطبع سے اور کتب انگریزی مثلاً و فارسی چھپوانے کا تھا مگر افسوس ہے مجیب صاحب بیمار ہو گئے۔ خدا تعالیٰ انھیں جلد صحت عطا فرمائے۔ میری طرف سے ان کی صحت دریافت فرمائیے۔ کتاب بانگِ درا

---

۳۔ مہتمم مکتبہ جامعہ۔

۴۔ شیخ مبارک علی صاحب، تاجرِ کتب لاہور۔

بھی قریباً تیار ہے۔ مدراس کی چھپائی کا انتظام تو شاید ابھی نہ ہو سکے۔
مطلع فرمائیں کہ اگر آپ نہ چھاپ سکیں تو لاہور ہی میں چھپوانے کا انتظام کیا جائے۔ والسّلام

مخلص محمد اقبال

لاہور ۲ اگست ۱۹۲۹

لیکن افسوس ہے مجیب صاحب کی علالت طُول کھینچتی چلی گئی اور مطبعِ جامعہ کا کام بوجوہ رُک گیا۔ میں چاہتا تھا جامعہ کا تعلّق کسی نہ کسی رنگ میں حضرتِ علّامہ سے قائم رہتا، لیکن حضرتِ علّامہ کو عُجلت مطلوب تھی اور مطبعِ جامعہ کا مُعاملہ روز بروز دیر طلب ہو رہا تھا۔ مجھے بھی ان دنوں غیر معمولی مصروفیت رہی۔ دو ایک بار شملہ جانا پڑا۔ حضرتِ علّامہ نے چند دن انتظار کیا اور پھر فرمایا:

لاہور ۱۷ ستمبر

جنابِ نیازی صاحب۔ السّلامُ علیکُم۔

معلوم نہیں آپ شملہ سے واپس دہلی آ گئے ہیں یا ابھی وہیں ہیں۔ باقی کتاب کی طباعت کے متعلق جہاں تک ممکن ہو جلد آگاہ فرمائیے تاکہ اگر دہلی میں طباعت کا انتظام نہ ہو سکے تو پھر میں لاہور سے ابھی سے انتظام کروں۔ امید ہے مجیب صاحب اب بالکل تندرست ہوں گے۔ ان کی موجودگی سے دلجمعی ہو سکتی ہے۔ اگر وہ علالت کی وجہ سے دہلی واپس نہ آ سکتے ہوں تو پھر خود انتظام مجھ کو کرنا ہوگا۔ غرضیکہ آپ مہربانی کر کے کوئی

definite جواب دیں۔ والسلام

محمد اقبال

لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں مجھے پھر شملہ جانا پڑا۔ اکتوبر اور نومبر اسی ایاب و ذہاب کی نذر ہو گئے۔ مطبع جامعہ کو اس زمانہ میں طرح طرح کی مشکلات درپیش تھیں۔ یہ مشکلات کم ہوتی نظر نہ آئیں تو میں نے بافسوس حضرتِ علامہ کی خدمت میں لکھا کہ پیامِ مشرق کے نسخے تو پوری تعداد میں طبع ہو جائیں گے لیکن باقی تصنیفات کی طباعت نہیں ہو سکے گی۔ مجیب صاحب کو بھی اس کا بڑا رنج تھا۔

وسطِ دسمبر میں میں پھر لاہور میں تھا۔

# ۱۹۳۰

تشکیلِ جدیدِ الٰہیاتِ اسلامیہ
مولانا شوکت علی
کتاب الطواسین
سفرِ مراد آباد
آیۂ نور
اقبال فسٹ
صدارتِ اجلاسِ لیگ الٰہ آباد

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں مجیب صاحب کی علالت اور مطبعِ جامعہ کی مالی مشکلات کے باعث حضرتِ علامہ کے مجموعہ ہائے کلام کی طباعت کا انتظام تو نہ ہو سکا، اس کا افسوس البتہ باقی رہ گیا۔ وسطِ دسمبر میں میں حسبِ معمول لاہور آیا۔ سیاسیاتِ ہند میں یہ زمانہ بڑا شور انگیز تھا۔ لیگ اور کانگرس دونوں کے اجلاس لاہور میں منعقد ہو رہے تھے۔ ایک طرف اعلانِ آزادی پر زور دیا جا رہا تھا، دوسری جانب اعلانِ برأت' پر۔ میں

اسے 'برأت' ہی کہوں گا، اِس لیے کہ اب یہ بات صاف نظر آ رہی تھی کہ ہندوؤں اور مُسلمانوں کے درمیان کوئی مفاہمت مُمکن نہیں۔ حضرتِ علامہ کے لیے بھی یہ دن بڑی مصرُوفیت کے تھے، کچھ مُلکی سیاست کے بدلتے ہُوئے احوال کے باعث اور کچھ اس لیے کہ اکابرِ قوم مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی سب لاہور میں جمع تھے اور سب اس امر پر مُتفق کہ مُسلمانوں کی آیندہ سیاست کی اساس کسی مُستقل اُصُول پر رکھی جائے۔ مَیں حسبِ معمُول حضرتِ علامہ کی خدمت میں حاضر ہوتا، لیکن حضرتِ علامہ بڑے مصرُوف تھے اور ان کی صُحبتوں میں ہنگامی سیاست کے سوا کسی دُوسری چیز کا دخل ہی نہیں تھا۔ ان دنوں یُوں بھی مُجھے ہفتہ عشرہ کے لیے حاضری کا موقعہ نہیں ملا۔ مَیں بیمار ہو گیا تھا۔ بیماری کے بعد حاضرِ خدمت ہُوا تو سیاست کا ہنگامہ سرد پڑ چکا تھا۔ کانگرس آزادی کا اِعلان کر چکی تھی اور مُسلمان یہ سوچ رہے تھے کہ انھیں اپنی سیاسی جدوجُہد کے لیے اب کس نہج پر قدم اُٹھانا چاہیے۔ بات یہ ہے کہ ۱۸۵۷ کے خُونیں ہنگامے کے بعد جب مُسلمان پھر اپنے پاؤں پر کھڑے ہُوئے تو ان کی ملی اور اجتماعی سرگرمیوں نے تحریکِ علی گڑھ کی شکل اختیار کی جس نے تعلیم کے ساتھ ساتھ سیاست میں بھی دیر تک ان کی رہنمائی کی لیکن تعلیم اور سیاست کا یہ جوڑ ایک دن ضرُور ٹوٹتا۔ دونوں کے حلقے الگ الگ ہیں اور دونوں کب تک ایک دُوسرے کا ساتھ دیتے۔ یُوں بھی تحریکِ علی گڑھ کا مزاج ابتدا ہی سے سیاسی تھا، گو بظاہر اس نے تعلیم کو اپنا مقصُود ٹھہرایا۔ لیکن تعلیم پھر ایک ذریعہ تھا کسی کھوئی ہُوئی

پھر سے حصول کا یعنی حکومت اور عملداری میں پھر سے حصہ لینے کا، گو اس کی زمام اب غیروں کے ہاتھ میں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید احمد خاں نے مدرستہ العلوم مسلمانان کی بنیاد رکھی تو کہا گیا کہ علی گڑھ میں ایک نئی سلطنت کی بنیاد رکھی جا رہی ہے ا۔ بہرحال ۱۹۰۶ میں تعلیم اور سیاست کا یہ جوڑ بالآخر ٹوٹا اور تحریک علی گڑھ کی حقیقی روح آل انڈیا مسلم لیگ میں منتقل ہو گئی۔ پھر جیسا کہ مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا تقاضا تھا انھوں نے اپنے سیاسی مستقبل کے پیشِ نظر ہندی برطانوی سیاست میں ایک جداگانہ راستہ اختیار کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ ان کا اپنا ایک الگ تھلگ اور متمیز سیاسی وجود ہے جو دوسری قوموں میں ضم نہیں ہو سکتا۔ یوں تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی حکومت سے برضا و رغبتِ اشتراک؛ لہٰذا ملک کے نظم و نسق اور عملداری میں تعاون کا وہ مقصد جس کے لیے اعلیٰ ملازمتوں کے حصول پر زور دیا جا رہا تھا مجالسِ وضعِ قوانین میں نمائندگی، جداگانہ طریقۂ انتخاب اور آئینی اور دستوری حقوق کی حفاظت اور تصفیے کے مطالبے سے بدل گیا۔ بالفاظِ دیگر مسلمانوں کا پھر ایک سیاسی نصب العین متعین ہوا۔ لیکن لیگ کی اس جدوجہد کو جاری ہوئے تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ بین الاقوامی سیاست نے ہندی اسلامی سیاست میں ایک نیا اضطراب پیدا کر دیا جس کا ہلکا سا اظہار اگرچہ ۱۸۹۸ میں بھی ہو چکا تھا جب دُوَلِ یورپ نے دولتِ عثمانیہ کی جنگی پیش قدمی کو جبراً روک دیا تھا، اس لیے کہ ترکی فوجیں یونانیوں کے خلاف کامیاب ہو رہی تھیں۔ مگر ۱۹۱۱ میں جب

---

ا۔ یہ قول شاید لارڈ کرزن، وائسرائے ہند (قبل تقسیم) کا تھا۔

طرابلس اور پھر اس کے فوراً بعد بلقان کی لڑائیاں شروع ہوئیں۔ وہ لڑائیاں جو بظاہر اٹلی اور ریاست ہائے بلقان لیکن بہ باطن مغربی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ تھیں تو اس اضطراب کی شدّت پورے طور پر ظاہر ہوگئی۔ اس کے تھوڑے دنوں کے بعد جنگِ عظیم کی ابتدا ہوئی اور اس کا خاتمہ جیسا کہ سب کو معلوم ہے دولتِ عثمانیہ کے انتزاع پر ہُوا جس کے ساتھ ساتھ خلافت کا شیرازہ بھی منتشر ہوگیا۔ لیکن یہ ہُوا تو انگریزی سلطنت سے اشتراک اور وفاداری کی وہ اساس بھی درہم برہم ہوگئی جس کی بنا پر مسلمان اپنی محکومی کو تعاون کا رنگ دیتے رہے تھے کیونکہ یہ صرف برطانوی شہنشاہیت تھی جس سے عالمِ اسلام کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا تھا۔ لہٰذا اب ان کے سامنے حکومت میں حصّہ داری یا تحفّظِ حقوق کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ اس ملک کی اکثریت یعنی ہندوؤں سے مفاہمت اور بیرونی تسلّط سے آزادی کا۔ یوں تحریکِ خلافت کا آغاز ہُوا جس نے حکومت سے ترکِ موالات اور ہندو مُسلم اتحاد کی شکل میں آزادیٔ وطن اور احیائے خلافت کو اپنا مقصود ٹھہرایا۔ لیکن ہندو مُسلم اتحاد کی حقیقت ایک خیالِ خام ثابت ہوئی اور ترکِ موالات کی تحریک کو خود اکثریت نے چلنے نہ دیا۔ چنانچہ یہ امر بڑا معنی خیز ہے کہ بارڈولی میں جب گاندھی جی نے قانون شکنی کی تحریک ملتوی کر دی جس کا مطلب یہ تھا کہ حکومت کے خلاف اب کوئی اقدام نہیں کیا جائے گا تو اس پر سب سے زیادہ احتجاج مسلمانوں ہی نے کیا، کیونکہ اس طرح ان کی سیاسی زندگی میں ایک خلا سا پیدا ہوگیا تھا اور ان کے سامنے کوئی ایسا نصب العین بھی نہیں رہا تھا جس سے ان کی سیاسی زندگی کوئی قطعی اور واضح شکل اختیار کرتی۔ کانگرس کے تعمیری

پروگرام سے بھی انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی، نہ بہ حیثیت ایک قوم انھیں اس سے کوئی فائدہ ہی پہنچ سکتا تھا۔ دوسری جانب اکثریت نے اب ایک ایسا کھیل کھیلنا شروع کر دیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ بجز اس کے کسی دوسری قوم کا وجود ہی تسلیم نہ کیا جائے تاکہ مستقبل کے ہندوستان میں زمامِ اقتدار اسی کے ہاتھ میں رہے۔ وطنی قومیت کا اصول چونکہ اس مقصد کے لیے بے حد موزوں تھا، لہٰذا کانگرس نے عمرانی حقائق، اعمال اور اصول غرضیکہ جو بات سمجھ میں آئی اُس پر زور دیتے ہوئے متحدہ قومیت کی آڑ لی اور یوں مسلمانوں کے لیے ایک نیا فتنہ کھڑا کر دیا۔ یہاں اس امر سے بحث نہیں کہ تحریکِ علی گڑھ کی ابتدا ہی سے مسلمانوں کی حیاتِ ملی میں خود مسلمانوں ہی کے بعض حلقوں نے اصولاً اور عملاً کیا کیا اُلجھاؤ پیدا کر رکھے تھے اور اس سے مسلمانوں کا دل و دماغ کس طرح متاثر ہوتا رہا۔ یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ اب جو تحریکِ ترکِ موالات کا خاتمہ ہوا اور اس کے ساتھ خلافت کا، دوسری جانب وطنی قومیت اور اس کے زیرِ اثر نئے نئے اجتماعی اور معاشی تصوّرات نے سر اٹھایا تو مسلمانوں کا انتشار انتہا کو پہنچ گیا۔ حقیقتہً اب ان کے سامنے کوئی مقصد نہیں تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ شدھی، تبلیغ اور نہرو رپورٹ کی ردوکد نے دیر تک ان کو چند ایک فرضی مقاصد میں اُلجھائے رکھا۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اب ان کے سامنے کوئی نصب العین تھا، نہ لائحہ عمل جس سے دلوں میں ولولے اور اُمنگ پیدا ہوتی، یا جس سے ان کے قوائے عمل پھر سے حرکت میں آتے۔ اِس کے برعکس کانگرس، یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ہندو اکثریت کے سامنے ایک دلیل اور واضح قرار دادِ عمل تھی۔ ان کا ایک قومی نصب العین تھا۔ اُن میں اتفاق تھا؛

اتحاد تھا ایک سوچی سمجھی ہوئی ہندو جدوجہد تھی اور پھر اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ انڈین نیشنل کانگریس، بالخصوص اسلامی اقلیت کی بعض جماعتیں ان کے ساتھ تھیں تا آنکہ کانگریس نے علی الاعلان یہ دعوٰی کیا کہ اسے مسلمانوں کی تائید حاصل ہے۔۔ یہ صرف چند مفاد پرست جماعتیں یا افراد ہیں جو تصفیۂ حقوق کے پردے میں برطانوی شہنشاہیت کی حمایت کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۳۰ قریب آیا تو مسلمانوں کے احتجاج اور ناراضگی کے باوجود کانگریس نے بہ حیثیتِ قوم انھیں بالکل نظر انداز کر دیا۔ مسلمانوں کے لیے بھی یہ زمانہ بڑے انتشار اور خلفشار کا تھا۔ لیگ اور اربابِ لیگ کا اندرونی اختلاف، صوبجاتی مجالس میں لیگ کا محض یہ مطالبہ کہ وزارتوں کی تشکیل میں اس کا بھی کوئی حصّہ ہونا چاہیے (سابق) پنجاب کی اتحاد یا یونینسٹ پارٹی جو اپنی صوبجاتی اور غیر فرقہ وارانہ حیثیت کے باوجود مسلمانوں کے اتحاد میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کر رہی تھی۔ جمعیۃ العلما، احرار، خاکسار اور نیلی پوش کوئی بھی اس خلا کو پُر کرنے کے قابل نہیں تھا جو مسلمانوں کی زندگی میں پیدا ہو چکا تھا۔ لہٰذا یہ امر کہ وہ بجائے خود ایک قوم ہیں، ان کا ایک سیاسی تشخص ہے، ایک اجتماعی نصب العین، ملکی ہیئت اور کردار سب کی نگاہوں سے اوجھل ہو رہا تھا۔ چنانچہ اس زمانے کے حالات کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کا ذہن عجیب عجیب مغالطوں اور ایک بڑی گھٹیا سیاست اور معاش کے چکر میں اُلجھ گیا تھا۔ اندریں حالات سوال یہ تھا کہ مسلمان کیا کریں؟ ان کے لیے دو ہی راستے تھے۔ یا تو ہندی قومیت کو مان کر ہندو اکثریت میں مدغم ہو جائیں، مذہبی اعتبار سے نہ سہی سیاسی اور اجتماعی اعتبار سے تو لازمًا، یا پھر اپنا کوئی نصب العین

متعیّن کریں۔ ایک روز یہی باتیں ہو رہی تھیں اور زور اِس امر پر تھا کہ مُسلمانوں کا اِتحاد ان کی ہر جِدّوجُہد کی شرطِ اوّلین ہے۔ مُسلمانوں سے اِسلام، اِسلام سے اس کے سیاسی، اجتماعی مقاصد اور سیاسی، اجتماعی مقاصد سے بعض فلسفیانہ اور مابعد الطبیعی تصوّرات کا ذِکر آگیا۔ مَیں نے عرض کیا خُطبات[۲] کی اِشاعت کب ہوگی۔ فرمایا انتظام ہو رہا ہے۔ مَیں نے پھر عرض کیا ان کا اُردُو ترجمہ کیسا رہے گا۔ ارشاد ہُوا "ہو جائے تو اچھا ہے۔ لیکن ترجمہ کرے گا کون؟ مَیں نے عابد صاحب[۳] کا نام لیا۔ فرمایا "دہلی واپس جا رہے ہو۔ اُن سے گفتگو کرو۔ ان کا ترجمہ کامیاب رہے گا۔"

لیکن شُرُوع جنوری ۱۹۳۰ میں دہلی واپس آیا اور عابد صاحب سے خُطبات کے ترجمے کا ذِکر چھیڑا تو اُنھوں نے بافسوس معذوری کا اظہار کیا۔ وہ اس زمانے میں بڑے مصروف تھے۔ لہٰذا مَیں نے حضرتِ علّامہ کو اس امر کی اِطلاع کر دی اور مُنتظر رہا کہ آیندہ کیا ارشاد ہوتا ہے۔ یُوں بھی خطبات ابھی زیرِ طبع تھے اور اس لیے بظاہر عُجلت کا کوئی جواز بھی نہیں تھا۔ مگر پھر جب طباعت کا

---

۲۔ Six Lectures on the Reconstruction of Religious Thought in Islam اُردُو عنوان تشکیلِ جدیدِ الٰہیاتِ اسلامیہ۔ بعد میں ایک اور خطبے کا اضافہ ہُوا۔

۳۔ ڈاکٹر سیّد عابد حسین، ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی (برلین)، اُستاذ فلسفہ، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، دہلی۔ اب شاید جامعہ سے بالواسطہ تعلّق ہے۔ مغربی فلسفہ کی متعدد کتابوں کا ترجمہ ان کے قلم سے شائع ہو چکا ہے۔

مرحلہ بڑی حد تک تکمیل کو پہنچ گیا تو حضرتِ علامہ نے ارشاد فرمایا :

لاہور ۴ اپریل ۱۹۳۰ء

ڈیئر نیازی صاحب ۔ السلامُ علیکُم ۔

انگریزی لیکچر قریباً ۱۵ اپریل تک چھپ کر تیار ہو جائیں گے ۔ آپ اپنے دوست سے پُوچھیے کہ آیا وُہ اُردُو ترجمہ کرنے کے لیے لاہور آ سکیں گے یا نہیں ۔ اگر وُہ نہ آ سکتے ہوں تو آپ خُود یہ کام کرنے کو تیار ہیں یا نہیں ۔ ترجمہ بلا معاوضہ نہ ہو گا ۔

ایک صاحب امیر شامی نے جو غالباً جامعہ ملیّہ سے تعلق رکھتے ہیں گلشنِ رازِ جدید کی شرح کے لکھنے کا خیال ظاہر کیا تھا ۔ مَیں نے ان کو اجازت بھی دے دی تھی ۔ اس کے بعد ان کا کوئی خط نہیں آیا ۔ چُونکہ ایک صاحِب لاہور میں بھی اس کام کے لیے آمادہ ہیں ۔ اس واسطے ان سے دریافت کر کے مُجھے مطلع کریں ۔

مولانا شوکت علی اس وقت دہلی میں ہیں ۔ مَیں نے ان کو بمبئی کے پتہ پر ایک خط لکھا تھا ۔ معلوم نہیں ان تک پہنچا یا نہ پہنچا ۔ ان سے مل کر دریافت کریں کہ میرا خط ان تک پہنچا یا نہ پہنچا ۔ اگر پہنچا ہے تو اب تک جواب کیوں نہیں ملا ۔ باقی خُدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے ۔ عابد صاحب سے سلام کہیے ۔ والسّلام

محمد اقبال

حسبِ ارشاد مَیں نے پھر عابد صاحب سے گفتگو کی ، مگر اُنھوں نے

بہ سببِ مصروفیت پھر معذوری کا اظہار کیا۔ امیر شامی [۴] صاحب سے بھی ملا
اور حضرتِ علامہ کا پیغام پہنچا دیا۔ ان کا تعلق جامعہ ملیہ سے تو نہیں تھا لیکن
قیام قرول باغ ہی میں تھا، یعنی جامعہ کے نزدیک۔ یہ معلوم نہ ہو سکا لاہور میں
کون صاحب گلشنِ رازِ جدید کی شرح لکھنا چاہتے تھے۔ مولانا شوکت علی بدستور
بمبئی میں تھے۔ میں نے اِن اُمور کی اطلاع حضرتِ علامہ کی خدمت میں کی تو آخر
میں یہ بھی عرض کر دیا کہ اگر میں ترجمے کا واقعی اہل ہوں تو میری خدمات حاضر ہیں۔
رہا معاوضہ سو اس کا خیال عابد صاحب کو ہے نہ مجھے۔ ہمارے لیے یہ سعادت
کیا کم ہے کہ خطبات کا ترجمہ کر سکیں۔ ارشاد ہوا:

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ کتاب چھپ گئی ہے۔ اس کی جلد بندی ۶ اپریل تک ختم ہو جائے گی۔ میرا قصد تھا کہ جلد بندی کے بعد آپ کو خط لکھوں گا۔ بہر حال تعطیلوں میں آپ غالباً لاہور آئیں گے ہی۔ آپ نے یہ نہیں لکھا کہ آپ کے کالج میں تعطیل کب ہوگی۔ جامعہ کے بند ہونے پر آپ لاہور آنے کا قصد رکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ تشریف لائیں اور نمونۃً ایک آدھ لیکچر کا ترجمہ کریں۔ پھر فیصلہ ہو سکے گا۔ اس کام میں

---

۴۔ ماقستم الحروف کے مخلص دوست۔ امیر حمزہ شامی کہتے ہیں حضرتِ علامہ نے شرح کی اجازت تو دے دی تھی، لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا تھا کہ اس سلسلے میں ان سے کوئی خط و کتابت نہ کی جائے۔ لہٰذا اُنھوں نے شرح لکھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

اور احباب کی مدد بھی آپ کے شاملِ حال ہوگی۔

محمد اقبال

لاہور۔ ۲۷ اپریل

حضرتِ علامہ کا یہ والانامہ صادر ہوا تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میرے لیے یہ خیال بڑا مسرت انگیز تھا کہ حضرتِ علامہ نے ترجمے کے سلسلے میں مجھے نظرانداز نہیں کیا۔ اپنے پچھلے عریضے میں میں یہ تو عرض کر ہی چکا تھا کہ تعطیلات کے شروع میں لاہور حاضر ہو جاؤں گا، مگر پھر ہوا یہ کہ تعطیلات کے باوجود مجھے بعض مجبوریوں کے باعث دہلی رُکنا پڑا، حتیٰ کہ جون کا مہینہ آ گیا۔ حضرتِ علامہ نے فرمایا:

لاہور، یکم جون

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ کا خط مل گیا ہے۔ ترجمہ کا خیال بدستور ہے بلکہ بعض احباب کی طرف سے تقاضا ہے کہ جلد کیا جائے۔ گو مجھے اس پر شبہ ہے کہ عام لوگ اس سے مستفیض ہو سکیں گے۔ علما جنھوں نے فلسفہ کا خاص طور پر مطالعہ کیا ہے وہ میرا مقصد سمجھ سکیں گے۔ بہرحال جب آپ لاہور آئیں تو نمونہ کے طور پر کچھ حصہ اس کا ترجمہ کر لیں تاکہ معلوم ہو کہ کہاں تک اس کوشش میں کامیابی ہو سکے گی۔ والسّلام

محمد اقبال لاہور

حضرتِ علامہ کا خیال ٹھیک تھا کہ عام لوگ خطبات کے ترجمے سے مستفیض نہیں ہو سکیں گے۔ علما کے بارے میں تو کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا اس لیے کہ انھیں

جدید فلسفہ سے کوئی دلچسپی نہیں، لیکن فلسفہ دان حضرات نے بھی تو ـــــ جیسا کہ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا ـــــ خطبات کو بہت کم سمجھنے کی کوشش کی۔ دراصل خطبات میں حضرتِ علامہ نے اساسی طور پر جو بحث اُٹھائی ہے اُس کا تقاضا ہے کہ مغربی فلسفہ اور علوم و معارف کے ساتھ ساتھ ہمیں اسلام، اسلامی تہذیب و ثقافت اور علم و حکمت پر بھی پورا پورا عبور حاصل ہو۔ محض فلسفہ یا علومِ طبیعی یا تاریخِ تہذیب و تمدن یا مذاہب، الٰہیات اور علومِ دینیہ کا مطالعہ کافی نہیں۔ پھر اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ہماری نظر فکرِ انسانی کے اُن تغیرات پر بھی ہونی چاہیے جو مشرق و مغرب، بالخصوص مغرب میں بڑی تیزی سے رُونما ہو رہے ہیں اور جن سے اس امر کا تھوڑا بہت اندازہ ہو جاتا ہے کہ موجودہ تمدن کا رُخ آیندہ کس جانب ہوگا اور انسان کس قسم کے عالم کی تعمیر کا آرزو مند ہے۔ لیکن نہ خطبات کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کیا گیا، نہ ان کی اشاعت پر یہ توقع پوری ہو سکی کہ اربابِ فن اقبال کا حقیقی مقصد سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ لہٰذا خطبات کا مطالعہ بہت کچھ سطحی رہا، بلکہ ان پر بہت کم توجہ کی گئی جس کا حضرتِ علامہ کو خوب احساس تھا اور اگر ان کی زندگی وفا کرتی تو یقیناً وہ اس موضوع پر پھر سے قلم اُٹھاتے [۵]۔ بہرحال میں شروع جون میں لاہور پہنچا اور حضرتِ علامہ کے زیرِ ہدایت ترجمے کی ابتدا کر دی۔ یہ سارا کام جس طرح ہوا اس کی کیفیت ایک دوسری جگہ

---

۵ ـ ملاحظہ ہو راقم الحروف کا مضمون اقبال کی آخری علالت رسالہ اُردو اقبال نمبر میں۔

بیان کر دی گئی ہے [۶]۔ یہاں صرف اِتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ خطبات کا اُردو عُنوان تشکیلِ جدیدِ الٰہیّاتِ اِسلامیہ حضرتِ علامہ ہی کا تجویز کردہ ہے۔ اصطلاحات کا مسئلہ بڑا وقت طلب تھا اور بعض دُوسرے مُباحث بھی وضاحت چاہتے تھے۔ لہٰذا حضرتِ علامہ کی رائے تھی کہ مَیں مولوی محمد شفیع صاحب [۷] سے مِلوں۔ چنانچہ اُن کے نام ایک تعارفی خط بھی دیا۔ مقصد یہ تھا کہ ان کی وساطت سے مجھے یونیورسٹی لائبریری میں داخلے کی اجازت مِل جائے۔ یہ پہلا موقعہ تھا جب مجھے مولوی صاحب موصوف کا نیاز حاصل ہوا۔ ان کا قیام ان دنوں چینگڑ محلے میں تھا۔ مَیں ان کی خدمت میں حاضر ہُوا تو اُنھوں نے بکمال مہربانی میرے لیے 'ریڈرز ٹکٹ' کا اِنتظام کر دیا۔ اِس سلسلے میں دو ایک بار پبلک لائبریری میں بھی جانا پڑا۔ حضرتِ علامہ کا اِرشاد تھا کہ مَیں ایڈورڈ کارپینٹر کی کتاب "تہذیب" ایک مرض [۸] کا بھی مطالعہ کروں، مگر اس کا جو نسخہ مِلا اِتنا بوسیدہ کہ ہاتھ لگاتے ہُوئے ڈر لگتا تھا۔ ایک روز تیسرے خطبے کے سلسلے میں جہاں خُودی کی بحث آئی ہے حلاّج کا ذِکر آگیا اور حضرتِ علامہ نے بعض مسائل کی تشریح کرتے ہُوئے اس صُوفی مصلوب و مظلوم کی کتاب الطواسین کا حوالہ بھی دیا جس کی شہادت نے "دار" اور "منبر" اور "راز" اور "وعظ" ایسے

---

۶۔ تشکیلِ جدیدِ الٰہیاتِ اِسلامیہ کے مقدمے یعنی خطبات کے اُردو ترجمے میں۔

۷۔ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع ایم۔اے، ڈی۔او۔ایل۔ اس زمانے میں پروفیسر اورینٹل کالج۔

Civilization, A Disease – ۸

الفاظ میں ایک جہانِ معنی پیدا کر دیئے ہیں ۹ ، اور پھر ارشاد ہوا کہ مجھے خود بھی اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ میں نے عرض کیا یونیورسٹی لائبریری میں تو شاید اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں۔ فرمایا "کیا مضائقہ ہے، میرا ذاتی نسخہ لے جاؤ اور بہ خود اس کا مطالعہ کرو۔"

لیکن ۳۱ جولائی کی شام کو جب میں لاہور سے دہلی روانہ ہوا اور حضرت علامہ سے اجازت طلب کی تو فرمایا کتاب الطواسین کہاں ہے۔ میں نے عرض کیا اسمٰعیل صاحب "آج ہی بغرضِ استفادہ لے گئے ہیں، صبح آپ کی خدمت میں پہنچا دیں گے۔ حضرت علامہ نے فرمایا بہتر۔ لیکن میں نے دیکھا کہ بہتر کہتے ہوئے ان کا چہرہ کچھ متغیر سا ہو گیا جس پر مجھے بڑی ندامت ہوئی اور میں نے محسوس کیا کہ حضرت علامہ سے اجازت لیے بغیر مجھے کتاب اسمٰعیل صاحب کو نہیں دینا چاہیے تھی۔ میں اس وقت بڑی مشکل میں تھا۔ میرا دہلی جانا ضروری تھا" اور اسمٰعیل صاحب

---

۹۔ آں رازکہ در سینہ نہاں است نہ وعظ است
بردار توان گفت نہ بر منبر توان گفت ! — غالب
اقبال بہ منبر زد رازے کہ نباید گفت
ناپختہ بروں آمد از خلوتِ میخانہ — اقبال

۱۰۔ چودھری محمد اسمٰعیل صاحب سابق حبیب صاحب کے ہمراہ تعلیم ... اس وقت وہ ریلوے کے کسی اونچے منصب پر فائز تھے۔ اب شاید کراچی میں ہیں۔ بڑے شوق مشرب اور علم دوست حضرت علامہ سے خصوصی عقیدت رکھتے تھے اور باقاعدہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ یہ دیکھ کر کہ حضرت علامہ کا آم سے گویا عشق ہے ملک بھر سے بہترین آم منگواتے اور ان کی خدمت میں پیش کرتے۔ ان کا اپنا گھر بھی ایک طرح سے "دارالانجمن" تھا۔

۱۱۔ تفصیل آگے آئے گی۔

سے ملنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ لہٰذا میرے لیے بجز خاموشی کوئی چارہ نہیں تھا، نجالت آمیز خاموشی جس کو شاید حضرتِ علامہ نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ بہر حال اگلے روز دہلی پہنچ کر میں نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے عزیز دوست سید سلامت اللہ شاہ[۱۲] سے بذریعہ تار درخواست کی کہ اسمٰعیل صاحب سے ملیں اور کتاب اگر حضرتِ علامہ کی خدمت میں نہیں پہنچی تو فوراً پہنچا دیں۔ لاہور سے روانہ ہوتے ہوئے بھی میں یہی بات تاکیداً ان سے کہہ آیا تھا مگر خلافِ توقع انھوں نے میرے تار کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اب میں بڑا پریشان تھا، سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کروں۔ مارے خجالت کے حضرتِ علامہ کی خدمت میں کچھ لکھنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ پھر جب تیسرے روز شاہ صاحب کا خط آیا کہ اسمٰعیل صاحب تو لکھنؤ میں ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ حضرتِ علامہ کا ایک عتاب نامہ بھی تو میرے اضطراب کی کوئی انتہا نہ رہی۔

Lahore

3rd August, 1930.

My dear Niazi Sahib,

I am sorry to say that you made no

---

۱۲۔ میرے ہم جماعت اور مخلص عزیز، مالک، یونائیٹڈ آکشن مارٹ لاہور۔ جامعہ سے بی۔ اے کیا۔ سیاسیات میں حصہ لیا۔ پھر کاروبار میں لگ گئے۔ حضرتِ علامہ کی خدمت میں باقاعدہ حاضر ہوتے۔ افسوس ہے ستمبر ۱۹۵۲ میں انتقال ہو گیا۔

arrangements for the return of the book I lent to you. I think it was your duty to see that the book was returned to me before your departure to Delhi. As a rule I do not part with my books, especially those which I keep constantly with me. Nothing is more painful to me than to be deprived of the use of a book in this way. Such carelessness is unworthy of a man who is himself fond of reading.

Yours affly,

Muhammad Iqbal.

یہ عتاب نامہ خلافِ معمول انگریزی میں تھا جس سے میں نے اندازہ کیا کہ مسائلِ فلسفہ یا زیادہ گہری علمی گفتگو کی طرح حضرت علامہ خفگی کا اظہار بھی انگریزی ہی میں کرتے ہیں۔[13]

---

۱۳۔ میرے مخلص کرمفرما ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی رائے ہے کہ حضرت علامہ نے خفگی کا اظہار انگریزی زبان میں کیا تو محض اس خیال کے باعث جو کسی بات پر خفگی یا ناراضگی میں اکثر پیدا ہو جاتا ہے اور جس کا اظہار غیر زبان میں کیا جائے تو اس کی شدت میں کمی ہو جاتی ہے اور تعلقات میں فرق نہیں آتا۔ یہ اس لیے کہ اگر تعلقات قائم ہیں تو غیر زبان میں خفگی کے اظہار سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے اور یہ اعتماد بھی برقرار رہتا ہے کہ خفگی سے مقصود بیگانگی اور کھینچاؤ نہیں بلکہ صرف رنج اور تکلیف کا اظہار۔

آخر مجبور ہو کر یہی سمجھ میں آیا کہ اس بے بسی میں ایک خط تو سید سلامت اللہ اور ایک لکھنؤ میں اسمٰعیل صاحب کو لکھوں۔ بارے ان کا جواب آیا کہ کتاب حضرتِ علامہ کی خدمت میں پہنچ گئی اور میری پریشانی دُور ہوئی۔ لیکن حضرتِ حضرتِ علامہ خاموش تھے۔ لہٰذا مصلحتاً میں بھی خاموش رہا۔ آخر خدا خدا کر کے ۱۵ اگست کو ایک گرامی نامہ موصول ہوا۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ کا خط مل گیا ہے۔ کتاب الطواسین بذریعہ ڈاک لکھنؤ سے آ گئی ہے۔ جلسۂ لیگ ملتوی ہو گیا ہے۔ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں ہوگا، غالباً لکھنؤ میں۔ یہ بھی ممکن ہے کسی اور جگہ ہو۔ لکھنؤ پنجاب والوں کے لیے ذرا دور ہے۔ بہت سے لوگ جانے کو تیار تھے مگر اخراجات سے گھبراتے تھے۔ عابد حسین صاحب سے کہہ دیجیے کہ مناسب ترمیم کے بعد بل بھجوا دیں۔ میں روپیہ بھجوا دوں گا۔

سورتی صاحب سے ضرور مل لیجیے۔ وہ آپ کو تراجم کے متعلق (بالخصوص اصطلاحات کے تراجم کے متعلق) بہت مفید مشورے دیں گے۔

عابد صاحب سے یہ بھی پوچھیے کہ فاؤسٹ میں Prolegomena in Hezren کا کیا اردو ترجمہ انھوں نے کیا ہے؟ والسلام۔

محمد اقبال

لاہور ۱۴ اگست ۱۹۳۶

حضرتِ علامہ کی خاموشی بلاوجہ نہیں تھی۔ دراصل اسمٰعیل صاحب سے بھی

میری طرح چوک ہو گئی۔ وہ شاید جلدی میں تھے اور کتاب ان کے ساتھ لکھنؤ پہنچ گئی، لہٰذا جب تک لکھنؤ سے کتاب واپس نہیں آ گئی حضرتِ علامہ نے اس کے متعلق مجھے کوئی اطلاع نہیں دی۔ بہر حال یہ گرامی نامہ میرے اطمینان کے لیے کافی تھا۔

مگر اس گرامی نامہ میں مجیب صاحب کی بجائے عابد صاحب کا نام سہواً لکھا گیا (بسلسلۂ بل پیامِ مشرق)۔

Prolegomena in Heaven (تمہیدِ آسمانی) کے بارے میں استفسار کی تقریب یہ تھی کہ ۱۹۲۷ ہی سے جاوید نامہ کا تصوّر حضرتِ علامہ کے ذہن میں کام کر رہا تھا۔ چنانچہ اسی سال جب راقم الحروف نے بعض احباب کی معیت میں ـــ ان میں عابد صاحب بھی شامل تھے ـــ کشمیر کا سفر کیا تو اس سفر کی منزلِ اوّل لاہور قرار پائی۔ کچھ تو اس لیے کہ میں حسبِ معمول لاہور میں رُکے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا تھا اور کچھ اس لیے کہ عابد صاحب جنھیں ابھی تک حضرت علامہ کی خدمت میں باریابی کا شرف حاصل نہیں ہوا تھا مُصر تھے کہ سیاحتِ کشمیر کا پہلا مرحلہ لاہور ہونا چاہیے تاکہ شاعرِ مشرق کے آستان پر حاضری دی جا سکے۔ لہٰذا اس قرارداد کے مطابق ہم لوگ لاہور پہنچے۔ دن بھر سید سلامت اللہ کے یہاں قیام رہا۔ تیسرے پہر حضرت علّامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے ـــ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں ـــ سید سلامت اللہ صاحب نے عابد صاحب اور دُوسرے احباب کا تعارف کرایا۔ گفتگو کا آغاز قدرتاً جامعہ اور کشمیر سے ہوا اور پھر معلوم نہیں اس کا سلسلہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ حضرتِ علامہ کشمیر اور اہلِ کشمیر کا ذکر کر رہے تھے۔ کشمیر کی محکومی اور زبوں حالی، اہلِ کشمیر کی طباعی اور ہنرمندی کا

عابد صاحب نے جرمنی میں تعلیم پائی تھی اور فاؤسٹ کا ترجمہ اردو میں کر رہے تھے۔ جرمنی، جرمن قوم اور جرمن تہذیب کی باتیں ہونے لگیں، گوئٹے کی۔ گوئٹے سے حضرتِ علامہ کو جو فطری اور طبعی مناسبت ہے ـــــ فلسفہ میں، مذہب میں، زندگی میں ـــــ اور جس کا اظہار بالآخر پیامِ مشرق میں ہوا، اس سے گفتگو کا رُخ شعر و شاعری کی طرف پلٹ گیا۔ عابد صاحب دراصل یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ اب حضرتِ علامہ کے ذہن میں کونسی تصنیف ہے۔ وہ ان کا کلام بھی سُننا چاہتے تھے۔ لیکن حضرتِ علامہ سے کلام کی فرمائش کرنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ مگر پھر معلوم نہیں کیسے حضرتِ علامہ ان کا مطلب سمجھ گئے۔ زبورِ عجم اس وقت مطبع میں تھی۔ حضرتِ علامہ نے ازرہِ عنایت اس کے بعض اشعار سُنائے اور پھر فرمایا میری یہ کتاب اہلِ مشرق کے لیے ہے" [۱۴] جس کا مطلب ایک طرح سے یہ تھا کہ جیسے پیامِ مشرق اہلِ مغرب کے لیے۔ (ہم لوگ گلمرگ میں تھے جب یہ اشعار پھر دیکھنے میں آئے، یعنی مطبوعہ نسخے میں) ۔لیکن پھر جب حضرتِ علامہ کے اس ارشاد پر کہ میری یہ کتاب اہلِ مشرق کے لیے ہے عابد صاحب نے کہا اور اس کے بعد؟ تو ارشاد ہوا اس کے بعد دانتے کی ڈیوائن کامیڈی [۱۵] کی طرح ایک اسلامی کامیڈی۔ عابد صاحب نے کہا مگر اس کے لیے تو کسی بیٹرس

---

۱۴- اگر ہو ذوق تو فرصت میں پڑھ زبورِ عجم
فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں

Divine Comedy - ۱۵

(بیاترچے) کی ضرورت ہوگی۔ حضرتِ علامہ مسکرائے اور فرمایا اب میری عمر بیٹرس کی نہیں [۱۶]۔ ہاں جاوید کو اللہ تعالیٰ زندگی دے میں اس کا نام جاوید کے نام پر رکھوں گا۔ پھر پاس ہی رکھی ہوئی تپائی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اپنی بیاضِ اشعار [۱۷] اٹھا کر بعض مطالب کی تشریح میں چند ایک قطعات سنائے جو آگے چل کر بہ حک و اضافہ جاوید نامہ کا جزو بنے۔ حضرتِ علامہ فرما رہے تھے۔ ٹریجڈی [۱۸] یونانی ادب کی خاص چیز ہے جس میں یونانیوں نے اپنی واردات زندگی کا اظہار کیا۔ یہ زندگی ناکامی اور نامرادی کی زندگی تھی، یعنی اس جہانِ آب و گل سے ناسازگاری کی۔ یہ جہانِ آب و گل یوں بھی ناسازگار ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہم اس میں کیا روش اختیار کریں۔ وہ جو اہلِ یونان نے کی یا کوئی دوسری، جیسے مثلاً ڈانٹے نے بہیت کے زیراثر گو یہ جہانِ آب و گل جب بھی ناسازگار ہی رہا اور ڈانٹے نے اسے چھوڑ کر عالمِ بالا کا رُخ کیا۔ عالمِ بالا کا رُخ ابنِ عربی نے بھی کیا اور اب تو ثابت ہو چکا ہے کہ ڈیوائن کامیڈی کا سارا خاکہ ابنِ عربی سے ماخوذ ہے [۱۹]۔ لیکن ابنِ عربی کے معاصر خیالات اور تصوّرات کی دنیا اور تھی، ڈانٹے کی اور۔ صوفیۂ اسلام میں بعض اور بزرگوں نے بھی اپنے مشاہدات کا حال اس پیرایے میں بیان کیا ہے کہ انھوں نے متعدد ستاروں

---

۱۶- I am too old for Beatrice

۱۷- حضرتِ علامہ فُل سکیپ تقطیع کا چھوٹا سا رجسٹر بطور بیاض استعمال کرتے تھے۔

۱۸- Tragedy

۱۹- ملاحظہ ہو اس سلسلے میں پروفیسر ہسپانیہ کا س Palacos کی تصنیف۔

اور سیاروں کی سیر کی۔ مَیں بھی عالمِ بالا کا رُخ کر رہا ہُوں۔ مولانا رُوم میری رہنمائی کریں گے اور آپ دیکھیں گے کہ نقطۂ کامیڈی میں ایک نئے معنی پیدا ہو گئے ہیں جو ڈانٹے پیدا نہیں کر سکا ——— یُونانی تصوّر کے برعکس[20]۔

فاؤسٹ[21] کے سلسلے میں بھی اِتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ عابد صاحب نے اس کے صرف ایک، یعنی پہلے حصّے کا ترجمہ کیا تھا۔ لیکن حضرتِ علّامہ کا خیال تھا دُوسرے حصّے کا ترجمہ بھی ہونا چاہیے۔ بلکہ ایک دفعہ مُجھ سے فرمایا دُوسرا حصّہ بہت کم لوگوں کی سمجھ میں آتا ہے۔ اس میں متعدد اِصطلاحات کیمیاگری کی ہیں۔ بعض اسما اور مُصطلحات بھی اس طرح کے ہیں جن کو اہلِ مشرق تو خُوب سمجھتے ہیں لیکن اہلِ مغرب بہت کم۔ فرمایا قیامِ جرمنی میں اس موضُوع پر گفتگو ہوتی تو مَیں ایسے متعدد مقامات کی تشریح کرتا جس پر خُود جرمنوں کو بھی تعجّب ہوتا۔ لہٰذا عابد صاحب چاہیں تو دُوسرے حصّے کے ترجمے میں مَیں ان کا ہاتھ بٹا سکتا ہُوں۔ مَیں نے اس کا ذکر عابد صاحب سے کیا تو انھیں بے حد مسرّت ہُوئی۔ وُہ چاہتے تھے حضرتِ علّامہ کی خدمت میں حاضری کا موقع مِل جائے تو حصّہ ثانی کا ترجمہ بھی کر ڈالیں۔ مگر افسوس ہے بعض موانع کی بنا پر اس دُوسرے حصّے کے ترجمے کی نوبت نہیں آئی۔

---

۲۰۔ یہ ساری بحث ایک الگ گفتگو میں مُرتّب ہو رہی ہے۔

۲۱۔ یونانیوں کے نزدیک زندگی ایک بڑی خوفناک اور بڑی تکلیف دہ چیز تھی۔ نہ یہ ماحول اس کے لیے سازگار تھا، نہ اس کے احوال و ظرُوف۔ لہٰذا ناممکن تھا کہ انسان اپنی بہترین آرزُوؤں اور تمنّاؤں میں کامیابی اور سرفرازی کا مُنہ دیکھے۔

لیگ کے اجلاس سے مُراد وُہ اجلاس تھا جو بالآخر الٰہ آباد میں منعقد ہُوا اور جس میں ایک ہندی اسلامی ریاست ـــــ پاکستان ـــــ کی تاسیس پر زور دیتے ہُوئے حضرتِ علامہ نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا کہ ایک نہ ایک روز اس کا قیام ناگزیر ہے۔

ستمبر کا مہینہ خاموشی میں گزر گیا اور نہ اس لیے کہ میں ابھی لاہور ہی میں تھا جب والد ماجد مرحُوم و مغفور نے یہ تشویش انگیز اطلاع دی کہ میرا سب سے چھوٹا بھائی شبیر احمد بے حد بیمار ہے۔ اطلاع کیا تھی، بجلی کی ایک رَو جو میرے تن بدن میں پھر گئی اور ایک لحظہ کے لیے کچھ یُوں نظر آیا جیسے شبیر اب ہمیشہ کے لیے ہمارا ساتھ چھوڑ دے گا۔ اس احساس سے دِل کی جو حالت ہُوئی اُسے بیان نہیں کر سکتا۔ مگر پھر رحمتِ ربی کے بھروسے تسکین ہو گئی۔ میں جو لاہور سے بہ عجلت دہلی واپس آیا، حتیٰ کہ کتاب الطّواسین بھی اسمٰعیل صاحب کے یہاں چھوڑ دی تو اس کی وجہ میرا یہی انتشار اور تشویش تھی۔ اگست کا مہینہ تشخیص و تدبیر اور علاج معالجے کی پریشانیوں میں گزرا۔ ستمبر میں کچھ اطمینان ہُوا تھا کہ آیندہ مہینوں میں سکُونِ قلب پھر درہم برہم ہو گیا۔ ایجی ٹیشن میں جامعہ اور یُوں بھی اہلِ دہلی کا سب سے بڑا سہارا جناب ڈاکٹر انصاری مرحُوم و مغفور کی ذاتِ والاصفات تھی، مگر وُہ نمک سازی[۲۲] کے ہنگامہ دانڈی وغیرہ میں گرفتارِ بلا ہو کر زنداں پہنچ گئے تھے۔ لہٰذا ان سے مشورے کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ حلب میں البتہ اُس

---

۲۲۔ یعنی قانُون شکنی کی وُہ مہم جو گاندھی جی نے ۱۹۳۰ میں شرُوع کی۔

وقت سب سے بڑی شخصیت حکیم محمد احمد خاں مرحوم کی تھی۔ انھوں نے بڑی محنت اور خلوص و توجہ سے علاج کیا لیکن صحت اور بیماری تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ علالت کا سلسلہ طول کھینچتا گیا اور میری حالت یہ کہ مرض میں افاقہ ہوتا تو ترجمے کا سلسلہ شروع کر دیتا۔ تکلیف بڑھتی تو مجبوراً یہ سلسلہ رُک جاتا۔ اس پریشانی میں خط و کتابت کا سلسلہ بھی چھوٹ گیا۔ حضرت علامہ بجا طور پر معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ترجمے کی رفتار کیا ہے۔ چنانچہ شروع اکتوبر میں استفسار فرمایا:۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

ترجمہ میں کچھ پروگریس ہوئی یا نہیں؟

بل جامعہ بک ڈپو کی طرف سے اب تک نہیں پہنچا۔ ان سے کہیے بل جلد ارسال کریں تاکہ ادا کر کے حساب صاف کیا جائے۔ پچاس کتابوں کے متعلق وہ آسانی سے حبیب صاحب سے دریافت کر سکتے ہیں۔ اور اگر وہ ان کی قیمت کو نظر انداز کرنا چاہتے ہیں تو نظر انداز کر کے ہی مجھے بل ارسال کریں۔ بشرطیکہ معاملہ جلد طے ہو جائے تو بہتر ہے۔ میرے خیال میں بہتر ہو کہ وہ نصف قیمت ان کتب کی وضع کریں۔ والسلام۔

آپ کے دوست مسٹر محمد اسمٰعیل کہاں ہیں؟ معلوم ہوتا ہے وہ لاہور واپس نہیں آئے۔

محمد اقبال لاہور

یکم اکتوبر ۱۹۳۰

میں نے ابھی تک اپنے عزیز بھائی کی علالت کی اطلاع حضرت علامہ کو

نہیں کی تھی۔ اب مجبوراً سب حالات عرض کرنا پڑے۔ البتہ میں نے یہ نہیں لکھا کہ مرض خطرناک ہے، کیونکہ اس وقت آنعزیز کی صحت بہت کچھ عود کر آئی تھی۔

بل کے متعلق حسبِ ہدایت مکتبہ کو تاکید کر دی گئی۔

ہاشمیل صاحب کے بارے میں عرض کیا کہ لکھنؤ میں چھٹی منا رہے ہیں، عنقریب حاضرِ خدمت ہو جائیں گے۔

حضرتِ علامہ پھر خاموش ہو گئے اور اس خاموشی کی بڑی وجہ سیاسی مصروفیات تھیں —— یعنی آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے معاملات اور گول میز کانفرنس کے سلسلے میں اکابرِ قوم کی گفتگوئیں —— پھر یہی دن تھے جب مولانا محمد علی لاہور تشریف لائے اور حضرتِ علامہ سے اُمورِ سیاست میں تبادلۂ خیالات کرتے رہے لیکن یہ کوئی رسمی ملاقات نہیں تھی بلکہ اقبال اور محمد علی کی آخری ملاقات!

۸ نومبر کا عنایت نامہ ہے :۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السّلامُ علیکم۔

جامعہ ملیّہ مطبع سے بل ابھی تک موصول نہیں ہوا۔ مہربانی کر کے اُن سے کہیے کہ جلد ارسال کریں۔ اب تو حبیب صاحب میں نے سُنا ہے دہلی واپس آ گئے ہیں۔ بل مذکور کی تیاری میں ان کو کوئی دقت نہ ہوگی۔ میں آج شام ایک روز کے لیے مراد آباد جا رہا ہوں۔ سوموار کی صبح کو واپس لاہور آ جاؤں گا۔ اُمید ہے میری واپسی تک بل آ جائے گا۔ والسّلام۔

مجیب صاحب کی خدمت میں میری طرف سے سلام کہیے۔

محمد اقبال لاہور

مجیب صاحب واقعی دہلی واپس آ رہے تھے۔ وہ آئے تو حضرتِ علامہ کا سلام و پیغام پہنچا دیا۔ مُراد آباد کا سفر مسلم کانفرنس کے سلسلے میں پیش آیا تھا۔ حضرتِ علامہ لاہور واپس تشریف لائے تو کچھ دِنوں کے بعد ایک گرامی نامہ موصول ہُوا جو سرتاسر کاروباری تھا۔ بات یہ ہے کہ حضرتِ علامہ معاملے کے نہایت صاف تھے اور مطبع جامعہ جس کے حالات مجیب صاحب کی علالت کے باعث کچھ اُلجھ گئے تھے ان کے اِرشادات کی تعمیل نہیں کر سکا تھا۔ لہٰذا اُنھیں بار بار یاد دلانا پڑا۔ اس سے اگلا مکتوب بھی سرتاسر کاروباری ہے :-

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ کا خط ابھی ملا۔ بہت بہتر ہے جس طرح مجیب صاحب کہتے ہیں اس پر عمل کیا جائے۔ حامد علی خاں صاحب کا خط آیا تھا۔ میں نے ان کو کل جواب لکھا تھا کہ وہ بِل بھیج دیں۔ کیونکہ مجھے یہ معلوم نہیں کہ اصل معاملہ مطبع کی طرف سے کس قدر تھا۔ ان کے خطوط میں یہ تو لکھا تھا کہ فلاں فلاں رقم بل سے وضع کر لی جائے مگر یہ نہ معلوم ہُوا کہ جس رقم سے یہ رقم وضع ہوں گی اس کی مقدار کیا ہے۔ شاید وہ خیال کرتے ہیں کہ اصل بل جو اُنھوں نے اِبتدا میں اِرسال کیا تھا میرے پاس ہے۔ مگر وہ ان کو واپس بھیج دیا گیا تھا۔ آپ بھی ان کو تاکید کر دیں کہ اصل

بل یا اس کی نقل میرے پاس بھیج دیں تاکہ مجھے اصل معاملہ معلوم ہو۔
اور اس طرح میں ان کی بیان کردہ رقم وضع کروں اور باقی ان کی خدمت
میں ارسال کروں۔ والسلام۔

محمد اقبال بیرسٹر لاہور

۲۰ نومبر ۱۹۳۰

مطبع جامعہ نے تعمیلِ ارشاد کر دی۔ ترجمہ جاری تھا لیکن بڑی پریشانیوں میں۔ حضرتِ علامہ کی ہدایت تھی کہ ادائے مطالب اور مصطلحات کے بارے میں علما کا مشورہ ضروری ہے۔ انگریزی دان اصحاب تو انگریزی میں بھی خطبات کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ ہماری توجہ در اصل غیر انگریزی دان حضرات پر ہونی چاہیے۔ لہٰذا میرا معمول تھا کہ خطبات کی اکثر عبارتیں مولانا شورتی[۲۳] اور مولانا اسلم[۲۴] کو پڑھ کر سناتا۔ ایک روز تیسرے خطبے کے سلسلے میں آیۂ نور[۲۵] کی بحث آگئی۔ مولانا اسلم نے فرمایا ڈاکٹر صاحب نور

---

۲۳۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ۔ مولانا محمد الشورتی، استاذِ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ (غیر منقسم ہندوستان میں بہت کم علما ان کے درجۂ فضیلت کو پہنچتے تھے۔ اگست ۱۹۴۲ میں وفات پائی اور افسوس یہ ہے کہ بڑی پریشانیوں میں۔ راقم الحروف کے حال پر بڑا کرم فرماتے تھے۔ والدِ ماجد کے محبین و مخلصین میں سے تھے۔

۲۴۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ۔ مولانا اسلم جیراج پوری۔ استاذِ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ مولانا کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ دسمبر ۱۹۵۵ میں انتقال ہوا۔ میرے اور والدِ ماجد کے بڑے مخلص کرم فرماؤں میں سے تھے۔

۲۵۔ اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ ...... الخ (النور، الآیہ

کو مادّی نُور کے معنوں میں استعمال کر رہے ہیں اور پھر ہر چند کہ میں نے مولانا کی غلط فہمی رفع کرنے کی کوشش کی اُنھیں اصرار رہا کہ میں ان کا یہ خیال حضرتِ علامہ تک پہنچاؤں۔ اس پر فوراً ارشاد ہوا بلکہ راقمُ الحرُوف کو ہلکی سی تنبیہ بھی فرمائی:۔

۹ دسمبر ۱۹۳۰ء

ڈیئر نیازی صاحب۔

السلام علیکم۔ آپ بُک ڈپو کے مینجر صاحب کو یاد دلائیں کہ وہ ۳۹۰ روپے کے چیک کی رسید ارسال کریں جو میرے کلرک نے کئی دن ہُوئے ان کی خدمت میں ارسال کیا تھا۔ ان کو لکھا گیا تھا کہ باقی روپیہ (-/۷۵) چیک کے وصُول کی رسید آنے پر بھیج دیا جائے گا۔ مگر ان کی طرف سے کوئی رسید اس وقت تک وصُول نہیں ہُوئی۔ چیک رجسٹری شُدہ خط میں بند تھا۔ کلرک کو بھی تردّد ہو رہا ہے۔ رسید آنے پر باقی روپیہ ارسال ہوگا۔

مولانا اسلم کا ارشاد بجا ہے۔ مگر اس آیت کو تاریخی نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔ اس مضمون کی آیات قریباً تمام کُتُبِ سماوی میں موجود ہیں۔ اس کا مقصُود یہ نہیں کہ خُدا مادی معنوں میں نُور ہے Light dealt with in physical science.[۲۶] نُور محض ایک استعارہ

---

۲۶۔ جیسا کہ نُور سے عُلُومِ طبیعیّہ میں بحث کی جاتی ہے۔

ہے جیسے قدیم کتبِ سماوی میں pantheistic غرض کے لیے استعمال کیا گیا
تھا یعنی وجودِ باری کو ہمہ گیر pervasive ظاہر کرنے کے لیے۔ قرآن نے میری
رائے ناقص میں اس قدیم استعارہ کو وجودِ باری کی absoluteness [۲۸] کے
اشارہ کرنے کے لیے استعمال کیا ہے کیونکہ عالمِ مادی بھی زمانہ حال کی تحقیق کی
رُو سے صرف نُور ہی ایک ایسی چیز ہے جو relatively absolute [۲۹]
ہے۔ مقدمہ وغیرہ کا انتظام ابھی سے کر لیجیے۔ غالباً بنارس جاؤں گا۔ والسلام

محمد اقبال

مکرر آنکہ: معلوم ہوتا ہے تیسرے نکتے میں جو کچھ آیتِ مذکورہ میں
میں نے لکھا ہے آپ کو اس کی اچھی طرح سمجھ نہیں آسکی ورنہ مولانا اسلم اس غلط فہمی
میں مبتلا نہ ہوتے کہ میرے خیال میں اس آیتِ قرآنی میں خدا تعالیٰ نے اپنے آپ کو نُور
(مادی معنوں میں) قرار دیا ہے۔

تنبیہ کا خیال بشکلِ مکرر آنکہ بعد میں آیا۔ بہر حال میں نے مولانا کو حضرتِ
علامہ کا مکتوب پڑھ کر سنا دیا لیکن ان کی تسلی نہ ہوئی۔ فرمایا اللہ تعالیٰ کا اپنے آپ
و نُورُ السمٰوٰت والارض کہنا اس لیے نہیں کہ یہاں نُور سے مراد وہ نُور نہیں جو مرئی
کے ساتھ قائم ہے، جیسے قرآنِ پاک میں فضا مخلق کہا گیا ہے بلکہ یہ وہ نُور ہے
جو مادی کے ساتھ قائم ہے یعنی جس سے اس عالم کی ہستی محسوس ہوتی ہے۔ لہٰذا

---

۲۷ - وحدۃ الوجودی۔
۲۸ - مطلقیت۔
۲۹ - اضافی طور پر مطلق۔

یہ آیت زیادہ غور و فکر کی محتاج ہے۔ مزید تشبیہات دراصل اس (نُور) کو سمجھانے کے لیے ہیں۔ ان پر غور کرنا لازم ہے۔ مثلاً بیت سے مُراد ہے دین، طاق سے مردِ مومن، زجاج سے ایمان، زجاجہ سے قلب، زیت سے آسمانی تعلیم۔

مَیں نے مولانا کی تاویل حرف بہ حرف حضرتِ علامہ کی خدمت میں پہنچا دی۔

مقدمے کا اشارہ تشکیلِ جدیدِ الٰہیاتِ اسلامیہ کے مقدمے کی طرف ہے۔ حضرتِ علامہ کے ذہن میں یہ خیال مولانا اسلم کی تاویل کو دیکھ کر پیدا ہُوا۔ بات یہ ہے کہ چودھری محمد حسین مرحوم حضرتِ علامہ ہی کے اشارے سے زمیندار یا شاید انقلاب، میں ایک مختصر سا مضمون لکھ چکے تھے جس میں اُنھوں نے خطبات کی ضرورت، اور اہمیت کا ذکر کیا تھا مگر جس کے باوجود اس امر پر بہت کم توجّہ کی گئی کہ خطبات میں فی الحقیقت کیا مسئلہ زیرِ بحث ہے۔ پھر طرح طرح کے تعصّبات مثلاً وُہ تعصّب جو علمی یا عقلی اعتبار سے مغربی تعلیم نے اسلامی فکر کے خلاف پیدا کر رکھا تھا، یا فلسفہ اور مغرب میں فلسفہ کے نشوونما سے اسلامی مشرق کی بے تعلّقی، یا وُہ بے خبری جو مغربی ذہن کو اسلام اور اسلامی تہذیب و ثقافت سے ہے یہ سب باتیں خطبات کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کرنے میں حارج رہیں۔ علاوہ ازیں خود عالمِ اسلام کے انحطاط کے باعث حضرتِ علامہ کا فکر بہت کچھ عسیر الفہم ہو گیا تھا۔ حضرتِ علامہ بھی شروع ہی سے محسُوس کر رہے تھے کہ اُنھوں نے اپنے خیالات کا اظہار جس طرح اشاروں ہی اشاروں میں اور اختصار سے کیا ہے اس سے وُہ اپنا مافی الضمیر کما حقہٗ ظاہر نہیں کر سکے۔ اُنھوں نے فرمایا خطبات کی اشاعت بلا مقدمہ نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن چودھری صاحب مرحوم کو ایک تو اس امر ہی سے اختلاف تھا کہ

خطبات کا ترجمہ اُردُو میں کیا جائے۔ ثانیاً وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کو مسائلِ فلسفہ سے کوئی دلچسپی تو ہے نہیں۔ یُوں بھی مسائلِ فلسفہ سے دلچسپی کی ضرورت ہی کیا ہے۔ مُسلمانوں کے لیے یہ مسائل ضمنی ہی تو ہیں؛ اُصُولی نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی ممکن ہے کہ بہ سبب ایجازِ کلام اس سے بڑی بڑی غلط فہمیاں پیدا ہو جائیں یا پیدا کر دی جائیں۔ پھر چُونکہ خُطبات کے مُباحث خالصتاً فلسفیانہ ہیں۔ اِس لیے ہو سکتا ہے اس طرح کوئی نیا فتنہ کھڑا کر دیا جائے[۳]۔ یہ دُوسری بات ہے کہ اُنھوں نے کھُل کر کبھی اس کا اظہار نہیں کیا، لیکن میں سمجھتا ہُوں ان کی ذہنی کیفیت یہی تھی۔

غالباً بنارس جاؤں گا ـــــ آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لیے جو لکھنؤ میں منعقد ہو رہا تھا، لیکن جس کا انعقاد بالآخر الہ آباد میں ہُوا۔

۱۱ دسمبر ۱۹۳۰ء

ڈیئر نیازی صاحب السلامُ علیکم۔

آپ کا خط مل گیا ہے۔ آیۂ نُور کے متعلق مَیں نے جو کچھ لکھا ہے اسے تاویل کہنا صحیح نہیں ہے۔ تاویل کا لفظ اس وقت صحیح ہوتا ہے جب کسی آیت کے الفاظ کے عام معنی چھوڑ کر کوئی اور معانی لیے جائیں۔ میں نے لفظ نُور کے

---

۳۔ جیسا کہ قاہرہ میں مُقیم ایک ہندی نژاد بزرگ نے ہندوستان (قبلِ تقسیم) کے ایک پرچے میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اقبال کا فکر مغربی فلسفہ سے دب گیا ہے اور اگر اس کی اشاعت اُردو میں ہُوئی تو عُلما کا فرض ہوگا کہ (علی گڑھ کے) نیچری فتنے کی طرح اس کا بھی استیصال کریں۔ نیز ملاحظہ ہو اس سلسلے میں راقم الحرُوف کا مضمون اقبال کی آخری علالت رسالہ اردُو (اقبال نمبر) میں۔

وُہی معنی لیے ہیں جن میں یہ لفظ عام طور پر لیا جاتا ہے۔ مگر آپ کہیں کہ اِس آیہ میں نُور علیٰ ہذا القیاس زجاج وغیرہ سے کچھ اور مُراد ہے تو یہ تاویل ہوگی۔ مَیں نے اپنے تمام لیکچروں میں اس قسم کی تاویل سے پرہیز کی ہے اور الفاظ کو انھیں معنوں میں لیا ہے جن میں وہ عام طور پر مُستعمل ہوتے ہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ حضُورِ رسالت مآبؐ کا بھی طریق تھا۔ یہی طریقِ بحث ابنِ حزم کا ہے۔ مولانا رُوم کا یہ شعر میرے لیے نہ صرف دلیلِ راہ ہے بلکہ سوز و گداز کا بھی سامان ہے:

کردۂ تاویل حرفِ بکر را
خویش را تاویل کن نے ذکر را

باقی رہی دُوسری آیت جس کا ذکر آپ نے اپنے آخری خط میں کیا ہے سو عرض یہ ہے کہ ایک اعتبار سے یہ کہنا بالکل دُرست ہے کہ تمام حوادث پہلے سے متعیّن ہیں۔ میرے لیکچروں کا مشکل ترین حصّہ غالباً یہی بحث ہے۔ اس کو غور سے پڑھنا چاہیے۔ مَیں نے اس حصّہ میں time eternity[31] کے تناقض کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ time کے اعتبار سے حوادث متعیّن نہیں۔ eternity کے اعتبار سے ان کو متعیّن تصوّر کرنا بالکل بجا اور دُرست ہے۔ اس مسئلہ پر غالباً جدید سائنس مزید روشنی

---

۳۱۔ دوامیت اور زمانہ

ڈال سکے گی Einstein [۳۲] سے اس بحث کا آغاز سمجھنا چاہیے۔ عُلَما کے اعتراضات و تصوّرات سے زیادہ سروکار نہ رکھنا چاہیے۔ آپ کو وضعِ اصطلاحات کا فکر کرنا چاہیے۔ آخر یہ مُباحث فلسفیانہ ہیں اور فلسفہ ایک مُتحرِّک شے ہے۔ اس کی کوئی دلیل جیسا کہ مَیں نے دیباچہ میں لکھ بھی دیا ہے قطعی اور آخری قرار نہیں دی جا سکتی۔ علمِ اِنسانی کی ترقّی کے ساتھ ساتھ اِنسانی تصوّرات بھی improve [۳۳] ہوتے جاتے ہیں۔ فلسفہ محض حقائق کو تصوّر کرنے کی کوشش کا نام ہے۔

لیگ کا جلسہ بنارس کی بجگہ اِلہ آباد میں ہوگا۔ اس واسطے میں اِلہ آباد جاؤں گا غالباً ۲۷ دسمبر کو۔ وسط جنوری یا جنوری کے آخر میں آپ کیا ملنے والے ہیں۔ مَیں نے اپنا نام تو پڑھ لیا مگر دُوسرا لفظ نہ پڑھ سکا۔ آپ نے لکھا ہے Iqbal Fest معلوم نہیں Fest [۳۴] سے آپ کی کیا مُراد ہے۔ بہرحال چودھری صاحب کو آپ کا خط دکھا دُوں گا۔

مُشترکہ قومیت کا مفہوم اب تک میری سمجھ میں نہیں آ سکا۔ اِس پر مفصل گفتگو ہو سکتی ہے مگر اس خط میں نہ سمائے گی۔

پروفیسر ہوبل جس کی کتاب کا شاید ترجمہ آپ نے اُردو میں

---

۳۲۔ آئین اسٹائین۔

۳۳۔ بہتر

۳۴۔ جشنِ اقبال

کیا ہے ان کا خط ارلانگن Erlangen (جرمنی) سے آیا تھا۔ وہ لیکچرز کے متعلق لکھتے ہیں:

Your book is one of the most important phenomena in modern times -[۳۵]

زیادہ کیا لکھوں۔ آپ کے دوست اسمٰعیل صاحب سے گزشتہ رات ملاقات ہوئی تھی۔ والسّلام

محمد اقبال

قرآنِ پاک سے حضرتِ علّامہ کے عشق کی یہ کیفیت تھی کہ اِدھر مولانا کی تاویل حضرتِ علّامہ کی خدمت میں پہنچی اور اِدھر اُنھوں نے دُوسرے ہی روز اِس کا مُفصّل جواب رقم فرمادیا جس سے (جہاں تک مَیں سمجھ سکا) مولانا کا پُورا پُورا اطمینان ہو گیا۔ اِس لیے کہ اُنھوں نے پھر کبھی یہ بحث نہیں چھیڑی۔ ضمناً اس جواب میں بعض ایسے اِشارات بھی ہیں جن سے اِس غلط فہمی کا قطعی طور پر ازالہ ہو جاتا ہے کہ یہ مغربی افکار تھے جن کے زیرِ اثر حضرتِ علّامہ نے ایمان کو عقل کا تابع رکھنے کی کوشش کی۔ خطبات کے دیباچے میں بھی اِس غلط خیال کی تردید موجود ہے۔ ان کا کہنا صِرف یہ تھا کہ عقل ایمان کی ضِد نہیں، بلکہ اپنی ساری کوتاہیوں اور مشکلوں کے باوجود اس کے ساتھ ساتھ چلتی اور آگے بڑھتی ہے۔ اس سِلسلے میں یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ مغربی فلسفہ کی انتہا تو عقل

---

۳۵۔ آپ کی کِتاب عصرِ حاضر کے اہم ترین مظاہر میں سے ہے۔

اور ایمان کی "دمی" پر ہوتی ہے، لہٰذا مغربی افکار کے زیرِ اثر ایمان کو عقل کے تابع رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

"مَیں نے اپنا نام تو پڑھ لیا لیکن دُوسرا لفظ نہ پڑھ سکا"۔ یہ دُوسرا لفظ جرمن لفظ Fest تھا بمعنی Festival (جشن) جس کی طرف حضرتِ علامہ کا ذہن منتقل نہیں ہُوا۔ عابد صاحب اور ذاکر صاحب کا خیال تھا کہ جرمن یُونیورسٹیوں کی طرح جامعہ بھی جشنِ اقبال ۳۶ کے نام سے ایک تقریب منائے جس میں ہندوستان کے اکابر اہلِ علم اور ممتاز شخصیتیں شریک ہوں اور حضرتِ علامہ کی خدمت میں، جو خُود بھی رونق افزائے بزم ہوں گے، متعدد علمی اور فلسفیانہ مقالات کا ایک کشکول بطورِ اظہارِ عقیدت پیش کیا جائے لیکن افسوس ہے بعد کے واقعات ــــــ سیاسی ہنگاموں، تحریکِ قانون شکنی اور گول میز کانفرنس کے اعلان وغیرہ ــــ کے باعث یہ ارادہ پُورا نہ ہو سکا۔

چودھری صاحب کا اشارہ چودھری محمد حسین مرحوم کی طرف ہے جن سے اس تقریب کے لیے مضمون لکھنے کی فرمائش کی گئی تھی۔

مشترکہ قومیت کا اُن دِنوں بڑا چرچا تھا، لیکن یہ امر کہ اس طرح کی

---

۳۶۔ اقبال فسٹ سے دراصل جرمن یُونیورسٹیوں کے اتباع میں ایک خالص علمی، ثقافتی، تحقیقی ادارے کا قیام مقصود تھا اور قرار داد یہ کہ ان سب مسائل میں جن کا تعلق فکرِ اقبال سے ہے بالواسطہ یا بلاواسطہ، باقاعدہ تحقیق و تفتیش اور نقد و تبصرہ کا آغاز ہو جائے۔

قومیت ایک عبث اور بے بنیاد سی چیز ہے حضرت علامہ ہی کے ذہن میں تھا۔

پروفیسر ہبل کی کتاب کا عنوان ہے۔ Kultur der Araber

اسمٰعیل صاحب اب پھر شریکِ صحبت تھے۔

○

# ۱۹۳۱

آل پارٹیز مسلم کانفرنس
اپر انڈیا کانفرنس
اسلامی ریاست
حیات بعد الممات
سفرِ انگلستان
مؤتمرِ اسلام بیت المقدس

جنوری، فروری اور مارچ کا مہینہ خاموشی میں گزر گیا۔ مَیں کچھ مصروف تھا، کچھ پریشان۔ مصروفیت تھی علاج معالجے، تیمارداری اور سلسلۂ درس و تدریس کی۔ پریشانی تھی ایک ایسی علالت کی جو روز بروز خطرناک شکل اختیار کرتی جا رہی تھی اور جس کو دیکھ دیکھ کر سارا گھر افسردہ خاطر ہو رہا تھا۔ رنج اور مصیبت کے اُن ایّام میں جن کی یاد بڑی تکلیف دہ اور غم انگیز ہے تھوڑا بہت وقت خطبات کے ترجمے کے لیے نکل آتا اور مولانا اسلم، مولانا سُورتی اور عابد صاحب سے بالالتزام مشورہ رہتا۔ مَیں چاہتا تھا جوں توں کر کے ترجمے کی تکمیل ہو جائے تو نظرِ ثانی کے

بعد تلبیض کا معاملہ کسی دوسرے موقع پر اُٹھا رکھوں۔ مجھے تو اب یہ بھی یاد نہیں پڑتا کہ اس اثنا میں حضرتِ علامہ کا کوئی گرامی نامہ آیا یا نہیں۔ اگر آیا تو ضائع ہو چکا ہے۔ بہرحال اب جو اپنے مکتوبات کو دیکھتا ہوں تو جہاں تک ۱۹۳۱ کا تعلق ہے اس میں سب سے پہلا مکتوب ۳۱ مارچ کا ہے:۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلامُ علیکم۔

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ غلام صابر سے بہت مدت کا وعدہ ان کے ہاں ٹھہرنے کا ہے جس کو مَیں اب تک پورا نہ کر سکا۔ اگرچہ مولانا شفیع داؤدی صاحب نے بھی مکان کا انتظام کر دیا ہے لیکن میرا ارادہ یہی ہے کہ صابر صاحب کے ہاں ہی ٹھہروں گا کہ وعدہ پورا ہو جائے۔ مَیں نے یہ بھی سُنا ہے کہ قرول باغ جہاں صابر صاحب رہتے ہیں شہر سے کئی میل دُور ہے۔ بہرحال مَیں انشاء اللہ ۲ اپریل کی شام کو غالباً بمبئی میل میں یہاں سے چلوں گا۔ ۳ کی صبح کو دہلی پہنچ جاؤں گا۔ باقی خیریت ہے۔ احباب جامعہ کی خدمت میں سلام کہیے۔ قرول باغ میں ٹھہرنے سے ان سے ملنے کے بہت سے مواقع ہوں گے۔ والسلام۔

محمد اقبال لاہور ۳۱ مارچ ۱۹۳۱

حضرتِ علامہ دہلی تشریف لا رہے تھے اور تقریب یہ کہ جنوری ۱۹۳۱ میں جب نمک سازی کی مہم کے خاتمہ پر کانگرس اور حکومت میں سمجھوتہ ہو گیا تو ایک مرتبہ پھر یہ کوشش شروع ہوئی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت کی کوئی صورت نکل آئے۔ یہ موقعہ سیاسی واقعات کی تفصیل

کا نہیں، لیکن سلسلۂ گفتگو کا تقاضا ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کا وہ حسرتناک انجام زیرِ نظر رہے جس نے (غیر منقسم) ہندوستان میں ہزاروں فتنے پیدا کیے اور جس کے بطن سے بالآخر نہرو رپورٹ مسلمانوں کے سیاسی مفاد کے خلاف ایک اعلانِ جنگ بن کر نمودار ہوئی۔ پھر ایک عجیب بات یہ ہے کہ اس سے خود مسلمان تین گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ رپورٹ کے حامی، اس کے مخالفین اور رپورٹ میں اصلاح و ترمیم کے خواہشمند۔ لیکن اس آخری گروہ کی کوششوں کے باوجود، یعنی کلکتہ کنونشن اور قائداعظم کے ۱۴ نکات سے بھی مصالحت کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی اور مسلمان مجبور ہو گئے کہ سیاسیاتِ ہند میں اپنا ایک الگ تھلگ اور متحدہ محاذ قائم کریں۔ چنانچہ یہی خیال تھا جس کے پیشِ نظر جنوری ۱۹۲۹ میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔ پھر جب ۱۹۳۰ میں کانگرس نے قانون شکنی کی مہم شروع کی اور تقریباً سال بھر کی شورش کے بعد ۱۹۳۱ میں اس کے اور حکومت کے درمیان مفاہمت ہو گئی تو یہ بات صاف طور پر نظر آ رہی تھی کہ کانگرس دوسری گول میز کانفرنس میں ضرور شرکت کرے گی۔ لہٰذا شروع اپریل میں مسلمانوں کے مختلف الخیال رہنما غیر رسمی طور پر دہلی میں جمع ہوئے تاکہ باہم تبادلۂ خیالات کریں اور اس طرح گول میز کانفرنس کے پیشِ نظر کوئی متفقہ راہِ عمل نکالیں۔ یہی کانفرنس تھی جس میں شرکت کے لیے دہلی تشریف لا رہے تھے۔

قیام شیخ غلام صابر صاحب[1] کے ہاں رہا اور کوئی چار پانچ روز۔ قرول باغ

---

۱۔ وطن ریاست پٹیالہ۔ حضرتِ علامہ کے نیازمندوں میں سے ہیں۔

نئی دہلی سے کچھ زیادہ دُور نہیں ۔ دِن بھر مُلاقاتیوں کا ہجُوم رہتا اور دن بھر سیاسیات پر گرم گرم بحثیں ہوتیں ۔ پنجاب میں ان دِنوں (مجلسِ وضعِ قانون میں مُسلمانوں کے حقِ نمایندگی کے لیے) ۵۶ فیصدی کی تحریک زوروں پر تھی، کبھی اس کا ذکر آتا کبھی اسلامی ریاست کا ۔ احبابِ جامعہ سے بھی روابط بڑھ رہے تھے اور میرا وقت تو ظاہر ہے زیادہ تر حضرتِ علامہ ہی کی خدمت میں گُزرتا ۔ ایک روز والدِ ماجد قبلہ بھی ساتھ تھے ۔ حضرتِ علامہ سے مُلاقات ہُوئے برسوں گُزر چُکے تھے ۔ وُہ کمرے میں داخل ہُوئے (مَیں ان کے پیچھے کھڑا تھا) تو حضرتِ علامہ سمجھے کوئی صاحب ملنے آئے ہیں لیکن والدِ ماجد کے السّلامُ علیکُم اور کیسا مزاج ہے کے جواب میں الحمدُ لِلّٰہ خیریت ہے' کہہ کر ذرا سر اُٹھایا (حضرتِ علامہ آرام کُرسی پر ٹیک لگائے بیٹھے تھے) تو انھیں پہچان کر یکبارگی اُٹھ کھڑے ہُوئے اور اچھا چچا جان ہیں کہتے ہُوئے بڑے تپاک سے ہاتھ مِلایا، خیریتِ مزاج پُوچھی اور اپنے پاس بٹھا کر دیر تک باتیں کرتے رہے جن میں قدرتاً شبیر کی علالت اور علاج و معالجے کی پریشانیوں کا ذکر بھی آتا رہا ۔ حضرتِ علامہ بہت متاثر ہُوئے، والدِ ماجد کو تسلّی دی اور آنعزیز کی صحت کے لیے دُعا کرتے رہے ۔

تقریباً ایسا ہی واقعہ اس کے دو سال بعد ۱۹۳۵ میں پیش آیا جب سر راس مسعُود مرحُوم محترمہ ادیب خانم کے ایک خطبے کی صدارت کے لیے [۲]

---

۲۔ ذکر آگے آتا ہے ۱۹۳۵ میں۔

جامعہ تشریف لائے ۔ وہ جب ڈاکٹر انصاری بعض دُوسرے حضرات اور ذاکر صاحب کے ساتھ محمد علی ہال میں داخل ہو کر مسند کی طرف بڑھے تو اس پر بہت سے مہمان جمع تھے ۔ ذاکر صاحب نے ان کا تعارف کرایا مگر پھر جب والدِ ماجد کی باری آئی اور ان کا نام لیتے ہوئے سیالکوٹ اور مولوی میر حسن مرحوم و مغفور کا ذکر کیا تو سر راس مسعود نے گویا حافظے پر زور دے کر مستفسرانہ پوچھا کیا اُن کے بھائی اور پھر جیسا کہ انھوں نے والدِ ماجد کو پہچان لیا تھا ڈاکٹر صاحب کے جواب کا انتظار کیے بغیر آگے بڑھ کر بڑی گرمجوشی سے معانقہ اور مصافحہ کیا۔ خیریتِ مزاج دریافت کی اور علی گڑھ کا ذکر چھیڑ دیا۔ ذاکر صاحب کو تعجب تھا کہ سالہا سال گزر جانے کے باوجود سر راس مسعود مرحوم نے پرانے تعلقات کو یاد رکھا اور پھر اُسی خلوص، محبت اور مودت کے ساتھ جو سر سید علیہ الرحمۃ اور مولوی صاحب مرحوم کو آپس میں تھی والدِ ماجد سے پیش آئے ۔ اس واقعے کا تعلق اگرچہ مکتوبات سے دُور کا بھی نہیں، لیکن میں نے یہاں اس کا ذکر کیا تو محض اس خیال سے کہ اِس وضعداری اور مخلصانہ عزت و احترام کی مثالیں اب کہاں ملتی ہیں ۔

مولانا شفیع داؤدی اس وقت کے ہندوستان کی مرکزی مجلسِ وضعِ قانون کے رکن، تحریکِ خلافت اور آل پارٹیز کانفرنس کے سرگرم کارکن تھے ۔ گول میز کانفرنس میں بھی شریک ہوئے اور حضرتِ علامہ کے ہم سفر رہے ۔

خطبات کے ترجمے کا سلسلہ رک رک کر آگے بڑھتا تھا لیکن اس کے باوجود اُمید تھی کہ گرمی کی تعطیلوں تک مکمل ہو جائے گا۔ اب حضرتِ علامہ

کو بھی میری پریشانیوں کا احساس ہو چلا تھا، اس لیے بجائے شکایت کے بڑی ہمدردی کا اظہار فرمایا۔ پھر انھیں دِنوں ایک روز موقعہ پاکر احبابِ جامعہ نے اُن سے درخواست کی کہ ترجمے کی اشاعت جامعہ کی طرف سے ہو۔ فرمایا! "کیا مضائقہ ہے، باضابطہ تحریر بھیج دی جائے"۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلامُ علیکُم۔

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ الحمدُ للہ ہر طرح سے خیریت ہے۔ بہت بہتر ہے اگر جامعہ خطبات کا ترجمہ خریدنا چاہتی ہے۔ علاوہ اس کے یہ مطلع فرمایئے کہ وہ کس قدر کاپیاں چھاپنا چاہتے ہیں۔ علاوہ اس کے کتابت طباعت پر کس قدر خرچ ہوگا تاکہ میں کتاب کی قیمت کا اندازہ کرسکوں۔ میرے خیال میں کتاب عمدہ کاغذ پر چھپنی چاہیے اور کتابت بھی عمدہ ہونی چاہیے۔ اب تک میرا یہ دستور رہا کہ کتاب کمیشن پر فروخت کر دی جاتی ہے بشرطیکہ کُل کتاب خریدی جائے اور قیمت یکمشت بوقتِ خریداری ادا کی جائے۔ والسلام۔

محمد اقبال ۱۹ اپریل ۱۹۳۱

ایپا انڈیا کانفرنس کا جلسہ بھی انشاءاللہ ہوگا۔ شیخ صاحب کی خدمت میں میری طرف سے سلام کہیے۔ الٰہ آباد والے خطبے کا ترجمہ مَیں نے نہیں دیکھا۔

یہ مکتوب میرے اس عریضے کے جواب میں تھا کہ جامعہ کی طرف سے باضابطہ تحریر تو بھیج دی جائے گی، لیکن دریافت طلب امر یہ ہے کہ ترجمے کی

اشاعت کا اہتمام کس نہج پر ہونا چاہیے۔

اپرانٹ یا کانفرنس کا اشارہ اُس وقت کے شمالی مغربی ہندوستان میں ایک خالص سیاسی جماعت کے قیام کی طرف تھا —— حضرتِ علامہ نے کئی نام تجویز کئے۔ مجلسِ ملی، حزبِ جمہور (جدید ترکی کے خلق فرقہ سی کے اتباع میں)، حزبِ عوام وغیرہ وغیرہ —— حضرتِ علامہ کے ذہن میں یہ خیال ہندی اسلامی ریاست کی اس تجویز کے پیشِ نظر جس کی طرف ابھی چند مہینے ہوئے اُنھوں نے الٰہ آباد میں اشارہ کیا تھا پیدا ہوا۔ اس سلسلے میں چند باتیں وضاحت طلب ہیں کیونکہ اپرانٹ یا کانفرنس کا ذکر شاید پہلی مرتبہ ان مکتوبات میں آرہا ہے اور گو یہ موقعہ اس وقت کی ہندی اسلامی سیاست کے کسی تفصیلی تجزیے کا نہیں لیکن غیر مناسب نہ ہوگا اگر بعض حقائق کی تشریح مختصراً کر دی جائے۔ حضرتِ علامہ نے اس کانفرنس کی تحریک اس بنا پر کی تھی کہ الٰہ آباد کے خطبۂ صدارت کو بیشتر ایک سیاسی غزل سے تعبیر کیا جا رہا تھا[۴] ۔ پھر غیر تو غیر ہی تھے اپنے بھی اس کے مخالف یا اگر مخالف نہیں تو

---

۴۔ معلوم نہیں یہ پھبتی کس نے کہی۔ اسے پھبتی ہی کہنا چاہیے۔ یہ غالباً ۱۹۳۱ کی ابتدا تھی جب قرول باغ دہلی میں شاید مولانا محمد علی مرحوم ہی کے دولت کدے پر (غالباً ان کے انتقال کے فوراً بعد) بعض احباب جمع ہوئے۔ ان میں وہ حضرات بھی تھے جنھوں نے خلافت اور ترکِ موالات کی تحریکوں میں حصہ لیا تھا اور تبدیلیِ حالات کے باوجود اپنے مسلک پر قائم تھے اور وہ بھی جو کانگریس کے ہم خیال یا لیگ کے ساتھ تھے۔ دورانِ گفتگو میں کسی نے کہا۔ ارے صاحب آپ نے وہ اقبال کا خطبۂ صدارت بھی پڑھا۔ واللہ کیا خوب شاعری کی ہے۔ آخر شاعر ہی تو ٹھہرے۔ کیسی غزل کہہ گئے ہیں۔ اس پر بڑے زور کا قہقہہ پڑا۔

کچھ ایسے موافق بھی نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا اس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں میں مفاہمت کا کوئی امکان باقی نہیں رہے گا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ الٰہ آباد میں حضرتِ علامہ کا یہ کہنا کہ ہندوستان میں آخر آخر ایک اسلامی ریاست قائم ہو کر رہے گی ان کے ذاتی خیالات اور معتقدات پر مبنی تھا۔ چنانچہ اس موقع پر آپ نے جو خطبہ ارشاد فرمایا اس میں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ یہ میری ذاتی رائے ہے، لیگ کا بحیثیت جماعت اس سے کوئی تعلق نہیں۔ مگر پھر یہ ذاتی رائے درحقیقت ان آرزوؤں امیدان مقاصد اور عزائم کی ترجمانی کر رہی تھی جو ابھی واضح طور پر متشکل نہیں ہوئے تھے۔ یہ ان جذبات و احساسات خیالات اور تصورات، بالفاظِ دیگر اس نصب العینِ حیات کے مبہم سے اظہار کی صاف و صریح تعبیر تھی جو گزشتہ نصف صدی سے تحریکِ علی گڑھ، مسلم لیگ، تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات اور پھر آگے چل کر مختلف جماعتوں اور کانفرنسوں، ان کے مطالبات اور مناقشات کی شکل میں ہو رہا تھا۔ فرد کی زندگی کی طرح قوموں کی بھی اپنی ایک انفرادیت اور شخصیت ہوا کرتی ہے۔ لہٰذا جماعتی عصبیت کا احساس کم و بیش ہر گروہ میں موجود رہتا ہے اور یہ احساس غیر منقسم ہندوستان کے مختلف العناصر باشندوں میں بھی موجود تھا، کسی میں زیادہ کسی میں کم۔ ہندوؤں میں یہ احساس بڑا قوی اور مستحکم تھا اور پھر اس کے ساتھ ساتھ ان کے سیاسی شعور کی پرورش بھی نہایت صحیح نہج پر ہو رہی تھی۔ اس کے کچھ وجوہ تھے۔ وہ اس ملک کے اصلی باشندے تھے۔ ان کا ایک معاشرہ تھا، ایک تہذیب و تمدن، ایک اصولِ زندگی۔ وہ اکثریت میں تھے۔ انھیں انگریزوں نے ابھارا تھا اور وہ اپنی تعلیمی، تجارتی اور

معاشی ترقی، علیٰ ہٰذا دُنیا کے بدلتے ہُوئے حالات کا ساتھ دیتے ہُوئے بڑی تیزی سے جدید معنوں میں ایک 'قوم' بن رہے تھے۔ وُہ کہتے تھے یہ اُن کا مُلک ہے، وُہ اپنے اُصُولِ زِندگی اور اپنے قومی وُجُود کا اِحیا چاہتے ہیں۔ مُختصراً یہ کہ وُہ فی الحقیقت اپنی نشاۃ الثّانیہ کا خواب دیکھ رہے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس مُلک کے باقی عناصر کو یا تو اُن میں ضم ہو جانا چاہیے، یا پھر بہتر ہوگا کہ وُہ اقلیتوں کا درجہ قبُول کر لیں۔ لیکن پھر اقلیتوں سے سمجھوتے نہیں ہُوا کرتے۔ مُسلمانوں کی حیثیت اُن کے نزدیک زیادہ سے زیادہ ایک اقلیت کی تھی۔ لہٰذا مُسلمانوں سے سمجھوتے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تحریکِ ترکِ موالات کی ناکامی اور الغائے خلافت سے مُسلمانوں میں جو بددلی اور خلفشار پھیلا اس سے فائدہ اُٹھاتے ہُوئے اُنھوں نے وطنیت اور قومیت، حتّٰی کہ مُتّحدہ قومیت، مُتّحدہ زبان (ہندی۔ ہندوستانی) اور قومی تعلیم (مثلاً وِدیا مندر سکیم) ایسی تحریکوں پر بالخصُوص زور دینا شرُوع کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ مُسلمانوں کے جُداگانہ مِلّی وُجُود اور تہذیبی مقاصد کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ اِس صُورتِ حالات میں مزید خرابی برطانوی شہنشاہیت نے پیدا کی۔ برطانوی اقتدار محض سیاسی اور معاشی اقتدار نہیں تھا۔ اِس کی ایک تہذیبی رُوح تھی اور اس لیے وُہ اپنے ساتھ کُچھ افکار اور خیالات لے کر آئی تھی۔ اِس کا تقاضا تھا کہ ریاست اور کلیسا کی علیحدگی کے پیشِ نظر مذہب کو سیاست سے کوئی تعلّق نہ رہے۔ اس کا عقیدہ تھا کہ وطنی قومیت مدارِ اِجتماع ہے۔ عالمِ اِسلام کی تباہی کے لیے یہ باتیں بڑی مُفید تھیں۔ برطانوی اربابِ سیاست ایک طرف ہندوستان میں ہندوستانی قومیت، آئینی اور جمہُوری اِدارات، نمائندہ حکُومت، قوم کی رائے اور مرضی کے احترام اور اس کے ساتھ ساتھ

اقلیتوں کے لیے حقوق اور تحفظات کا نام لے لے کر اپنے سیاسی تغلب اور معاشی غصب پر پردہ ڈالنا چاہتے تھے۔ دوسری جانب ان کا کہنا یہ تھا کہ ہم ہندوستان میں تہذیب و تمدن کے مقاصد پیدا کر رہے اور اہلِ ہند کو موقعہ دے رہے ہیں کہ جدید دنیا کے عزائم میں شریک ہو کر ایک متحد اور ترقی پذیر سیاسی ہیئت قائم کریں۔ وہ چاہتے تھے اہلِ ہند متحد تو رہیں لیکن بحد مناسب، نہ اتنے زیادہ کہ ان کے خانی نزاعات ختم ہو جائیں اور برطانوی شہنشاہیت کو ایک مشترکہ سیاسی محاذ کا سامنا کرنا پڑے، نہ اتنے کم کہ اس پر تفرقہ پردازی کا الزام رکھا جائے اور ملک میں فتنہ و فساد پھیلے جس سے خود اس کے سیاسی اور معاشی مفاد کو صدمہ پہنچتا۔ لیکن برطانوی سیاست کاری کا سب سے بڑا اور قابلِ داد کارنامہ یونینسٹ (اتحاد) پارٹی کی تخلیق تھا۔ اسلامی اکثریت کے صوبوں یا دوسرے علاقوں میں شمال مغربی ہندوستان کے مسلمان شہریوں میں سیاسی شعور کے نشوونما اور بلادِ اسلامیہ سے ان کے قرب و اتصال کو دیکھتے ہوئے برطانوی سیاست کاری نے بڑی چالاکی سے یہ سازش کی کہ (غیر منقسم) پنجاب میں سیاسی اقتدار کی باگ ڈور دیہاتی آبادیوں کے ہاتھ میں آ جائے۔ (یہ اس وقت جب صوبہ سرحد کو ابھی آئینی حقوق حاصل نہیں تھے اور سندھ اسلامیہ بمبئی ہی کا ایک حصہ تھا)۔ مقصد یہ تھا کہ برطانوی مفاد کو تقویت پہنچے اور غیر شہری آبادیوں کے ذہن میں یہ خیال جاگزیں ہو جائے کہ برطانوی حکومت کے سوا ان کا کوئی سہارا نہیں۔ یوں مسلمان تجارت، صنعت و حرفت اور ان سب مشاغل سے کٹ کر جو معاشیاتِ حاضرہ کے لیے ریڑھ کی ہڈی کا حکم رکھتے ہیں محض زمین پر قانع ہو گئے اور اہلِ بینش نے حضرت فاروقِ اعظمؓ کے اس قول کی عملی تفسیر

اپنی آنکھوں سے دیکھ لی ہے کہ جو لوگ غلامی اختیار کر لیتے ہیں ذلیل ہو جاتے ہیں محض اس
لیے کہ ان کے دل و دماغ میں زمین کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ زمین سے وابستگی، بلکہ یہ کہنا
چاہیے زمین پرستگی میں وہ اپنے دنیوی مفاد کی خاطر ان مقاصد سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں
جن کا تعلق قوموں کے مستقبل اور تقدیر سے ہے۔ چنانچہ یہی کچھ پنجاب میں بھی ہوا۔
غیر شہری آبادیوں کی ساری تگ و دو یا تو دیہاتی مفاد کا تحفظ تھا، یا اس کے بل بوتے پر
ملازمتوں اور مجالس (وضعِ قانون) میں نشستوں کا حصول۔ وہ ایک عارضی
فائدے اور خوشحالی کے فریب میں بڑے بڑے مقاصد اور مصالح نظر انداز کر رہے
تھے۔ پھر کہنے کو یونینسٹ پارٹی ایک غیر فرقہ وارانہ جماعت تھی، لیکن مسلمانوں کی
حیاتِ ملی کے نشوونما اور باہمی اتحاد میں سب سے بڑی رکاوٹ۔ اس لیے کہ اس کا
ظہور ایک ایسے صوبے میں ہوا تھا جس کی اسلامی اکثریت کو آئینی اور غیر آئینی دونوں
طریقوں سے بآسانی اقلیت میں تبدیل کیا جا سکتا تھا اور جہاں ہر قوم حقوق کے
دعویدار دیہاتی آبادیوں کو خود اپنے مفاد کے لیے ایک نہایت غلط راستے پر ڈال رہے
تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پنجاب سے باہر جب ملک کے دوسرے حصوں میں اکثریت کے
تعصب، یا برطانوی شہنشاہیت کی چیرہ دستی، یا اشتمالی اور اشتراکی خیالات نے
مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی اور انھوں نے محسوس کیا کہ
اس صورتِ حالات کا مقابلہ اسلام ہی کی مدد سے کیا جا سکتا ہے تو پنجاب میں اس
کے خلاف یونینسٹ سیاست کا سارا زور اس پر رہا کہ دیہاتی آبادیوں کی حمایت کا
نام لے کر ایک طرف تو برطانوی شہنشاہیت اور دوسری جانب زمین پر مالکانہ
حقوق کے ساتھ ساتھ زمیندارانہ نظم و نسق کو اور زیادہ مستحکم کرے اور وہ بھی ایک

ایسی شکل میں جیسے زمانۂ بادشاہت نے بھی روا نہیں رکھا تھا اس لیے کہ مسلمان بادشاہوں نے زمینداروں کے مالکانہ حقوق کبھی تسلیم نہیں کیے۔ پھر جب سرحد کو آئینی حقوق ملے یا سندھ ایک الگ تھلگ صوبہ بنا تو یونینسٹ تحریک مضبوطی سے اپنے پاؤں جما چکی تھی، بلکہ اب تو اس نے ایک ملکی تحریک کا خواب دیکھنا بھی شروع کر دیا تھا۔ یہ حالات تھے جن کے باعث نہ تو پنجاب میں کوئی صحیح قیادت ابھر سکی، نہ اس امر کے کوئی آثار تھے کہ اہلِ پنجاب دوسرے صوبوں کے مسلمانوں سے مل کر اسلامی مفاد کی خاطر کوئی متحدہ محاذ قائم کریں گے۔ اس پر طرّہ یہ ہوا کہ دولتِ مغلیہ کے زوال اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ خونیں سے بالخصوص مسلمانوں کو جو ٹھوکر لگی تھی وہ اس سے سنبھلنے نہیں پائے تھے کہ ان کے لیے ایک کے بعد دوسرا فتنہ کھڑا کر دیا گیا —— کبھی اندرونی، کبھی بیرونی —— علی گڑھ کی تحریک ایک سہارا تھی اور اس کے بعد مسلم لیگ ایک دوسرا سہارا، لیکن قوموں کی زندگی سہاروں سے نہیں، کسی قطعی اور واضح نصب العین، اپنے مستقبل کے نہایت واضح تصوّر اور اس کے لیے عزم اور عملی جدوجہد سے قائم رہتی ہے۔ مگر یہ نصب العین، یہ مستقبل کا تصوّر، تھا کہاں کہ اس سے دماغ میں کوئی ولولہ پیدا ہوتا، یا مسلمان کسی سوچے سمجھے ہوئے راستے پر قدم اٹھاتے۔ انھوں نے محکومی پر قناعت کی تھی۔ اس لیے کہ حاکموں نے سرکاری ملازمتوں کی پیشکش اور اس حقیقت کے اعتراف سے کہ ان کی بھی اس ملک میں کوئی حیثیت ہے محکومی کی تلخی کو بہت کچھ کم کر دیا تھا۔ لیکن محکومی آخر محکومی ہے۔ مگر پھر جب ابنائے وطن مطالبہ کر رہے تھے کہ ان کا حکومت میں کچھ دخل ہونا چاہیے، وہ اس ملک میں اقتدار اور آزادی حاصل کریں گے تو مسلمان کیسے خاموش بیٹھ سکتے تھے۔ ضرور تھا کہ وہ بھی

ملّت بالآخر اپنی کوئی حیثیت متعین کرتے۔ لیکن دو باتیں تھیں جن سے مسلمان قریباً قریباً دو مخالف سیاسی جماعتوں میں بٹ گئے۔ جن حضرات کی نظر اس بات پر تھی ـــــ اور یہ بات تھی بھی ٹھیک ـــــ کہ برطانوی شہنشاہیت ہی مسلمانوں کے جملہ مصائب کا سرچشمہ ہے وہ اپنے غم و غصے میں رفتہ رفتہ اس خیال پر جم گئے کہ ہندوؤں کے مطالبۂ آزادی میں بہر حال ان کا ساتھ دیں۔ لیکن وہ نہیں سمجھے تو یہ معمولی سی حقیقت کہ ان کی یہ روش اگر اسلام کی خدمت اور دردمندی پر مبنی ہے تو اس سے نہ تو اس ملک میں اسلام کو تقویت پہنچے گی نہ اس سے باہر۔ ہندوستان تو اس طرح شاید آزاد ہو جائے لیکن مسلمان محکوم رہیں گے اور یہ وہ بات ہے جس پر مسلمان کبھی راضی نہیں ہو سکتے، کیونکہ انھیں غیروں کی محکومی تو گوارا ہو گی لیکن محکوموں کا محکوم بننا انھیں کبھی گوارا نہیں ہو گا۔ دوسری جانب مخالف گروہ یہ سوچتا تھا کہ ہندوستان کی آزادی دراصل ہندو قوم کی آزادی ہے جس میں مسلمانوں کو شاید ہی کوئی باعزت جگہ مل سکے۔ لہٰذا انھیں چاہیے ہر بات سے قطع نظر کرتے ہوئے برطانوی حکومت کا ساتھ دیں اور اس طرح اپنی طاقت اور قوت میں اضافہ کریں تا آنکہ ہندوؤں سے کوئی خطرہ باقی نہ رہے۔ لیکن انھوں نے نہیں سوچا تو یہ کہ آزادی کی اس جدوجہد میں جو ہندو اکثریت نے شروع کر رکھی تھی انگریز کبھی اس سے بگاڑ پیدا نہیں کریں گے، اس لیے کہ آخر آخر ان کا اور ہندوؤں کا مفاد ایک ہے۔ لہٰذا حکومت سے وفاداری کی یہ روش انھیں اور زیادہ ذلیل اور ضعیف کر دے گی۔ یوں بھی وہ ہندوؤں ایسی منظم اکثریت کی جدوجہد کو زیادہ دنوں تک کیسے روک سکتے ہیں۔ پھر اگر یہ سب کچھ اسلام کے نام پر کیا جا رہا ہے تو ان کی اس روش سے عالمِ

اسلام تو کیا، عالمِ اسلام کے ساتھ ساتھ خود اسلام کے اجتماعی اور تہذیبی مقاصد کو بھی سخت صدمہ پہنچے گا۔ لہٰذا اس سے پھر مسلمانوں میں انتشار اور بے دلی پھیلے گی اور ہندوستان میں ذلت و رسوائی کے ساتھ ساتھ ہمسایہ قوموں کی نظر میں بھی ان کا وقار گر جائے گا۔ یہ حالات بڑے یاس انگیز تھے بجائے اس کے کہ مسلمان متحد ہوتے اور اکثریت کے خلاف ایک مشترکہ محاذ قائم کرتے ان کا یہ تنازع ایک بڑی ناگوار صورت اختیار کرتا چلا گیا۔ اس کا کوئی مداوا تھا تو تعلیم یافتہ طبقے کے ہاتھ میں لیکن تعلیم یافتہ مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ ان کے ذہن کو انگریزی تعلیم نے اس طرح بدل دیا تھا کہ اس میں اور اسلامی تصوّراتِ تہذیب و سیاست میں براہِ راست کوئی تعلّق باقی نہیں رہ گیا تھا۔ پھر مغربی تمدّن کے مادّی پس منظر اور اشتراکی اور اشتمالی تحریکوں کے لادین اثرات سے بھی الحاد اور بدعقیدگی کو علانیہ فروغ ہوا اور وہ بھی علی الرغم اسلام، ترقّی کے نام پر خواہ اس کے پیشِ نظر سیاست ہو یا معاش، ادب یا علم و حکمت۔ یوں بھی جن لوگوں کا دل و دماغ عملی تھا اور جو اعلیٰ ملازمتوں ——— فوجی اور مُلکی ——— یا اپنے کاروبار یا سیاسی مشاغل کی بدولت باہر سے ہو آئے اور مغربی اقوام کی زندگی کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کر چکے تھے اُن کا خیال کیا، یقین تھا کہ مسلمانوں کے لیے بھی بجز اس کے کوئی راستہ نہیں کہ چُپ چاپ مغربی طریقِ زندگی پر کاربند ہو جائیں، یعنی جہاں تک سیاست اور اجتماع کا تعلّق ہے دنیوی (سیکولر) اور وطنی نقطۂ نظر اختیار کر لیں۔ اسلام ہمیشہ "غریب" رہا ہے۔ ارشادِ نبوی ہے "بدأ الإسلام غریباً و سیعود غریباً" لیکن عالمِ اسلام کے سیاسی اور دینی انحطاط اور بالخصوص دو صدیوں کی غلامی سے مسلمانوں

کا دل اس حد تک ٹوٹ چکا تھا کہ ان کے لیے اسلام کی یہ غریبی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ عقیدۃً وہ ضرور اس کے قائل تھے اور اس امر سے بھی انکار نہیں کر سکتے تھے کہ اہلِ دانش اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ مگر پھر راویوں کی ثقاہت کے باوجود ان کے نزدیک اس کی حیثیت ایک حدیثِ ضعیف کی تھی۔ بہر حال جہاں تک زندگی کی حقیقی واردات اور مشاہدات کا تعلق ہے وہ اس سے بیگانہ ہو چکے تھے۔ یہ سب باتیں حضرتِ علامہ کے سامنے تھیں اور ان کے ساتھ ساتھ وہ تمام احوال و شئون بھی جو تحریکِ ترکِ موالات کی ناکامی سے لے کر پہلی گول میز کانفرنس کے انعقاد تک پیش آ چکے تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ گول میز کانفرنس میں ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں اور بالخصوص مسلمان اربابِ سیاست کا طرزِ عمل کیا ہے۔ وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہیں تھے کہ بحیثیت ایک قوم مسلمان کیا باعتبارِ سیاست اور کیا باعتبارِ تہذیب و تمدن بڑی بے بصری کا شکار ہو رہے ہیں پھر اربابِ سیاست ہوں یا اربابِ علم و ہنر کسی کی نگاہیں اسلامی حقائق پر نہیں۔ علما کا ذہن بھی قرآن امور میں صاف اور واضح نہیں تھا۔ لہٰذا وہ الٰہ آباد سے واپس آئے تو شمالی مغربی ہندوستان یعنی اسلامی اکثریت کے صوبوں کی مسلمان آبادیوں کے لیے ایک ایسی مشترکہ سیاسی جماعت کا تصور دے کر جس سے صوبائی امتیازات یک قلم ختم ہو جائیں اور مسلمان ایک الگ تھلگ ایک قوم کی حیثیت سے اپنا سیاسی موقف متعین کریں چنانچہ لاہور پہنچ کر انھوں نے آل انڈیا کانفرنس کے انعقاد کا مصمم ارادہ کر لیا، بلکہ ایک خطبہ (ایڈریس) بھی لکھنا شروع کر دیا تھا جو شاید بعد میں تلف کر دیا گیا۔ لیکن یہ کانفرنس کبھی منعقد نہیں ہو سکی۔ حالانکہ اکتوبر

۱۹۳۲ میں جب مَیں ان کی خدمت میں حاضر ہُوا تو اس وقت بھی وُہ اپنے اسی خیال پر قائم تھے بلکہ میرے استفسارات پر ارشاد فرمایا "انتظار کرو تمہیں عنقریب معلُوم ہو جائے گا، مَیں کیا کہنا چاہتا ہُوں"۔ یہ اشارا تھا اس امر کی طرف کہ خطبہ لکھا جا رہا ہے۔ لیکن یہاں ایک سوال پَیدا ہوتا ہے کہ اس کانفرنس کے انعقاد سے حضرتِ علامہ کا مقصد کیا تھا؟ اس لیے کہ اُصُولی اَور عملی دونوں پہلوؤں سے وُہ لیگ کی توجّہ اس امر کی طرف مُنعطف کرا چکے تھے کہ شمالی مغربی ہندوستان میں ایک اسلامی ریاست کا مطالبہ آزادیِ ہندوستان کے عَین مطابق ہے۔ لہٰذا اب ایک نئی کانفرنس کے انعقاد کی ضرُورت کیوں پیش آئی؟ ثانیاً اگر یہ کانفرنس اَیسی ہی ضرُوری تھی تو مُنعقد کیوں نہ ہو سکی؟ جہاں تک پہلی بات کا تعلّق ہے اس سلسلے میں راقم الحرُوف کی گزارش یہ ہَے کہ حضرتِ علّامہ سے بڑھ کر کسے معلُوم تھا کہ مُسلمانوں کی حیاتِ ملّی میں ایک بہت بڑا خلا پَیدا ہو چکا ہَے، لہٰذا ضرُوری ہَے کہ ان کا ایک سیاسی اَور اجتماعی موقف مُتعیّن کیا جائے۔ بغیر اس کے ناممکن تھا کہ ان کے اندر پھر سے زندگی کی رُوح عَود کرے۔ یُوں بھی ایک اَیسی اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ جو بلادِ اسلامیہ سے مُتّصل ہو اگر کہیں امکان تھا تو شمال مغربی ہندوستان میں اَور اس لیے ضرُوری تھا کہ اسی علاقے کے باشندوں کو ذہناً اس کے لیے تیار کیا جائے۔ لہٰذا وُہ سب سے پہلے شمال مغربی ہندوستان ہی کو اپنا مخاطب بنا سکتے تھے۔ وُہ چاہتے تھے اوّل اس خطّے کے مُسلمانوں کو برطانوی سیاست اَور ہندو اکثریت کے منصُوبوں سے خبردار کریں اَور پھر بتائیں کہ ان کی دینی حمیّت اَور ملّی عصبیّت کا تقاضا کیا ہے۔ علیٰ ہٰذا یہ کہ بحیثیتِ ایک قوم سیاسی اجتماعی اعتبار سے بھی ان کا مستقبل کیسا روشن

ہے۔ وہ مستقبل — یا اُن کے اپنے الفاظ میں از رُوئے اِسلام مسلمانوں کی تقدیر — ہندوستان کی آزادی جو ایک دوسرے پہلو سے واحد حل تھا اور اس کے حصول میں مسلمان شریک ہو سکتے تھے تو بحیثیت ایک قوم کے۔ لیکن یہ وہ بات ہے جسے نہ ہندو ماننے کے لیے تیار تھے نہ انگریز۔ لیکن پھر اس کے علاوہ کہ مسلمان ایک قوم ہیں مسلمانوں کا موقف اور کیا ہو سکتا تھا۔ یہی وہ چیز تھی جو حکومتِ برطانیہ کو اس امر پر مجبور کر سکتی تھی کہ ہندو اکثریت سے سمجھوتے کی صورت میں مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی ہستی کو نظر انداز نہ کریں اور یہی وہ بنا تھی جس پر ہندوؤں سے باعزت مفاہمت کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی تھی۔ لہٰذا حضرتِ علامہ بجا طور پر مُصِر تھے کہ جب تک مسلمانوں کا الگ تھلگ اور جداگانہ قومی وجود تسلیم نہیں کیا جاتا ہندوستان کی سیاسی گتھی اُلجھتی ہی چلی جائے گی، بلکہ ان کا یہ ارشاد بھی تو نہایت درست تھا کہ جدید سیاسی تصورات کا لحاظ رکھا جائے تو مسلمانوں ہی کو درا صل اس ملک میں ایک قوم کا درجہ حاصل ہے۔ ہندو بے شک ایک قوم بننا چاہتے ہیں، لیکن ابھی تک بن نہیں سکے۔ اب واقعہ بہرحال کچھ بھی ہو یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی سمجھوتہ ہو سکتا تھا تو برابری ہی کی بنا پر۔ جب تک مسلمان اقلیت بنے رہتے اکثریت سے کوئی سمجھوتہ ممکن نہ تھا۔ اقلیتوں کو رعایتیں ملا کرتی ہیں، تحفظات دیے جاتے ہیں، اُن سے تصفیۂ حقوق نہیں ہوتا۔ لہٰذا بحیثیت ایک اقلیت مسلمانوں کی مذہبی آزادی یا شخصی قوانین کے تحفظ یا تہذیب و تمدن میں خود اختیاری کے کوئی معنی ہی نہیں تھے۔ اِسلام تو بجائے خود ایک ریاست، ایک تہذیب، ایک معاشرہ اور اس لیے ایک ہیئتِ سیاسیہ اور اجتماعیہ ہے۔ یہ ہیئت برقرار رہے تو اِسلامی تہذیب و تمدن کو بھی فروغ ہوگا اور اسلامی ثقافت (کلچر) کے تحفظ کا پہلو بھی نکل آئے گا۔ مسلمان کوئی مذہبی جماعت نہیں

تھے کہ اقلیت کے منصب پر قانع ہو جاتے۔ ان کی آبادی، ان کے ماضی، ان کی تعداد اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے دین اور شریعت کا تقاضا تھا کہ وہ اپنے ملی وجود کے تحفظ، اپنی جداگانہ قومیت پر اصرار اور اپنی تہذیب و تمدن کو برقرار رکھنے کے لیے ایک متحدہ محاذ قائم کرتے۔ یہ محاذ اسلام ہی کی بنا پر قائم کیا جا سکتا تھا جس سے اکثریت اور اقلیت کے صوبوں میں کسی اختلافِ رائے کی گنجائش رہتی نہ یہ خوف کہ اسلامی اقلیت کے صوبے اکثریت کی چیرہ دستی کے شکار ہو جائیں گے۔ شمال مغربی ہندوستان میں اس کانفرنس کا انعقاد یوں بھی ضروری تھا کہ یہیں ان تحریکوں نے سر اٹھایا تھا جو دانستہ یا نادانستہ اسلام کے جسدِ ملی کو مجروح کر رہی تھیں۔ دوسرے صوبوں مثلاً بنگال میں ایسا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ لیکن پھر ایک دفعہ جب اس شعور کو تقویت پہنچتی کہ مسلمان ایک قوم ہیں، لہٰذا ان کا ایک سیاسی موقف اور سیاسی مستقبل ہے، علیٰ ہٰذا ایک تہذیبی مطمحِ نظر تو اس کے اثرات سارے ملک میں پھیل سکتے تھے۔ رہی یہ بات کہ اس کانفرنس کا انعقاد کیوں نہ ہو سکا سو اس کی سب سے بڑی وجہ تو گول میز کانفرنس کا انعقاد تھا، جن میں خود حضرتِ علامہ کو بھی شریک ہونا پڑا۔ یہ کہنا کہ اس کانفرنس کی ناکامی میں بعض افراد کا بھی ہاتھ ہے غلط ہوگا، کیونکہ حضرتِ علامہ کسی فرد یا جماعت کے چکر میں نہیں آئے، خواہ اس فرد یا جماعت کے عزائم کچھ بھی ہوں۔ گول میز کانفرنس کی کاروائی اور اس کے نتائج کا انتظار بہرکیف ضروری تھا اور اس طرح حضرتِ علامہ کے ارادوں میں کوئی تزلزل پیدا نہیں ہوا لیکن جب صورتِ حالات یہ تھی کہ ہر شخص کی آنکھیں لندن پر لگی تھیں اور اربابِ سیاست لندن ہی کی گفتگوؤں کے پیشِ نظر اپنا موقف طے کر رہے تھے نہ کہ بحیثیت ایک تحریک، ایک اجتماعِ ملی، ایک حیثیتِ سیاسی اور ایک

عالمگیر تہذیبِ اسلام کی بنا پر تو اس کانفرنس کا انعقاد کیسے عمل میں آتا۔ عملی اور ذہنی دونوں اعتبار سے حالات اس کے مساعد نہیں تھے۔ پھر جب ۱۹۳۳ میں گول میز کانفرنس سے واپسی پر کچھ سفر کی کلفت اور کچھ اس وقت کے مخصوص احوال کے پیشِ نظر حضرتِ علامہ نے یہی بہتر سمجھا کہ اپنے اس ارادے کو چند دن اور ملتوی رکھیں حتیٰ کہ ۱۹۳۴ کے آغاز میں حضرتِ علامہ خود ہی بیمار ہو گئے اور یہ کانفرنس رہ گئی۔

"شیخ صاحب" کا اشارہ شیخ غلام صابر کی طرف ہے جن کی مخلصانہ میزبانی کا حضرتِ علامہ پر بڑا اثر تھا۔

خطبہ الٰہ آباد کا ترجمہ رسالہ صوفی پنڈی بہاؤالدین کے اصرار پر کیا گیا تھا باوجود کم فرصتی اور پریشانی کے۔ پنجاب، سرحد اور سندھ کے بعض دور دراز حصوں میں اسلامی ریاست کے اس نئے تخیل نے بڑا جوش اور ہیجان پیدا کر دیا تھا۔

ترجمے کی اشاعت کے متعلق جامعہ کی تجاویز حضرتِ علامہ کی خدمت میں پہنچا دی گئی اور خطبہ الٰہ آباد کے ترجمہ کی ایک نقل بھی۔ یہ ترجمہ رسالہ صوفی کے زیرِ اہتمام چھپا اور ہزاروں کی تعداد میں مفت تقسیم کیا گیا۔

کوئی دو ہفتے کے بعد حضرتِ علامہ کا گرامی نامہ موصول ہوا:

لاہور ۷ مئی ۱۹۳۱

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

میں آپ کو آج خط لکھنے ہی والا تھا کہ آپ کا خط پہنچا۔ آپ کے بھائی کی علالت کا افسوس ہے۔ خدا تعالیٰ اُسے صحت مرحمت فرمائے۔ کتاب کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے درست ہے۔ میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔ غالباً میں نے بھی آپ کو اس

سے پہلے یہی لکھا تھا کہ کتابت' طباعت' کاغذ' کمیشن وغیرہ منہا کر کے باقی روپیہ ادا کر دیا جائے (البتہ یہ ضروری ہے (۱) کہ پہلے سے یہ بتایا جائے کہ خرچ کُل کس قدر ہوگا؟ (۲) کیا مَیں نے جو کمیشن لکھی تھی وہ انہیں منظور ہے؟ (۳) کتاب کے تیار ہو جانے پر روپیہ پیشگی ادا کرنا ہوگا۔ ان تمام اُمور سے آگاہی کی جائے نیز یہ بھی لکھیں کہ جامعہ کی طرف سے یہ مُعاہدہ کون کرے گا تاکہ یہ تمام خط[۳] انہیں صاحب سے ہو۔ مَیں پرسوں بھوپال جا رہا ہوں۔ دو چار روز وہاں قیام رہے گا۔ اگر قومی سرمایہ مُسلمان جمع کر سکیں تو میرا یہ اندازہ ہے کہ مُسلمانوں میں ہندوؤں کی نسبت زیادہ مادۂ قربانی اور اپنے حقُوق کے لیے ایجی ٹیشن کرنے کی جرأت و ہمّت موجود ہے۔ والسّلام

محمد اقبال لاہور

حضرتِ علّامہ بھوپال جا رہے تھے اور تقریب وہی سیاسی گفت و شُنید۔ مُسلمانوں کے لیے یہ زمانہ واقعی ایسا تھا کہ انھیں اپنے حقُوق یا دُوسرے لفظوں میں ملّی تحفّظ کے لیے مِل کر آواز اُٹھانی اور قدمے' درمے' سخنے کسی قُربانی سے دریغ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ حضرتِ علّامہ کی اس رائے سے بھی شاید کسی کو اختلاف نہیں ہوگا کہ مُسلمانوں میں ہندوؤں کی نسبت قُربانی کا مادہ بہت زیادہ ہے' لیکن سوال یہ ہے کہ مُسلمانوں کی اس خُوبی سے فائدہ کِس نے اُٹھایا ہے۔

میرے عزیز بھائی کی علالت اب ایسی تشویش انگیز شکل اختیار کر چکی تھی کہ مَیں نے حضرتِ علّامہ کے گرامی نامہ کا جواب تک عرض نہ کیا۔ لہٰذا اُنھوں نے کچھ روز انتظار

---

(۳) کتابت کا لفظ رہ گیا۔

کیا اور پھر ارشاد ہُوا :۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلامُ علیکم۔

آپ نے میرے خط کا جواب نہیں دیا۔ چُونکہ کتاب کے مُتعلق بہت لوگ استفسار کر رہے ہیں۔ اِس واسطے ضرُوری ہے کہ اس کی اشاعت میں جلدی کی جائے۔ آپ مہربانی کر کے مُجھے جلد لکھیں کہ جامعہ والے کیا چاہتے ہیں۔ وہ مسوّدہ مُجھے بھیج دیں تاکہ مَیں اسے لکھوانے کا انتظام کرُوں۔

محمد اقبال ۲۰ مئی ۱۹۳۱

لاہور

لوگ بے شک ترجمہ کی اشاعت کے منتظر تھے لیکن مُجھے ایسا نظر آرہا تھا جیسے اس کا سلسلہ چند دنوں کے لیے قطعی طور پر روک دینا پڑے گا۔ چنانچہ مَیں حضرتِ علامہ سے اپنی اس معذوری کا اظہار بھی کر چکا تھا۔ لہٰذا دُوسری ہی ڈاک سے اِسی تاریخ کا لکھا ہُوا ایک اور والا نامہ موصُول ہو گیا :۔

لاہور ۲۰ مئی ۱۹۳۱

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلامُ علیکم۔

آپ کا خط کل شام ملا۔ آپ کے بھائی کی علالت کی خبر سے مُتردِّد ہُوں۔ خُدا تعالٰے اس کو صحتِ عاجل کرامت فرمائے۔ مَیں انشاءَ اللہ ان کے لیے ضرُور دُعا کرُوں گا۔

کتاب کے بارے میں یہ عرض ہے کہ اگر آپ رُخصتوں میں لاہور آئیں تو کتاب ساتھ لیتے آئیں یا پہلے یہاں بھیج دیں اگر اس پر نظرِ ثانی آپ کی موجُودگی میں ہو تو بہتر ہوگا۔ مع جلد قیمت تین روپے میرے خیال میں کم ہے مگر اس معاملہ میں کُچھ رائے

نہیں دے سکتا۔

مینجر صاحب مکتبہ سے آپ کہیں کہ وہ کُل معاملات کے متعلق مجھ سے خط و کتابت کریں۔ اخراجات کا صحیح اندازہ کیا ہوگا؟ کاغذ کس قسم کا ہوگا؟ جلد کیسی ہوگی؟ کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ کتاب بغیر جلد فروخت کی جائے؟ یہ سب سوالات ہیں جن پر غور کرنا ہے۔ باقی رہا اقساط کا معاملہ سو اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ میں دو اقساط میں روپیہ لوں گا۔ بشرطیکہ دو اقساط کی درمیانی مدت تین ماہ سے زائد نہ ہو۔ کمیشن بیس فی صدی ادا کر دی جائے گی۔ مینجر مکتبہ مفصل خط مجھ کو لکھ دیں کہ ان کی رائے مذکورہ بالا امور کے متعلق کیا ہے۔[۳] والسلام

محمد اقبال لاہور

لیکن میں نے اس گرامی نامہ کا جواب عرض کیا تو اُدھر وطن سے جہاں حسبِ ہدایت حکیم محمد احمد خاں مرحوم ہم سب منتقل ہو چکے تھے، مگر پھر ہُوا یہ کہ حکیم صاحب تو یورپ تشریف لے گئے اور مجھے اپنے عزیز بھائی کے علاج معالجے کے لیے دوسری تدابیر اختیار کرنا پڑیں۔ چنانچہ میرے لیے یہ زمانہ بڑی تشویش، بڑی اذیت قلبی اور پریشانیوں کا تھا۔ طبیعت کو کسی طرح سکون نہیں ہوتا تھا۔ ترجمے کا سلسلہ کب سے چھوٹ گیا تھا۔

---

۳۔ ناشرین کا نقطۂ نظر سراسر کاروباری ہوتا ہے جس سے اگر مؤلفین کو اتفاق نہ ہو تو دونوں کے مفاد میں لازماً تصادم پیدا ہوگا اور ناشرین دانستہ یا نادانستہ مصنفین کا مفاد نظر انداز کر دیں گے۔ یہ خیال تھا جس نے حضرت علامہ کو اس بارے میں بڑا محتاط کر دیا تھا۔ ان کے علمی مشاغل کا تقاضا بھی یہی تھا اور پھر اس سلسلے میں وہ بعض تلخ حقائق کا تجربہ بھی کر چکے تھے۔

میں نے بادلِ نخواستہ اس صورتِ حالات کی اطلاع حضرت علامہ کو دی تو فرمایا:

۱۵ جولائی ۱۹۳۱ء

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ آپ کے بھائی کی علالت کا حال معلوم کر کے متردد ہوا۔ خدا تعالیٰ ان پر فضل کرے اور اطمینانِ قلب عطا کرے۔ ان حالات میں اگر خطبات کی اشاعت میں تعویق ہو جائے تو مضائقہ نہیں ہے۔ والسلام

محمد اقبال

عزیزی شبیر کا مرض روز بروز خطرناک صورت اختیار کر رہا تھا حتیٰ کہ اس کی صحت سے مایوسی ہونے لگی۔ بالآخر ۴ اگست سہ پہر کو چار بجے کے قریب اس معصوم نے جس کا سن ابھی سترہ برس کا بھی نہیں تھا داعیِ اجل کو لبیک کہی۔ اگلے روز صبح اس کی میت لیے ہوئے ہم نے دہلی کا رُخ کیا اور بعد نمازِ مغرب جامعہ کے قریب بچشمِ نم سپردِ خاک کر دیا۔ سولہ سترہ برس کے ایک ذہین اور ہونہار بچے کی مفارقت کا صدمہ بڑا شدید اور ناقابلِ برداشت تھا، بالخصوص والدِ ماجد کے لیے کہ جس روز یہ حادثۂ جانکاہ پیش آیا اُنھوں نے اپنے دیرینہ دوست حکیم حافظ نعمت اللہ صاحب سے جو ڈاکٹروں کے ساتھ شبیر مرحوم کے علاج میں شریک تھے صاف صاف کہہ دیا کہ اب میری زندگی محال ہے۔ وہ حافظِ قرآن تھے اور معمولاً آخرِ شب ہی میں بیدار ہو جاتے۔ پھر نوافل اور فجر کے بعد تلاوت سے فارغ ہو کر سو جاتے لیکن اب سونے کا تو ذکر ہی کیا ہے، رات بھی بے چینی میں بسر ہوتی۔ قبرستان قریب ہی تھا۔ وہ فجر ادا کرتے ہی اس کا رُخ کرتے اور دیر تک مرحوم بیٹے کے سنگِ تربت سے لگے قرآنِ پاک کی تلاوت کرتے۔ ہم لوگ سائے کی طرح ساتھ رہتے۔ بار بار جا کر دیکھتے کب دُعاؤں سے فارغ ہوتے ہیں۔ کب مگر

واپس آتے ہیں۔ سعدی کا یہ شعر

نمی دانم حدیث نامہ چون است
ہمی دانم کہ عنوانش بخون است

اکثر اُن کی زبان پر ہوتا۔

مَیں نے حضرتِ علامہ کو اس حادثۂ الیمہ کی باطلاع کی تو دُوسرے ہی روز تعزیت کرتے ہُوئے فرمایا:

۷ اگست ۱۹۳۱ء

ڈیئر نیازی صاحب۔ السّلامُ علیکم۔

آپ کا خط و دو منٹ ہُوئے ملا جس کو پڑھ کر مجھے بہت قلق ہُوا۔ خدا تعالیٰ آپ کے مرحوم بھائی کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور آپ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ اپنے والد ماجد اور والدہ کی خدمت میں میری طرف سے ماتم پُرسی کیجیے اور عرض کیجیے کہ ایک مُسلمان کے لیے رضائے الٰہی ہی ہر شے پر مقدم ہے اور صبر مُسلمان کے لیے سب سے بڑی سعادت ہے۔

مَیں اگست کے آخری ہفتوں میں باہر جاؤں گا۔ اس وقت تک لاہور ہی رہوں گا۔ والسّلام۔

مخلص محمد اقبال

یہ لندن جانا دُوسری گول میز کانفرنس کے سلسلے میں تھا۔ مَیں نے حضرت علامہ کی ہمدردی اور دلسوزی کا شکریہ ادا کرتے ہُوئے دُعائے خیر کی درخواست کی اور ساتھ ہی ساتھ

حیاتِ بعد الممات کے بارے میں کچھ استفسارات بھی کیے۔ جواب میں ارشاد ہوا :۔

۱۹ اگست ۱۹۳۱

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

میں غالباً یکم ستمبر کی شام کو یہاں سے روانہ ہوں گا اور ۵ ستمبر کو بمبئی سے۔ ممالکِ اسلامیہ کی سیاحت کی بڑی آرزو ہے مگر یہ سب کچھ روپیہ پر منحصر ہے۔ خطبات کے ترجمے کی اشاعت کا انتظام ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ امید ہے دسمبر کے آخر تک واپس آجاؤں گا۔ جاوید نامہ ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ کل اس کی کتابت ختم ہو گی۔ غالباً اکتوبر کے آخر میں شائع ہو جائے گا۔

حیاتِ بعد الممات کے متعلق جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کو دوبارہ غور سے پڑھیے۔ آپ کے سوال کا جواب مل جائے گا۔ میرے نزدیک حیات بعد الممات انسانی کوشش اور فضلِ الٰہی پر منحصر ہے۔ بچوں کے لیے بہشت زیادہ آسان ہے کیونکہ بہشت کا مفہوم ہے ایک نئے time-system کے ساتھ adjust کرنے کا۔ بچوں کے لیے یہ زیادہ آسان ہے کیونکہ ہمارا time-system ان کی فطرت میں پورے طور پر راسخ نہیں ہوتا۔ Ego کا نہایت گہرا تعلق time-system سے ہے۔

مرنے والوں سے اس زندگی میں اتحاد ممکن ہے، بعینہٖ اسی طرح جس طرح ہم آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ مگر یہ اتحاد زیادہ تر کامل انسانوں سے ہوتا ہے کیونکہ Ego کی زندگی بعد از موت یقینی ہے۔ اس لحاظ سے وہ گزشتہ تجربات کا اعادہ کر سکتے ہیں۔ وہاں سے پیار محال ہے خواہ وہ بعد از مرگ زندہ بھی ہوں۔ بہشت آنیہ

Biological Phenomenon ہے۔ اس میں انسانی کوشش کو بھی ایک حد تک دخل ہے۔ اس کو انسانی achievement بھی کہہ سکتے ہیں۔ ابدی موت اور زندگی خاص قسم کے اعمال سے متعین ہوتی ہے۔ میرے نزدیک اگر کوئی شخص ابدی موت کا خواہشمند ہو تو وہ اُسے حاصل کر سکتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس دوزخ اور جنت بھی زندگی کے phenomenea ہیں۔ اور ان کے character کی تعیین اسی مرحلہ پر منحصر ہے جو زندہ شے نے حاصل کیا ہو۔ اس زندہ شے کے لیے دوزخ اور جنت ہے۔ یہاں تک کہ پودوں اور حیوانوں کے لیے بھی۔ مگر اس دوزخ اور جنت کے character کی تعیین animal life اور plant life کے اسٹیج پر منحصر ہے۔ یہی حال بچوں کی زندگی کا ہے۔ زندگی کے مدارج بے شمار ہیں۔ اس ضمن میں بہشت سے اُمور عقلِ انسانی سے باہر ہیں۔ ان کے متعلق بصیرت و ایمان اور وجدان سے پیدا ہوتا ہے۔ ان مدارج کا تعلق فلسفہ سے نہیں ہے ۵۔ والسلام۔

محمد اقبال

خطبات کا ترجمہ جو علالت سے ملتوی ہو چکا تھا ——— آخری تہائی حصے کا ——— اور اس کی مکمل ابتدا کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ جاوید نامہ اکتوبر کی بجائے اگلے برس ۱۹۳۲ میں

---

۵۔ اس مکتوب میں جتنے انگریزی لفظ آئے ہیں۔ ان کے معنی علی الترتیب یہ ہیں:۔

نظامِ زمانی  توافق  نظامِ زمانی  خودی

نظامِ زمانی  خودی  مظہرِ حیات  کامرانی

مظاہر  نوعیت  نوعیت  حیوانی زندگی  نباتی زندگی

شائع ہوا۔ اب انتظار تھا کہ حضرتِ علامہ سفرِ لندن کے سلسلے میں کب دہلی تشریف لاتے ہیں۔ بالآخر یہ اطلاع موصول ہوئی:۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

مَیں ۳۱ اگست کی شام کو یہاں سے روانہ ہوں گا۔ یہ گاڑی صبح دہلی پہنچتی ہے۔ اُمید ہے کہ اسٹیشن پر آپ سے ملاقات ہوگی۔ آپ کے والدِ ماجد کا خط آیا تھا۔ مَیں عدیم الفرصتی کی وجہ سے جواب نہ لکھ سکا۔ وُہ قرآن کے حافظ ہیں۔ کثرتِ تلاوت سے انشاءاللہ سکونِ قلب حاصل ہوگا۔ یہ نسخہ مجرب ہے۔ والسلام۔

محمد اقبال لاہور

۲۷ اگست ۱۹۳۱

اس اثنا میں والدِ ماجد بھی ایک خط لکھ چکے تھے۔ مجھے شب و روز حضرتِ علامہ کی آمد کا انتظار تھا۔ بالآخر ارشاد ہوا:

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

مَیں نے ایک کارڈ آپ کو پرسوں لکھا تھا کہ ۳۱ اگست کو یہاں سے روانہ ہوں گا مگر افسوس ہے کہ اس تاریخ کو یہاں سے بعض وُجوہ سے ممکن نہیں۔ لہٰذا اطلاعاً گزارش ہے کہ مَیں یکم ستمبر کو فرنٹیئر میل سے شام کے بعد سوار ہوں گا۔ ۲ ستمبر کو صبح دہلی پہنچوں گا۔ والسلام۔

محمد اقبال لاہور

۲۹ اگست ۱۹۳۱

'بوُجوہ' کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔ ۲ ستمبر کو مَیں ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ لیکن حضرتِ

علامہ تشریف نہیں لائے۔ اس سے کچھ پریشانی ہوئی۔ میں نے خیریتِ مزاج دریافت کی تو معلوم ہوا حضرتِ علامہ کو بخار آگیا تھا، جیسا کہ ۴ ستمبر کے مکتوب نامے میں مرقوم ہے:۔

ڈیئر نیازی صاحب۔

۵ ستمبر کو نہ جا سکوں گا۔ بیگم کو لاہور سے چلنے والا تھا مگر روانگی سے دو گھنٹے قبل بخار ہوگیا۔ اب ۸ ستمبر کی شام کو فرنٹیر میل سے انشاءاللہ لاہور سے روانگی ہے۔ والسلام۔

محمد اقبال

۹ ستمبر کی صبح کو حضرتِ علامہ دہلی پہنچے۔ نیاز مندوں کی خاصی تعداد ریلوے اسٹیشن پر موجود تھی۔ علی بخش اس سفر میں دہلی تک ساتھ رہا۔ اور اگر میں بھولتا نہیں تو جاوید بھی۔ وقت اگرچہ کم تھا اور حضرتِ علامہ کے چہرے سے نقاہت کے خفیف سے آثار نمایاں تھے۔ یہ سفر کی کلفت تھی یا بخار کا اثر؟ شاید دونوں کا۔ پھر بھی وہ بڑی خندہ پیشانی اور خوش دلی سے سفرِ لندن کی گفتگو کرتے رہے۔ "کوپے" میں نیاز مندوں کا ہجوم تھا۔ کچھ کھڑکیوں میں سر ڈالے پلیٹ فارم پر کھڑے تھے۔ گو کوشش یہی تھی کہ حضرتِ علامہ کو حتی الوسع کوئی زحمت نہ ہو۔ مہر صاحب[۶] کی معیت اس سفر میں بڑی غنیمت معلوم ہوتی تھی۔ حضرتِ علامہ کی طبیعت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ سفر و حضر میں کوئی مخلص نیاز مند ان کے ساتھ رہے۔ بہرحال وہ لندن جا رہے تھے۔ بلادِ اسلامیہ کی سیاحت کا خیال تھا

---

۶۔ جناب غلام رسول صاحب مہر مدیر "انقلاب" لاہور۔

مؤتمرِ اسلامیہ (بیت المقدس) میں شرکت کا عزم اور ایک اور آرزو جو پوری تو نہیں ہوئی مگر جس کا اظہار ذوق و شوق ایسی نظم میں آگے چل کر ہوا ہے

دریغ آمدن زاں ہمہ بوستاں
تہی دست رفتن سوئے دوستاں

یعنی زیارتِ حرمِ پاک اور روضۂ رسول صلعم میں حاضری کی تمنّا۔

## مکتوب ۲۰:

ایک عجیب بات یہ ہے کہ اب جو ان مکتوبات کو دیکھتا ہوں تو ۲۹ اگست کے کارڈ پر میرے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ شعر مرقوم ہے:

آں سفر کردہ کہ صد قافلہ دل ہمرہِ اوست
ہر کجا ہست خدایا بسلامت باشد

در تقریب اس کی یہ کہ اس سے چند روز پہلے ایک دن باتوں باتوں میں فاکر صاحب نے پوچھا ڈاکٹر صاحب کی صحت کیسی ہے، عمر کیا ہوگی۔ بظاہر ان سوالات میں کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن پھر اس خیال سے کہ قوم کو اس وجودِ گرامی کی کس قدر ضرورت ہے حضرتِ علامہ کی ناسازیِ مزاج کی اطلاع سے طبیعت کچھ متردد سی ہو گئی۔ لہٰذا جب وہ صحت یاب ہو کر انھوں نے لندن کا عزم کیا تو یہ شعر بے اختیار زبانِ قلم پر آ گیا۔

یہ بات ہے تو بڑی قبل از وقت گو اسے کہنا ہی پڑتا ہے کیونکہ اس وقت کسے معلوم تھا کہ دو ہی برس میں حضرتِ علامہ اس مرض کا شکار ہو جائیں گے جس سے باوجود

طرح طرح کے معالجوں کے ان کو صحت نہ ہوئی۔ بات یہ ہے کہ حضرتِ علامہ اپنی صحت سے بالکل بے پرواہ تھے۔ حالانکہ گلے کی تکلیف تو انھیں بہت پرانی تھی۔ ۔ ۔ وہ اکثر بڑے زور زور سے اپنا گلا کھنکارتے تھے ـــــ اور پھر نزلہ و زکام کی شکایت بھی انھیں اکثر ہو جاتی۔ نقرس کا عارضہ بھی پرانا تھا۔ بظاہر یہ شکایات معمولی تھیں لیکن اس موقعہ پر ایک آدھ روز کے بخار سے صحت یاب ہو کر جب وہ لندن جاتے ہوئے دہلی سے گزرے تو ان کا چہرہ بہت زیادہ اُترا ہوا تھا اور آواز سے بھی ایک حد تک ضعف و اضمحلال کا اظہار ہوتا تھا۔ غالباً یہی علامات تھیں جن سے متاثر ہو کر ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے سوال کیا کہ حضرتِ علامہ کی صحت کیسی ہے، مگر کیا ہے اور پھر میں نے اگرچہ اپنی دانست میں اس کا نہایت مناسب جواب دیا لیکن تھوڑی دیر کے لیے بڑا پریشان بلکہ متردد ہو گیا۔

○

# ۱۹۳۲

سفرِ دہلی

انشورنس

جاوید نامہ

تبادلۂ آبادیات

کیا مذہب کا امکان ہے؟

پھر لندن

۳۰ دسمبر ۱۹۳۱ کو حضرتِ علامہ مصر و شام اور ارضِ قدس سے ہوتے ہوئے مراجعت فرمائے دہلی ہوئے۔ لیکن ہندی و اسلامی سیاست کا عقدۂ لاینحل انھیں تھوڑے ہی دنوں میں دہلی کھینچ لایا۔ چنانچہ ۷ جنوری کا مکرمت نامہ ہے:

لاہور ۷ جنوری ۱۹۳۲

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ کا کارڈ ابھی ملا۔ الحمد للہ کہ خیریت ہے۔

میں کل شام دہلی آرہا ہوں۔ ۸ جنوری کی صبح کو آٹھ بجے دہلی پہنچوں گا اور
اسٹیشن پر ہی ٹھہروں گا۔ اسی شام یعنی ۸ کی شام کو ہی واپس آنا ہوگا۔ آپ ۱۲ بجے
دوپہر کے بعد یا اس خط کے ملنے کے بعد مجھ سے اسٹیشن پر ملیں۔ کتاب کے متعلق
گفتگو ہو جائے گی۔ والسلام۔

محمد اقبال۔ لاہور

حسبِ ہدایت میں اسٹیشن پہنچا۔ اور شام تک حضرتِ علامہ کی خدمت میں حاضر رہا۔ خطبات کا ترجمہ پچھلے برس سے رُکا پڑا تھا۔ موافقتِ حالات پر میں نے اپنی پریشانیوں، والدِ ماجد کی علالت اور بعض دوسرے موانع کا عذر پیش کیا۔ حضرتِ علامہ نے بڑی ہمدردی کا اظہار فرمایا۔ میں نے عرض کیا ترجمے کی ابتدا کر رہا ہوں، اُمید ہے دو چار مہینوں میں تکمیل ہو جائے گی۔ حضرتِ علامہ کا اطمینان ہو گیا اور وہ اُسی شام لاہور واپس تشریف لے گئے۔

میرے لیے یہ زمانہ بڑی پریشانیوں کا تھا۔ ترجمے کا سلسلہ جوں توں کر کے چل نکلا تھا لیکن پھر اچانک کوئی نہ کوئی مشکل رونما ہو جاتی۔ والدِ ماجد کی علالت نے بڑی تشویش انگیز صورت اختیار کر لی تھی۔ نوجوان بیٹے کا غم انھیں اندر ہی اندر سے کھائے جا رہا تھا۔ ہر وقت اُداس اور مغموم رہتے۔ قلب پہلے ہی دورے سے متاثر تھا، کچھ دنوں کے بعد دورے پڑنے لگے۔ تشخیص سے معلوم ہوا وجع القلب کا عارضہ ہے۔ تشخیص کیا تھی ایک دوسرے غم کا پیش خیمہ۔ صبح و شام ان کی صحت کے لیے دُعائیں ہوتیں، صبح و شام یہی فکر تھی کہ کسی طرح یہ پریشانی دُور ہو۔

دوسری طرف جامعہ کے حالات بڑی تیزی سے بگڑ رہے تھے۔ مرحلے کی

تنگی کی یہ کیفیت تھی کہ اساتذہ کو ذاتی اخراجات خود ہی برداشت کرنا پڑتے تھے۔ دس برس کی شدید مالی تکلیف کے بعد اب گھر کے حالات جس طرح بدل رہے تھے ان کے پیشِ نظر مجبوراً یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ کچھ دنوں کے لیے جامعہ سے الگ ہو کر معاش کا کوئی دوسرا ذریعہ پیدا کیا جائے۔ روپیہ نہیں تھا کہ کاروبار کا تہیہ کرتا۔ صحافت سے کبھی دلچسپی نہیں تھی۔ بالآخر احباب نے رائے دی کہ انشورنس کا مشغلہ مناسب رہے گا۔ لیکن انشورنس کا کام جس طرح کا ہے میں قطعی اس کا اہل نہیں تھا۔ پھر بھی احباب کے اصرار پر آمادہ ہو گیا کہ چندے اس خارزار میں قدم رکھوں۔ مگر سوال یہ تھا کیا بیمہ زندگی کا کام جائز بھی ہے؟ میں نے حضرتِ علامہ سے مشورہ کیا تو فرمایا:-

لاہور ۶ مئی ۱۹۳۲

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

اگر آپ کی ملازمت کا سلسلہ ہو جائے تو بہت بہتر ہے۔ بیمہ کے متعلق مفتی محمد عبدہ (مصر) کا فتویٰ موجود ہے کہ جائز ہے۔ شعیب تو اس وقت شاید بمبئی میں ہیں "ایڈریس" کی مسودہ کا پہلا پارسل ارسال کرنے کو علی بخش سے کہہ دیا ہے۔ میں آج کل یونیورسٹی کے امتحانوں کے کاغذات دیکھنے میں مصروف ہوں۔ آپ کی تقریظ میں نے نہیں دیکھی۔ نکلسن اور سر ڈینی سن راس نے بہت اچھے خطوط جاوید نامہ کے متعلق لکھے ہیں۔ پروفیسر جیل اس کا جرمنی ترجمہ کریں گے۔ والسلام۔

محمد اقبال

لیکن میری تسلی نہیں ہوئی۔ حضرتِ علامہ بھی تو ملازمت (کسی بیمہ کمپنی میں) بجائے بیمہ ایجنسی لینے کو ترجیح دیتے تھے۔ پھر خیال آیا کہ حالتِ اضطرار میں تو بہت سی باتیں جائز

ہو جاتی ہیں۔ مفتی محمد عبدہ نے شاید اسی نقطۂ نظر سے جوازِ بیمہ کا فتویٰ دیا ہے۔ اس لحاظ سے تو بینک کا سود بھی شاید جائز قرار دیا ہے۔ لیکن سوال بیمہ کرنے یا کرانے یا خاص حالات میں کسی چیز کی حلت و حرمت کا نہیں۔ سوال اس قسم کے اداروں کے مستقلاً جواز و عدمِ جواز کا ہے۔ سو میرا اس وقت بھی اور اب بھی یہی خیال ہے کہ بیمہ زندگی اور اس قسم کے دوسرے ادارے اسلامی نظامِ زندگی میں کسی طرح کھپ نہیں سکتے[۷]۔ بینک کاری کی موجودہ شکل بھی قطعی طور پر غیر اسلامی ہے۔ بہرحال مفتی صاحب کا فتویٰ ـــــ بالخصوص جب حضرتِ علامہ نے بھی گویا اپنی رائے محفوظ رکھی تھی ـــــ میری تسلی کا باعث نہیں ہوا۔

'ایڈریس' کا اشارہ اس خطبۂ صدارت کی طرف ہے جو مسلم کانفرنس کے اجلاس لاہور کی صدارت فرماتے ہوئے ماہ فروری میں حضرتِ علامہ نے ارشاد فرمایا۔

'تقریظ' یعنی جاوید نامہ کی تقریظ جو راقم الحروف کے قلم سے مکتبۂ جامعہ کے پرچے کتاب میں شائع ہوئی۔

سر ڈینی سن راس کی ہستی محتاجِ تعارف نہیں۔ پروفیسر ہیل نے جاوید نامے کا ترجمہ شاید جرمن میں نہیں کیا۔

چند مہینے خاموشی میں گزر گئے۔ میں اپنے حالات سے پریشان تھا۔ حضرتِ علامہ

---

۷۔ بیمے کے جواز اور عدمِ جواز کی بحث میں سوچنے کی بات یہ ہے کہ (۱) جو رقوم قبل از میعاد ادا کی جاتی ہیں ان کی ذمہ داری شرکتِ بیمہ کی بجائے شرکائے بیمہ پر پڑتی ہے (۲) اگر قبل از میعاد ادا نہ ہوں تو اس سے جو فائدہ ہوگا ویسے ہی ہوگا جیسے سودی کاروبار میں۔ پھر یہ محض ذاتی نفع مندی کے لیے خلقِ خدا کو ایک نفسیاتی فریب میں مبتلا کرنا یا سیاسی اجتماعی اعتبار سے معاش کا مسئلہ غیر یقینی رکھنا کہاں تک جائز ہے؟

کو سیاسیات سے فرصت نہیں تھی۔ اسی اثنا میں یہ خبر گرم ہوئی کہ تیسری گول میز کانفرنس میں حضرتِ علامہ بھی شرکت فرمائیں گے۔ میں نے استفساراً ایک عریضہ ارسالِ خدمت کیا تو جواباً ارشاد ہوا:

لاہور ۲۹ ستمبر ۱۹۳۲

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

میرے یورپ جانے کا ابھی تک کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہوا۔ اگر گیا تو اسی اکتوبر میں ہی جاؤں گا۔ ورنہ انشاء اللہ تعالیٰ آیندہ سال۔

ڈاکٹر جرمانوس کا خط مجھے بھی آیا تھا۔ اگر میں یورپ گیا تو ان سے بھی ضرور ملوں گا۔ مجھے یہ سُن کر افسوس ہوا کہ آپ کی صحت اچھی نہیں۔ آج کل کشمیر کا موسم بہت عمدہ ہے اور غالباً وسط نومبر تک اچھا رہے گا۔ بعد میں زیادہ سردی ہو جائے گی۔ لندن کی Aristotelian Society نے مجھ سے کسی فلسفیانہ مضمون پر لیکچر دینے کی درخواست کی تھی۔ جو لکھ کر ختم کیا ہے۔ اس کا عنوان ہے

اگر خود گیا تو یہ لیکچر زبانی دیا جائے گا۔ ورنہ ڈاک میں بھیج دیا جائے گا۔ لیکچر لکھنے میں قریباً ایک ماہ صرف ہوا۔ Aristotelian Society لندن کی ایک مشہور اور پرانی سوسائٹی ہے اور بہت سے مغربی حکما کی آنکھ دیکھ چکی ہے۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ خدا تعالیٰ آپ کو صحت دے۔ یورپ کے متعلق جب کوئی قطعی فیصلہ ہو گیا تو آپ کو مطلع کروں گا۔

والسلام۔

محمد اقبال

میں نے عرض کیا میرا ارادہ بھی یہی تھا کہ بحالیِ صحت کے لیے کشمیر چلا جاؤں۔ جو آپ

کے ارشاد سے اور بھی پختہ ہو گیا ہے۔ والدہ محترمہ کی صحت بظاہر سنبھل گئی تھی۔ لیکن پچھلے برس سے مجھ پر ذہنی اور جسمانی اعتبار سے جو غیر معمولی بار پڑا تھا اس کو دیکھتے ہوئے بالآخر یہی فیصلہ کرنا پڑا کہ چند مہینے کسی صحت افزا مقام پر گزاروں۔ کوئٹہ پیشتر زیادہ صحت بخش اور صحت افزا مقام اور کیا ہو سکتا تھا پھر یہ کہ میں پہلے عزم کر چکا تھا۔ حضرت علامہ کا مشورہ بھی یہی تھا۔ بہر حال میں سفر کے حالات بالخصوص والدہ ماجدہ کی خرابیٔ صحت کو دیکھتے ہوئے با دلِ ناخواستہ رختِ سفر باندھنا شروع کر دیا۔

سفرِ یورپ یعنی تیسری گول میز [illegible] کا [illegible] Religion [illegible] [illegible] شامل [illegible] ہے۔

۱۹۳۲ء [illegible] مکتوبات [illegible] باقی تھے جو [illegible] ضائع ہو گئے لیکن [illegible] کی عکسی نقل [illegible] کی [illegible] اشاعت میں محفوظ ہے۔

یہ غالباً ۱۹۳۸ء کے اواخر یا ۱۹۳۹ء کی ابتدا کا ذکر ہے [illegible] اور شیرازہ کے مدیر شہیر جناب چراغ حسن حسرت مرحوم نے حضرت علامہ کا یہ [illegible] مجھ سے مستعار لیا۔ مقصد یہ تھا کہ اس کی نقل احسان کے اقبال نمبر یا شیرازہ کے کسی پرچے میں شائع کر دی جائے۔ حسرت مرحوم کا یہ ارادہ تو پورا ہو گیا لیکن [illegible] پھر کبھی واپس نہ ملا حالانکہ میں نے بار بار اس کا مطالبہ کیا۔ حسرت مرحوم بڑے مصروف انسان تھے اور کاغذات بھی شاید احتیاط سے نہیں رکھتے تھے۔ پھر جب وہ سلسلۂ ملازمت میں منسلک ہو گئے تو ان سے ملاقات کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔ جنگ ختم ہوئی اور حسرت صاحب ملازمت سے واپس آئے تو میں نے پھر تقاضا کیا۔ لیکن انھیں موقع نہ ملا کہ اس مکتوب نامے کو تلاش

کرتے، تا آنکہ میں اس کی واپسی سے مایوس ہو گیا۔ بہر حال یہ مکتوب یا اس کی عکسی نقل اگر کسی صاحب کے پاس موجود ہو یا ضمن اتفاق سے احسان کے کسی پرچے میں مل جائے تو راقم الحروف کو بھیج دیں۔ ان کی بڑی نوازش ہو گی۔ وہ سفید ہلکے لکیردار اور دو صفحہ کاغذ پر جو کبھی مراسلات نویسی کے لیے استعمال ہوا کرتا تھا، لکھا گیا ہے اور ہے بھی مختصر یعنی اس میں ایک اشارہ ڈاکٹر انصاری مرحوم کے کسی خط اور دوسرا متحدہ قومیت کی طرف ہے۔ حضرتِ علامہ ان دنوں سفرِ لندن کی تیاری کر رہے تھے۔ اس مکتوب کا ایک جملہ مجھے بھی ابھی تک یاد ہے:-

"آبادیوں کے تبادلے کی تجویز میری نہیں لالہ لاجپت رائے کی ہے"۔

یہ گویا اس سوال کا جواب تھا کہ اگر اسلامی ریاست کے بارے میں ان کی تجویز مان لی جائے تو کیا آبادیوں کا تبادلہ ضروری ہو گا۔ حضرتِ علامہ کا جواب نفی میں تھا۔

راقم الحروف کا اگرچہ ہرگز یہ ارادہ نہیں کہ مکتوبات کے اس مجموعے میں سیاسی احوال و شئون کا ذکر چھیڑا جائے لیکن یہ مکتوب جن حالات میں لکھا گیا ان کے پیشِ نظر چند امور کی وضاحت ضروری ہو جاتی ہے۔

خصوصی طور پر ایسے الہ آباد والا کانفرنس کا محرک تو وہی اسلامی ریاست کی تجویز تھی جو حضرتِ علامہ نے الہ آباد میں پیش کی۔ حضرتِ علامہ چاہتے تھے مسلم لیگ اور ایسے ہی دوسری سیاسی جماعتیں سنجیدگی سے اس مسئلے پر غور کریں کہ جب اسلام کی حیثیت بجائے خود ایک ہیئتِ اجتماعیہ، علیٰ ہٰذا متعلق تہذیب و ثقافت کی ہے جس کا ایک مخصوص نصب العین ہے تو ہندوستان میں عملاً اس کی ترجمانی کے لیے کیا راستہ اختیار کیا جائے لیکن پھر ایک اور پہلو سے بھی اس کانفرنس کا انعقاد ضروری تھا۔

میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ تحریکِ ترکِ موالات کی ناکامی نے مسلمانوں میں جو بے دلی اور بے ہمتی پھیل گئی تھی اس سے ان کے ملی اتحاد کا شیرازہ بڑی حد تک بکھر گیا۔ اس تحریک کی ناکامی سے پہلے مسلمان بڑے منظم بھی تھے اور ملک میں ان کا ایک وقار اور اقتدار بھی قائم تھا۔ یوں بھی اس تحریک کا خاتمہ ان کے خلافِ توقع دفعۃً کچھ ایسے حالات اور واقعات میں ہوا جس سے ان کا حوصلہ ٹوٹ گیا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ برطانوی شہنشاہیت کے مقابلے میں تحریکِ ترکِ موالات کی کامیابی لہٰذا ہند اور بیرونِ ہند میں ان کے ملی احیا کے دن قریب ہیں اور میرا خیال ہے ہندوؤں نے بھی اس صورتِ حالات کا پورا پورا اندازہ کر لیا تھا۔ لیکن وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان مضبوط ہوں یا اس سیاسی جدوجہد میں جو ہندو مسلم اتحاد کے نام پر جاری کی گئی تھی زیادہ اقتدار حاصل کر لیں مجھے خوب یاد ہے ۱۹۲۲ء میں جب اس خیال سے کہ قانون شکنی کی تحریک کو جاری رکھنی چاہیے یا نہیں کانگریس نے ایک مجلسِ تحقیقات مقرر کی[۸] اور اس کا ایک اجلاس رفاہِ عام ہال لکھنؤ میں منعقد ہوا تو یہ بابو بھگوان داس تھے جنھوں نے سب سے پہلے اور بغیر موقع و محل کی مناسبت کے سوال اٹھایا کہ آزاد ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے حقوق کیا ہوں گے۔ پھر جب ۱۹۲۳ء میں کانگریس "تغیر پسند" اور "غیر تغیر پسند"[۹] دو جماعتوں میں بٹ گئی تو ایک طرف مجالسِ وضعِ قانون میں داخلے، دوسری جانب تعمیری پروگرام پر عمل درآمد کی ابتدا ہوئی تو ہندو مسلم اتحاد کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ مسلمانوں

---

Civil Disobedience Enquiry Committee – ۸

No-changers اور Changers – ۹

کے سامنے اب کوئی لائحۂ عمل تھا، نہ مستقبل کا کوئی تصوّر۔ البتہ ہندوؤں نے اپنے لیے ایک جُداگانہ راستہ تجویز کر لیا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کے دعوے بظاہر وہی تھے جو تحریکِ ترکِ موالات کے آغاز میں۔ رہے مسلمان سو گو وہ اس متحدہ محاذ کی شکست پر جو ۱۹۲۱ میں اس بنا پر قائم ہوا تھا کہ یہ دو قوموں کا محاذ ہے ایک غیر ملکی حکومت کے خلاف، پھر الغائے خلافت سے عجیب حیص بیص میں تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آزادی اور استخلاصِ وطن کی وہ تحریک جو ایک محکوم ملک نے حاکم قوم کے خلاف جاری کر رکھی ہے اس میں ان کا موقف کیا ہے۔ وہ آزادی کی جنگ ہے یا کسی مخصوص مقصد کے لیے محض ہندوؤں کی قومی جدّ و جہد۔ وہ اس میں شریک ہیں، شریک ہوں یا نہیں؟ اگر ہیں تو کس حیثیت سے؟ ہوں تو کس لیے اور نہیں تو کیوں؟ اب صورتِ حالات کچھ بھی ہوتی تقاضائے مصلحت بہر کیف یہی تھا کہ وہ اس تحریک میں اپنا کوئی موقف متعین کرتے۔ لیکن ہوا تو یہ کہ مسلمان برسوں تک ایسا نہیں کر سکے۔ دوسری جانب ہندو اکثریت بھی جس کے سامنے ایک سوچا سمجھا ہوا نصب العین اور ایک واضح لائحۂ عمل تھا۔ وہ دلی عزم اور مضبوطی کے ساتھ اپنے ایک مقرر کردہ راستے پر قدم اٹھا رہی تھی۔ اس نے مسلمانوں کے تذبذب اور انتشار سے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ جمہورِ اسلام تو کسی صحیح قیادت اور راہنمائی سے محروم تھے۔ ان کے پاس کچھ تھا تو یہی اسلام اور آزادی کے لیے مخلصانہ جذبات، یا جدید سیاسی دُنیا کے متعلق کچھ مبہم سے تصوّرات۔ ان کو ایک نہیں کئی جماعتیں اپنی طرف کھینچ رہی تھیں مثلاً وہ لوگ جو عقیدۃً تو مسلمان تھے لیکن عملاً یا کم از کم سیاسی اور اجتماعی اعتبار سے سرتاپا دُنیا پسند (سیکولر)۔ ان کے خیالات کا سرچشمہ یا تو مغربی تعلیم تھی، یا تہذیبِ حاضرہ کے سیاسی معاشی انقلابات، پھر ترکوں کی وطنی قومیت اور

گئی۔ آزادی اور استخلاص کی تڑپ۔ کچھ لوگ دینی غیرت اور حمیت اور بالخصوص حکومتِ برطانیہ کی اسلام دشمنی سے تنگ آکر آزادیِ وطن میں بہر قیمت ہندوؤں سے اتحاد و اشتراک پر تلے بیٹھے تھے۔ کچھ دنیوی مصلحتوں، ہندو اکثریت کے خوف اور مزعومہ حقوق کی حفاظت میں ایک ایسی روش پر چل رہے تھے جسے بآسانی سرکار پرستی سے تعبیر کیا جا سکتا تھا اور جس سے اسلام اور اسلام کے ساتھ ساتھ ان سب آرزوؤں اور امنگوں سے بے تعلقی کا اظہار ہوتا تھا جو حریت، مساوات اور معاشی انصاف، یا اخلاصِ فرد اور قومی ارتقا وغیرہ وغیرہ کے نام پر دلوں میں اُبھر رہی تھیں۔ یہ صورتِ حالات بڑی یاس انگیز تھی اور اس میں سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ عین موقعہ پر مسلمانوں سے کوئی انصاف نہیں کرے گا، نہ ہندو، نہ انگریز۔ اس کا کوئی علاج تھا تو یہ کہ مسلمان اپنی سیاسی جدوجہد کا مدار صرف اسلام پر رکھیں۔ وہ ہندوؤں کا ساتھ دیں نہ انگریزوں کا۔ وہ ساتھ دیں تو صرف اپنا۔ چنانچہ یہی چیز تھی جس کی حضرتِ علامہ بار بار دعوت دے رہے تھے۔ لیکن اسلام کو اصولِ سیاست اور مدارِ اجتماع ملتے ہوئے ایک نیا سیاسی محاذ قائم کرنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ اس میں بہت سی رکاوٹیں حائل تھیں۔ مثلاً ایک تو یہی مسلمانوں کی بے دینی اور بے حوصلگی؛ یا اسلام کی یہ تعبیر کہ وہ ایک اخلاقی اور روحانی عقیدہ ہے، لہٰذا اس میں اور دوسرے ادیان میں فی الحقیقت کوئی اختلاف نہیں اور اس لیے ہندوستان میں انفرادی زندگی سے باہر یعنی اجتماعی طور پر کسی مخصوص اسلامی تنظیم یا تاسیس پر زور دینا غلط ہوگا؛ یا یہ کہ اگر آزادی و استخلاص پر ہمارے مذہبی شعائر محفوظ رہیں تو اس سے زیادہ نہ اسلام کا کوئی مطالبہ ہے نہ ہونا چاہیے۔ یہ کہ دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کو دیکھ کر امورِ تمدن میں بھی ہم اپنی سابقہ روایات پر اصرار نہ کریں (گویا اسلام تقلید ہے تخلیق نہیں)۔ یہ کہ ہماری زندگی کے کئی دائرے ہیں، ایک اسلام کا، اس

کچھ تقاضے ہیں، دوسرا وطن کا، اس کے بھی کچھ تقاضے ہیں۔ لہٰذا اسلام سے ہماری ہندی وطنی قومیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ یہ کہ مذہب اور سیاست کو بہر حال ایک دوسرے سے جدا رکھنا چاہیے۔ جیسے دوسرے ممالک میں ہو رہا ہے۔ یہ کہ مذہب کے دن گئے۔ چنانچہ بعض حلقوں سے تو ادب و علم یا سیاست اور معاش کی آڑ میں الحاد اور بے دینی کا کھلم کھلا اظہار ہو رہا تھا اور جاننے والے خوب جانتے تھے کہ اگر ان خیالات کا سدِّ باب نہ کیا گیا تو اس سے مسلمانوں کے قومی مطالبے میں اضمحلال پیدا ہو جائے گا اور واقعہ بھی یہی ہے کہ جب کبھی اس قسم کے خیالات نے سر اٹھایا اس سے مسلمانوں کی حیاتِ ملی میں اضمحلال پیدا ہوا۔ لہٰذا حضرتِ علامہ کی خواہش تھی کہ شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں، یعنی اس وقت کے اسلامی اکثریت کے صوبوں میں اس حقیقت کا شعور پیدا کیا جائے کہ ان کے مستقبل کا دار و مدار صرف اسلام پر ہے۔ یہ حقیقت ذہن نشین ہو جاتی تو پھر توقع کی جا سکتی تھی کہ ملک کے اس حصے میں وہ اپنا ایک جداگانہ محاذ قائم کرتے اور سیاسی اقتدار کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیتے جس کے بحیثیت اکثریت وہ حقدار بھی تھے۔ ان کا وجود اگر مستحکم ہو گیا تو جو مسلمان ملک کے باقی حصوں میں بکھرے پڑے اور اقلیتوں کی زندگی بسر کر رہے ہیں، انھیں بھی اپنے حقوق کے لیے ایک سہارا مل جائے گا۔ وہ بنگال سے بھی کچھ ایسے ہی طرزِ عمل کے منتظر تھے۔

ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کا ایک ایسا متحدہ محاذ قائم کیے بغیر جس کا مطلب یہ ہو کہ وہ بھی اپنی جگہ پر ایک مستقل قوم ہیں اور اس لیے ان کا بھی ایسا ہی سیاسی وجود ہے۔ ہندو اکثریت سے کوئی مفاہمت ممکن نہیں۔ مفاہمت کے لیے دو قوموں کا وجود شرط ہے۔ مسلمانوں کو اپنی جداگانہ اسلامی قومیت کا اعلان کر دینا چاہیے۔ حضرتِ علامہ کو یقین تھا کہ اگر مسلمان اس راستے پر گامزن ہو گئے اور ہندوؤں نے ان کی جداگانہ حیثیت تسلیم کر لی تو وہ سب یکجا

جو ایک دوسرے سے بے اعتمادی کے باعث دلوں میں جاگزیں تھیں اور جن کی بنا پر ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں بعض رجعت پسند عناصر کو سر اُٹھانے کا موقع مل جاتا ہے دور ہو جائیں گی اور یہ نیم براعظم جو فی الحقیقت ایک نہیں کئی ملکوں کا مجموعہ ہے صلح و آشتی کا مرکز بن جائے گا۔ اپنے مکتوب نمبر ۲ میں حضرتِ علامہ نے متحدہ قومیت کی طرف جو مختصر سا اشارہ کیا تھا وہ بھی در اصل اسی قسم کی بعض مساوات اور اعتراضات کا جواب تھا۔ پھر اگرچہ الہ آباد میں اسلامی ریاست کی تجویز کو اس وقت کسی نے اہمیت نہیں دی بلکہ زیادہ تر بڑی بے اعتنائی کا اظہار کیا لیکن پھر اس کے باوجود بعض لوگ پوچھتے تھے کہ اگر ہندوستان تقسیم ہو گیا تو کیا آبادیوں کا تبادلہ بھی ضروری ہو جائے گا؟ ان کا خیال تھا کہ حضرتِ علامہ شاید بربنائے تعصب یہ تجویز پیش کر رہے ہیں، لیکن حضرتِ علامہ کا جواب ان کے خلاف توقع یہ تھا کہ یہ تجویز میری نہیں لالہ لاجپت رائے کی ہے۔ گویا ان کے نزدیک تعصب اور تنگ دلی کا جذبہ ہندوؤں میں تھا مسلمانوں میں نہیں۔ مسلمانوں کے دل صاف ہیں۔

لیکن اب جو سلسلۂ گفتگو یہاں تک آپہنچا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک اور بات کی وضاحت کر دی جائے۔ اِلٰہ آباد کانفرنس تمہید تھی مسلمانوں میں صحیح ملی شعور کے نشوونما اور اس کے پیشِ نظر (غیر منقسم) ہندوستان میں اپنے صحیح مستقبل کے تعین کی۔ وہ ایک ناگزیر اقدام تھا اسلامی تہذیب و ثقافت (کلچر) کے تحفظ اور پرورش کا جو ایک مخصوص نقطۂ نظر سے حیاتِ فرد اور جماعت ہی کا دوسرا نام ہے۔ وہ اعلان تھا اپنے جداگانہ ملی وجود کا لہٰذا از روئے آئین و سیاست اس اقتدار کے حصول کا جو بحیثیت اکثریت ان کا حق تھا۔ وہ ابتدا تھی ہندو مسلم مفاہمت کے لیے ایک مستقل اور مستحکم اساس؛

غنی ہذا اس وقت کے بدلتے ہوئے حالات اور گول میز کانفرنس کے پیشِ نظر مسلمانوں کے ایک متحدہ محاذ کی۔ دوم تھا اسلامی اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کی مضبوطی اور استحکام کا تاکہ جو مسلمان اس نیم براعظم کے دوسرے صوبوں میں بکھرے پڑے تھے وہ ان کا سہارا بن سکیں۔ مختصر یہ کہ وہ آرزومند تھے بانجامِ کار ایک اسلامی ریاست کے قیام اور تشکیل کی۔

لیکن یہ کانفرنس منعقد نہ ہو سکی۔ اس کے وجوہ کچھ بھی ہوں۔ سوال پیدا ہوتا ہے اس کے بعد حضرت علامہ کا طرزِ عمل کیا رہا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ۱۹۳۳ میں جب حضرت علامہ لندن سے واپس تشریف لائے تو کسی معین اقدام سے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری تھا کہ گول میز کانفرنسوں کے فیصلے بالآخر کیا ہوتے ہیں۔ انھوں نے گویا کچھ دن آرام فرمایا یعنی اپنے علمی مشاغل میں منہمک ہو گئے اور پھر شروع جاڑوں میں کابل تشریف لے گئے۔ ۱۹۳۴ کی ابتدا ہوئی تو رفتہ رفتہ انفلوئنزا نے آ دبایا، مگر انفلوئنزا کیا تھا اس طویل بیماری کا آغاز جس سے پھر انھیں کبھی صحت نہ ہوئی۔ لہٰذا ان حالات میں کسی کانفرنس کے منعقد یا اس میں شرکت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بایں ہمہ انھوں نے ذہناً تو کیا عملاً بھی مسلمانوں کی سیاسی جد و جہد سے ایک لحظہ کے لیے قطعِ تعلق نہیں کیا، بلکہ اس حالت میں بھی ان کی رہنمائی کی۔ غیر منقسم ہندوستان میں جب اصلاحات کا نفاذ ہوا اور مجالس میں انتخابات کی تیاریاں ہونے لگیں تو حضرت علامہ کی ساری توجہ اس امر پر مرکوز ہو گئی کہ مسلمان کانگریس یا کانگریس کی طرفدار جماعتوں کی بجائے اپنا ایک الگ انتخابی محاذ قائم کریں۔ انھوں نے کتنی بار یہ خواہش کی، بلکہ جب کبھی موقع ملا ملاقاتوں اور گفتگوؤں میں یہی فرمایا۔ وہ بار بار کہتے یہ احرار، یہ نیلی پوش، یہ لیگی، یہ خاکسار، یہ سب مل کر ایک متحدہ محاذ کیوں نہیں قائم کرتے۔ مسلمانوں کی بقا اسی میں ہے کہ انگریزوں اور ہندوؤں دونوں

کی شاعرانہ کارستانیوں سے غافل نہ رہیں۔ کانگریس اور کانگریس کے حامی مسلمان جس روش پر چل رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوگا کہ اسلام کے سیاسی اور ملی وجود کی نفی ہو جائے لیکن حضرتِ علامہ کو سب سے بڑا خطرہ یونینسٹ پارٹی سے تھا کیونکہ یہ پارٹی اسلامی اکثریت کے صوبوں پر مسلط اور سیاسی اور ملی ہر اعتبار سے مسلمانوں کی جڑیں کھود رہی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر اکثریت کے صوبوں کے مسلمان اس نکتے کو سمجھ لیں اور باہم مل کر قدم اٹھائیں تو اس پارٹی کی شکست یقینی ہے۔ ان کے ذہن میں کئی نام تھے مجلسِ ملیہ، حزبِ عوام، وغیرہ وغیرہ جن کے ماتحت مسلمان ایک مشترکہ انجمن قائم کر سکتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی آواز میں ایک اثر پیدا ہوا اور لوگوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ مسلمانوں کے اندر بھی اس شعور کی ابتدا ہوگئی کہ سیاسی اعتبار سے ان کی حیثیت بھی ایک الگ تھلگ قوم کی ہے۔ چنانچہ لیگ کا احیا، دو قوموں کے نظریے اور اس سے بھی کہیں بڑھ کر قائدِ اعظم کی قیادت کا راستہ صاف کرنے میں ان کا جو ہاتھ ہے اس کا کسے علم نہیں۔ میں نے ایک مرتبہ جب ان سے عرض کیا کہ بحالاتِ موجودہ تو مسلمانوں کی طرف سے کسی متحدہ مطالبے کی کوئی ضرورت نظر نہیں آتی، رہی اسلامی ریاست سو اس کے ذکر پر لوگ مسکرا دیتے ہیں۔ سرِدست تو وطن، قوم اور آزادی ہی کی پکار ہر طرف سے سننے میں آ رہی ہے۔ فرمایا فطرتِ انسانی کا خاصہ ہے کہ جب تک ایک خیال اور ایک تجربے سے پورے طور پر گزر نہیں جاتی، دوسرے خیال یا تجربے کی طرف توجہ نہیں کرتی۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے ایک دور ہے جو عنقریب گزر جائے گا۔ جو لوگ آج متحدہ قومیت یا وطن اور ملک پر زور دے رہے ہیں یہی اس کی مخالفت میں کل سب سے آگے آگے ہوں گے۔

# ۱۹۳۳

نمازی رؤف پاشا
لندن سے غرناطہ تک
کشمیر
روڈز لیکچرز
قطعات اور ریکارڈ

۶ اکتوبر ۱۹۳۲ کو میں بعزم کشمیر لاہور پہنچا اور ایک دن حضرتِ علامہ کی خدمت میں حاضر رہ کر سری نگر روانہ ہو گیا۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۲ کو حضرتِ علامہ تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن تشریف لے گئے۔ کانفرنس ختم ہوئی تو پیرس سے ہوتے ہوئے قرطبہ اور غرناطہ کی زیارت کے لیے اسپین روانہ ہو گئے۔ یہی سفر تھا جس میں مشہور فلسفی برگساں سے ان کی ملاقات ہوئی۔ اور پھر فروری ۱۹۳۳ میں ایک طویل سفر کے بعد مراجعت فرمائے وطن ہوئے۔ میں خود ۱۹ دسمبر کو سری نگر سے روانہ ہوا اور سیالکوٹ ہوتے ہوئے لاہور میں قیام کیے بغیر دہلی پہنچ گیا۔ لیکن پہلے ڈیڑھ مہینے

کے لیے پھر لاہور چلا آیا۔ فروری کے آخر میں پھر دہلی جانا پڑا۔ اسی سال ڈاکٹر انصاری مرحوم و مغفور ـــــ امیر جامعہ ملیہ ـــــ کی کوششوں سے جامعہ میں توسیعی خطبات کا سلسلہ شروع ہوا اور اعلان کیا گیا کہ اس کی ابتدا غازی رؤف پاشا[1] فرمائیں گے۔ چنانچہ شروع مارچ میں غازیِ موصوف فرانس سے (جہاں ان کا قیام تھا) دہلی تشریف لائے۔ یہ سب کچھ ڈاکٹر انصاری مرحوم کی دریا دلی، فیاضی اور قدر شناسی کا نتیجہ تھا۔ بین الاقوامی شہرت کے ایک ترک سیاستدان اور عالمِ اسلام کے ایک بطلِ جلیل کا دہلی آنا اور ایک علمی حلقے سے خطاب کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ دہلی میں ہر کہیں اس کا چرچا تھا اور لوگ منتظر تھے کہ غازیِ موصوف کب تشریف لاتے ہیں اور کب ان کا سلسلۂ خطبات شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ کچھ اس موقعے کی اہمیت اور کچھ اس خیال سے کہ بحیثیت ایک درسگاہ جامعہ کے وقار کا تقاضا یہی ہے کہ غازیِ موصوف کے خطبات کی صدارت اہلِ علم کریں ڈاکٹر انصاری اور اربابِ جامعہ کی نگاہیں سب سے پہلے حضرتِ علامہ کی طرف گئیں۔

---

۱۔ سالارِ حمیدیہ۔ جنگِ بلقان میں بڑا نام پیدا کیا۔ اس زمانے میں وہ رؤف بے تھے۔ انجمنِ اتحاد و ترقی کے بڑے سرگرم رکن۔ غازیِ موصوف کا شمار عالمِ اسلام کی ممدوح چند نامور ہستیوں میں ہوتا تھا۔ کمالیوں میں اوّل اتاترک کا ساتھ دیا، پھر شاید ان کی مغرب پسندی اور جذبۂ وطنیت سے اختلاف کے باعث ملک بدر ہو گئے۔ قیام پیرس میں رہا۔ غازیِ موصوف دہلی کیا آئے تحریکِ خلافت کی یاد تازہ ہو گئی۔ وہ گویا اس تحریک کا آخری نشان تھے جس نے دولتِ عثمانیہ کے ماتحت کبھی اسلام کی سیاسی عظمت کا سکہ سارے یورپ پر بٹھا دیا تھا اور پھر حادثاتِ کریمیا، پلیونا اور تھسلی اور تھوڑے ہی زمانے میں طرابلس اور بلقان کی لڑائیوں میں اقوامِ مغرب کی چیرہ دستیوں کا دلیرانہ مقابلہ کیا۔ مجاہدینِ اسلام ایک سے ایک تھے ـــ انور، جمال، شوکت، محمود وغیرہم ـــ جن کی ذات سے مسلمانوں کے نزدیک اسلام اور عالمِ اسلام کی سیاسی ہستی اور اتحاد و اتفاق کا رابطہ قائم تھا۔ لہٰذا ان کی قدر و منزلت کے ساتھ ساتھ ترکوں کی حمیت میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا؛ تا آنکہ دولتِ عثمانیہ کے تحفظ اور بقا کا مسئلہ مسلمانوں کا ذاتی مسئلہ بن گیا۔

اور ان سے درخواست کی گئی کہ تکلیف فرما کر کم از کم دو خطبوں کی صدارت قبول فرمائیں۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم کے حضرتِ علامہ سے ذاتی تعلقات تھے۔ انھوں نے اگرچہ اپنی طرف سے بھی حضرتِ علامہ کو تشریف آوری کی دعوت دے رکھی تھی اور بحیثیت شیخ الجامعہ ڈاکٹر صاحب بھی ایک خط لکھ چکے تھے، مگر پھر اس کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ میں بھی ایک خط اپنی طرف سے لکھ دوں، بلکہ کوشش کروں کہ حضرتِ علامہ جامعہ کی درخواست قبول کر لیں۔ چنانچہ میرا عریضہ حضرتِ علامہ کی خدمت میں پہنچا تو ارشاد ہوا:۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ اگر تبدیلی ناممکن ہے تو بڑی مشکل ہوگی۔ آپ کوشش کریں کہ آخری لیکچر کا روز میری صدارت کے لیے ہو اور آخری لیکچر ہا کر ہو۔ اگر ناممکن ہو تو میں ۱۹ مارچ کی شام کو یہاں سے روانہ ہو کر ۲۰ کو صبح کو دہلی پہنچ جاؤں گا۔ لیکن اگر ڈاکٹر انصاری یہ مان جائیں کہ آخری لیکچر ۱۸ کو ہو تو مجھے تار دے دیجیے۔ باقی خیریت ہے۔ ۲۰ مارچ کی صبح (یا جیسی صورتِ حال ہو) آپ بھی اسٹیشن پہ ملیں۔ والسلام۔

محمد اقبال لاہور

۸ مارچ ۱۹۳۳ء

میں نے حضرتِ علامہ کا ارشاد حرف بحرف ڈاکٹر صاحب کو پہنچا دیا۔ ڈاکٹر صاحب بہت خوش تھے مگر اب مشکل یہ تھی کہ اس طرح مرتب کردہ بلکہ اعلان شدہ پروگرام میں کچھ خلل سا پیدا ہو جاتا تھا۔ بالآخر باہمی مشورے کے بعد طے پایا کہ حضرتِ علامہ سے ۱۸ ہی کو تشریف آوری کی درخواست کی جائے اور حضرتِ علامہ نے بھی یہ درخواست منظور کر لی۔

اس اثنا میں ڈاکٹر صاحب مرحوم اپنی طرف سے تو شکریے کا خط لکھ ہی چکے تھے لیکن ۱۶ مارچ کی شام کو حکم ہوا اور ڈاکٹر صاحب نے بھی اصرار کیا کہ میں لاہور چلا جاؤں ۱۸ کی صبح کو حضرت علامہ کو ساتھ لیے واپس آجاؤں۔ لہٰذا ۱۷ کی صبح کو میں لاہور پہنچ گیا۔ حضرت علامہ ایک عرصے سے منتظر ہی تھے۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو اوّل ڈاکٹر انصاری مرحوم اور غازی موصوف کی خیریتِ مزاج دریافت کرتے رہے، پھر احبابِ جامعہ بالخصوص ذاکر صاحب، عابد صاحب اور مجیب صاحب کا پوچھا۔ باتوں باتوں میں ترکی اور مصر کی سیاست کا ذکر آگیا اور پھر اس سلسلے میں نہ معلوم کس طرح اس روز کے اخبار کا۔ میں نے عرض کیا آرنلڈ[2] کا تو آپ نے سن ہی لیا ہوگا۔ متعجب ہو کر فرمایا کیا؟ میں نے کہا صبح کے اخبار میں ان کے انتقال کی . . . بس اتنا کہنا تھا کہ حضرت علامہ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور پھر سر جھکا کر چند لمحے خوب روئے۔ یوں ان کے دل کا بخار ہلکا ہوا تو فرمایا Iqbal has lost his friend and teacher (اقبال اپنے استاد اور دوست سے محروم ہو گیا)۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اتنے گہرے روابط اور تعلقِ خاطر کے باوجود جب میں نے آرنلڈ کے مرتبہ استشراق اور اسلام سے ان کی عقیدت کا ذکر چھیڑا تو فرمایا اسلام! اسلام سے آرنلڈ کو کیا تعلق! میں نے کہا جب کوئی شخص بہ تحقیق اور طالب علمانہ اسلام پر قلم اٹھاتا ہے تو اس سے یہی یہی توقع ہوتی ہے کہ اسلام کے بارے میں اس کی رائے اچھی ہوگی، بلکہ شاید وہ خود بھی اس کی طرف مائل ہو، جیسے مثلاً نپولین یا گوئٹے کے بارے میں کہا جاتا ہے۔ پھر آرنلڈ

---

۲۔ سر ٹامس آرنلڈ کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔

تو دعوتِ اسلام[۳] بھی لکھ چکے ہیں۔ فرمایا دعوتِ اسلام اور اس قسم کی کتابوں پر نہ جاؤ۔ آرنلڈ کی وفاداری صرف خاکِ انگلستان سے تھی۔ وہی ان کا دین تھا اور وہی اُن کی دنیا۔ اُنھوں نے جو کچھ کیا انگلستان کے مفاد کے لیے کیا۔ میں جب انگلستان میں تھا تو اُنھوں نے مجھ سے بہائیوں کی تاریخ، ادبیاتِ بہاء پر کچھ لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ لیکن میں نے انکار کر دیا، کیونکہ مجھے اس قسم کی تصنیفات میں انگلستان کا مفاد کام کرتا نظر آتا تھا۔ دراصل یہ بھی ایک کوشش تھی ایرانی قومیت کو ہوا دینے کی اس مقصد سے کہ ملّتِ اسلامیہ کی وحدت پارہ پارہ ہو جائے۔ بات یہ ہے کہ مغرب میں فرد کی زندگی صرف ملک کے لیے ہے اور وطنی قومیت کا تقاضا بھی یہ ہے کہ ملک اور قوم (دونوں ایک ہی چیز کے دو نام ہیں) کو ہر بات پر مقدم رکھا جائے۔ لہٰذا آرنلڈ کو مسیحیت سے غرض تھی نہ اسلام سے، بلکہ سیاسی اعتبار سے دیکھا جائے تو آرنلڈ کیا، ہر مستشرق کا علم و فضل وہی راستہ اختیار کر لیتا ہے جو مغرب کی ہوسِ استعمار اور شہنشاہیت کے مطابق ہو۔ ان حضرات کو بھی شہنشاہیت پسندوں اور سیاست کاروں کا دست و بازو تصوّر کرنا چاہیے۔ پھر علی بخش کو بلایا اور اسی وقت لیڈی آرنلڈ کو تعزیت کا تار بھیجا۔

اُسی روز شام کو حضرتِ علامہ لاہور سے دہلی روانہ ہو گئے۔ مجھے شرفِ معیت حاصل تھا۔ اس سلسلے میں ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ہر چند کہ جامعہ کا اصرار تھا کہ مصارفِ سفر کا بار حضرتِ علامہ پر نہ ڈالا جائے مگر ان کی طبعِ غیور نے گوارا نہ کیا، بلکہ میرے ٹکٹ کے دام بھی اپنی جیب سے ادا کیے۔ صبح دہلی پہنچے تو ریلوے اسٹیشن پر

---

۳- آرنلڈ کی مشہور تصنیف

احباب جامعہ کے علاوہ بعض اور نیاز مند بھی خیر مقدم کے لیے موجود تھے۔ حضرت علامہ اسٹیشن سے سیدھے دارالسلام[۴] تشریف لے گئے۔ شام کے قریب جامعہ تشریف لائے۔ ڈاکٹر انصاری، غازی رؤف پاشا اور ذاکر صاحب ساتھ تھے۔ اہلِ جامعہ اور معززین محمد علی ہال سے باہر استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ نعرہ ہائے تکبیر بلند ہوئے۔ حضرت علامہ آگے بڑھے۔ شائقین میں جس جس کو موقعہ ملا اس سے معانقہ کرتے ہوئے غازی موصوف اور احباب کے ساتھ ہال کے بغلی کمرے میں بیٹھ گئے۔ جلسے کا وقت آیا اور ذاکر صاحب نے معزز مہمانوں سے ہال میں چلنے کی درخواست کی تو غازی موصوف حضرت علامہ کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ حضرت علامہ نے فرمایا تشریف لے چلیے۔ غازی موصوف مؤدبانہ کہنے لگے "ہرگز نہیں، آپ ہماری پیشوائی فرمایئے۔ کہنے لگے۔ You are our Pir (آپ ہمارے پیر ہیں) - اب کے پھر جب غازی موصوف اور ارباب جامعہ کے ساتھ حضرت علامہ ہال میں داخل ہوئے تو مجمع نے بڑے جوش سے خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر انصاری صاحب نے جلسے کا افتتاح فرمایا تو حضرت علامہ کی تشریف آوری پر اظہار تشکر کرتے ہوئے ان سے کرسیٔ صدارت کو زینت دینے کی درخواست کی۔ حضرت علامہ نے بھی اوّل چند کلمات میں ڈاکٹر صاحب مرحوم اور غازی موصوف کا شکریہ ادا کیا اور پھر ڈاکٹر صاحب کو مبارکباد دی کہ ان کی کوششوں سے عالمِ اسلام کے ایک فرزندِ جلیل نے ارضِ ہند کو اپنے ورود سے سرفراز فرمایا اور اس طرح باہم تبادلۂ خیالات کا موقعہ پیدا ہوا۔ پھر غازی موصوف سے فرمایا کہ حاضرینِ جلسہ سے خطاب

---

۴۔ د۔ گنج میں ڈاکٹر انصاری مرحوم کا دولت کدہ۔

کریں۔ غازی موصوف ٹیک کے قریب تشریف لائے۔ چند الفاظ حضرتِ علامہ کی تعریف میں کہے اور پھر اپنا مقالہ شروع کیا۔ عنوان تھا وطنیت اور اتحاد۔ (ملاحظہ) غازی موصوف مقالہ ارشاد فرما چکے تو حضرتِ علامہ نے بحیثیتِ صدر ایک عجیب تقریر کی جس کو حاضرینِ جلسہ کبھی نہیں بھول سکیں گے۔ حضرتِ علامہ عالمِ اسلام کی تازہ بیداری، ترکی انقلاب، مسئلہ جمہوریت، خلافت اور اتحادِ اسلامی (بر اصطلاحِ مغرب پین اسلامزم) پر تبصرہ فرما رہے تھے اور مجمع تھا کہ بُت بنا حضرتِ علامہ کے ارشادات سن رہا تھا۔ تقریر انگریزی زبان میں تھی۔ ایک موقع پر جب بہ سلسلۂ پین اسلامزم حضرتِ علامہ نے فرمایا یہ ایک باطل اصطلاح ہے جسے یورپ کے سیاستدانوں نے عالمِ اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں اور فتنہ انگیزیوں کے لیے وضع کیا تو آصف علی صاحب مرحوم[5] نے انھیں ٹوکنے کی کوشش کی۔ لیکن حضرتِ علامہ اس جوش اور وثوق و اعتماد سے تقریر کر رہے تھے جیسے اُستاد طلبا کو کوئی مضمون سمجھا رہا ہو۔ اُنھوں نے ہاتھ کے اشارہ سے آصف علی صاحب کو بٹھا دیا گویا وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ ذرا ٹھہریے میں ابھی آپ کی غلط فہمی دور کیے دیتا ہوں۔ یہ تقریر کوئی گھنٹہ بھر جاری رہی، جس کے اختتام پر حضرتِ علامہ نے اپنی مشہور نظم (اس وقت تک غیر مطبوعہ) "جامع قرطبہ" کا آخری بند سنایا تو اہلِ محفل پہ ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی اور کچھ تو ان اشعار کے زیرِ اثر۔

روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب
رازِ خدائی ہے یہ، کہہ نہیں سکتی زباں!

---

۵- بیرسٹر ایٹ لا دہلی۔ مشہور کانگریسی راہنما۔ تقسیم کے بعد گورنر اڑیسہ۔

دیکھیے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

اور کچھ ذرا بیٹھے کہ حاضرینِ جلسہ کی یہ آرزو کہ حضرت علامہ سے ان کا کلام سنیں آپ سے آپ پوری ہوگئی۔

تقریر کا ختم ہونا تھا کہ لوگ دیوانہ وار مسند کی طرف بڑھے اور اس حال میں کہ از رہِ عقیدت گویا حضرت علامہ سے چپٹے جا رہے تھے۔ اب یہ کسے یاد ہے کہ اس عالمِ وارفتگی میں کسی نے کیا کہا اور حضرت علامہ نے اس کا کیا جواب دیا۔ بالآخر مجمع چھٹا اور صرف خاص احباب رہ گئے تو انھیں حضرت علامہ سے گفتگو کا موقعہ ملا۔ والد صاحب بھی موجود تھے۔ حضرت علامہ نے بادیدہ نم ان کو تسلی دی۔ یہ گویا نوجوان بیٹے کی بے وقت موت پر ان کا اظہارِ افسوس تھا۔

ہاں یہیں یہ کہنا بھول گیا کہ نیشنلسٹ حضرات کو حضرت علامہ کی تقریر کچھ بہت زیادہ پسند نہیں آئی۔ آصف علی صاحب مرحوم کو بھی روک دینا انھیں ناگوار گزرا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کیوں؟ یہ موقعہ سیاسی اختلافات یا کسی مخصوص طرزِ فکر کی بحث و تمحیص کا نہیں۔ مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ متحدہ یا ہندی قومیت کی تحریک نے اپنے طرفداروں کے اندر کچھ اس قسم کا ذہن پیدا کر دیا تھا کہ جہاں کہیں امورِ سیاست یا تاریخ و تمدن کا ذکر آیا اور اس کا سلسلہ اسلام سے جوڑا گیا تو انھیں اس پر کچھ ناگواری سی محسوس ہونے لگی۔ وہ چاہتے تھے ہر واقعے اور ہر حادثے کی تشریح قومی اور وطنی نقطۂ نظر سے کی جائے۔

حضرت علامہ نے چونکہ غازی موصوف کے آئندہ جلسے کی صدارت بھی منظور فرمالی

تھی اِس لیے دو چار روز ڈاکٹر انصاری کے یہاں خوب چہل پہل رہی۔ دن بھر گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا اور اس میں غازی موصوف، ڈاکٹر انصاری اور حضرتِ علّامہ کے علاوہ حاضرینِ مجلس بھی خوب خوب حصّہ لیتے۔ موضوعِ بحث زیادہ تر یہی ہندی اسلامی سیاسیات تھا یا پھر عالمِ اسلام، اس کا مستقبل اور تقدیر۔

ایک روز کے وقفے کے بعد حضرتِ علّامہ نے پھر غازی موصوف کے خطبے کی صدارت فرمائی لیکن اس مرتبہ کوئی تقریر نہیں کی بلکہ غازی موصوف کے ارشادات کے بعد جلسے کی کارروائی ختم کرتے ہوئے بطورِ تفنّنِ طبع صرف اتنا فرمایا کہ غازی موصوف نے جو کچھ کہا ہے ـــــ اس خطبے کا موضوع تھا جنگِ عظیم ـــــ اس میں مجھے صرف ایک لطیفے کا اضافہ کرنا ہے جس کا کسی زمانے میں یورپ میں بڑا چرچا تھا۔ لطیفہ یہ ہے کہ ایک روز کسی نے شیطان کو دیکھا بڑے اطمینان سے آرام کرسی پر بیٹھا سگار پی رہا ہے۔ اس نے جو شیطان کو اس حال میں دیکھا تو سخت متعجب ہوا۔ کہنے لگا "حضرت، یہ کیا بات ہے؟ آپ اس اطمینان سے بیٹھے سگار پی رہے ہیں، اب دنیا میں فتنہ و فساد کون پھیلائے گا۔" اس نے کہا "فکر نہ کیجیے میں نے یہ خدمت برطانوی کابینہ کے سپرد کر رکھی ہے۔" اس پر محفل میں بڑے زور کا قہقہہ پڑا اور جلسہ برخاست ہو گیا۔ بالِ جبریل میں یہی خیال حضرتِ علّامہ نے اپنی اس نظم میں جس کا عنوان ہے ابلیس کی عرضداشت ایک دوسری طرح ادا کیا ہے۔

یہاں غالباً ان خیالات کی طرف مختصر سا اشارہ بے محل نہ ہوگا جن کا اظہار غازی رؤف پاشا نے اپنے خطبات میں کیا۔ غازیِ موصوف کی ساری کوشش یہ تھی کہ مسلمانانِ ہند کو ترکوں کی اسلامی حیثیت اور غلامیِ دین کا یقین دلائیں۔ ترکوں کی نسبت یہ خیال تو عام تھا ـــــ بالخصوص اس نیم تعلیم یافتہ طبقے میں ـــــ کہ زوالِ بغداد کے بعد انھوں نے اسلام

کی خدمت جس بے جگری سے کی، اس کی کوئی دُوسری مثال نہیں ملتی۔ وہ یورپ کے خلاف
ایک ایسی مضبوط قوت تھے جس نے دیر تک اس کے حملوں کو روکا اور یوں گویا سارے عالمِ
اسلام کی طرف سے فریضۂ جہاد ادا کیا۔ پھر جونہی یہ سد ٹوٹی کوئی دُوسری قوم مسلمانوں کو
مغربی طاقتوں کے غلبہ و استیلا سے محفوظ نہیں رکھ سکی۔ لہٰذا مسلمانوں کے ذہن میں ایک
عام تُرک کا تصوّر اسلامی مجاہد کا تصوّر تھا اور غازی مرحوم چاہتے تھے اس تصوّر کو کمالی
انقلاب کے باوجود قائم رکھیں۔ وہ بار بار کہتے اور بڑی جوش و خلوص سے کہتے ترک قرآن
عظیم الشّان کی تعلیمات پر دل سے ایمان رکھتے ہیں ——— قرآن عظیم الشّان کے الفاظ
ان کی زبان سے نہایت بھلے معلوم ہوتے تھے ——— لیکن پھر ترکی حکومت "دُنیاوی"
(سیکیولر) حکومت بن چکی تھی۔ ترکی میں قانون کی بنا قرآنِ مجید پر نہیں تھی، نہ ترکی قومیت
کے لیے مسلمان ہونا ضروری تھا۔ مگر یہ وہ باتیں تھیں، جن کا غازی مرحوم کے پاس کوئی
جواب نہیں تھا۔ وہ خود بھی تو اسی اختلاف کی بنا پر کہ کمالی انقلاب نے ترکوں کا رشتہ
عالمِ اسلام سے منقطع کر دیا! بلکہ مذہب کے بارے میں ایک ایسی روش اختیار کی ہے جس
کے بعد انکی از رُوئے اسلام کوئی ضرورت نہیں، جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ مگر وہ کہتے
اور بڑے شدّ و مد سے کہتے کہ یہ ایک مجبورانہ فعل تھا جو کمال پاشا کو جنگِ عظیم کے
بعد اختیار کرنا پڑا۔ ان کا کہنا تھا کہ ترکی کی اس ظاہری تبدیلی سے مسلمان بد دل نہ ہوں۔ وہ
کمال پاشا کے بھی دل سے معترف تھے اور جہاں تک ترکوں کا معاملہ ترکی قوم کی حیثیت سے
تھا وہ انہیں اس کا محسن اور نجات دہندہ تصوّر کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ انھوں نے
بڑے فخر سے کہا ترک ہی کمال پاشا ایسی ہستی پیدا کر سکتے ہیں۔ غازی مرحوم بہرحال
ایک عجیب کشمکش میں گرفتار تھے۔ ان کا دل اسلام کی طرف تھا۔ دماغ کو مجبوراً قومیت

کی حمایت کرنا پڑتی تھی۔ وہ اِس امر سے اِنکار تو نہیں کر سکتے تھے کہ ترکی اِنقلاب سے جو
اثر اُمّتِ اسلامیہ اور خود ترکوں پر مُترتّب ہو رہا ہے اِس کے نتائج آگے چل کر کچھ بہت زیادہ
خوشگوار نہیں ہوں گے۔ اس سے تو یہاں تک خدشہ ہے کہ تاریخِ اِنسانی کا وہ تصوّر ہی
مجروح ہو جائے جو اسلام کے پیشِ نظر ہے اور جس کی طرف ہم اِنسان اپنے جذبۂ نسلیت
و وطنیت کے باوجود نادانستہ بڑھ رہے ہیں، کیونکہ وُہی ایک ذریعہ ہے حفظِ انسانی
کا لیکن معلوم ہوتا ہے غازیِ موصوف کو اپنی جگہ پر اِطمینان تھا کہ ترکی کی موجودہ روش ایک
عارضی دورِ سیاست ہے جو اس لیے ایک روز خود بخود ختم ہو جائے گا۔

مگر پھر جب غازیِ موصوف یہ فرماتے کہ یورپ کے خلاف ترکوں کا جہاد دراصل وہ
مدافعانہ جنگ تھی جو انھیں مغربی شہنشاہیت کے جذبۂ اِستعمار اور جوع الارض کے باعث
لڑنا پڑی تو سوال پیدا ہوتا تھا کہ جہاد ہے کیا۔ بالخصوص اِس لیے کہ ترکوں کی سیاسی اور
اجتماعی تنظیم 'نسلی اور قومی' تھی، 'اِسلامی' نہیں تھی۔ اِسلام سے انھیں بے شک بے
پناہ محبت تھی اور انھوں نے اس کے لیے جانی اور مالی کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔
لیکن اگر ہم جہاد کی صحیح حیثیت متعیّن کرنا چاہتے ہیں تو ایک 'نسلی، قومی' اور 'ملّی، اِسلامی'
تنظیم میں فرق کرنا پڑے گا۔ پھر یہ محض کوئی علمی اور نظری بحث نہیں تھی، بلکہ مسلمانوں کے
لیے زندگی اور موت کا مسئلہ۔ سوال یہ تھا کہ دُنیا کے بدلتے ہوئے احوال اور مُلکی سیاست
کے گوناگوں تقاضوں نے خیالات میں جو اِنتشار اور پراگندگی پیدا کر رکھی ہے۔ ایسے ہی نئی
نئی تحریکیں اور نئے نئے تصوّرات جس طرح دِلوں کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں، ان کے
پیشِ نظر مسلمان اپنا 'ملّی، اسلامی' موقف قائم رکھ سکیں گے یا نہیں؟ ایک نقطۂ نظر
سے غازیِ موصوف جو کچھ کہہ رہے تھے محض اپنے جذبات، واردات اور تاثرات کی بنا

پرکھ رہے تھے۔ وہ ایک گزرے ہوئے دور کی یاد تھی جو بہر حال گزر چکا تھا اور جس کا پھر سے واپس آنا محال تھا۔ لیکن ایک دوسرے نقطۂ نظر سے ان کے یہ خیالات بڑے اُمید افزا اور ولولہ خیز تھے۔ پھر ان ارشادات کا زمانہ وہ تھا جب ملکی سیاست نے خود مسلمانوں کے اندر دو فریق پیدا کر رکھے تھے۔ ایک "قومی" لہٰذا مذہب سے ہٹ کر وطنی تنظیم کا حامی جس کو ملت اور امت کے الفاظ بڑے غیر مانوس اور بعد از وقت معلوم ہوتے تھے۔ دوسرا "اسلامی" اور اس لیے سیاسی اور اجتماعی زندگی میں امت اور ملت کی حفاظت پر مُصر۔ لیکن وطنی تنظیم کے حامی جہاں اپنی منزلِ مقصود کا واضح تصور رکھتے تھے اور انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ اس کے حصول کا صحیح راستہ کیا ہے، لہٰذا وہ تاریخ، تمدن، عمرانی اور سیاسی حقائق کی تعبیر میں مغربی علم و حکمت کا سارا تار و پود اپنے حق میں پیش کر سکتے تھے، وہاں اسلامی تنظیم کے طرف داروں کو نہ اپنی منزلِ مقصود کا کوئی واضح تصور تھا، نہ اس امر کا کہ ان کا لائحۂ عمل اس باب میں کیا ہونا چاہیے۔ پھر جدید نظریہ ہائے سیاست اور ان قومی اور وطنی رجحانات کے پیشِ نظر جو مغرب کے لادینی تہذیب و تمدن علیٰ ہٰذا سیاسی معاشی استیلا کے زیرِ اثر ہر کہیں اُبھر رہے ہیں، وہ ملت اور امت کا صحیح مفہوم بھی متعین کرنے سے قاصر رہے۔ علاوہ اس کے ایک اور مشکل یہ تھی کہ مغربی استعمار اور معاشی دست بُرد نے محکوم ممالک میں جو احوال و ظروف انفرادی اور اجتماعی ہر جہت سے پیدا کر رکھے تھے ان کو دیکھتے ہوئے قومیت اور وطنیت کا اصول تو بڑا کارگر اور مؤثر نظر آتا تھا۔ لیکن اسلامی تنظیم کے لیے نہ تو عملاً کوئی راستہ ملتا تھا، نہ یہ سمجھ میں آتا تھا کہ اگر اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھایا گیا تو ان دشواریوں کا حل کیا ہوگا جو ایک غیر ملکی اقتدار نے محکوم ممالک مثلاً "غیر منقسم" ہندوستان ہی میں پیدا

کر رکھی ہیں۔ اسلام کے مقاصد سے تو بے شک کسی کو اختلاف نہیں تھا۔ اس کی دعوت عالمگیر ہے۔ وہ اخوتِ انسانی، عدل و انصاف اور حریت و مساوات پر زور دیتا ہے لیکن مسلمانوں کی اجتماعی زندگی نے بسبب زوال و انحطاط صدیوں سے جو صورت اختیار کر رکھی تھی اس کو دیکھتے ہوئے اسلامی تنظیم کے بعض طرفداروں کا بھی یہ خیال ہو چلا تھا کہ سردست اسلام کو اس جدوجہد سے جو مغربی شہنشاہیت کے خلاف اہلِ مشرق نے جاری کر رکھی ہے الگ رکھنا ہی بہتر ہوگا، کیونکہ ہو سکتا ہے اس طرح بعض رجعت پسند عناصر اس کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کر دیں، یا مغرب ہی کے سیاسی شاطر عوام کی نیک دلی سے ناجائز طور پر فائدہ اٹھائیں۔ حاصلِ کلام یہ کہ اسلامی تنظیم کے طرفدار جہاں اسلامی اجتماعیت کی تشریح عصرِ حاضر کے بدلتے ہوئے حالات یا نئے نئے رجحانات، تقاضوں اور مطالبوں کا لحاظ رکھتے ہوئے نہیں کر سکے، وہاں وطنی تنظیم کے حامی بھی اس نکتے کو سمجھنے سے قاصر رہے کہ وہ آزادی، استخلاص اور جمہوریت وغیرہ کا نام لے لے کر جس قسم کے احوال پیدا کرنا چاہتے ہیں ان سے امنِ عالم ہو یا فرد اور جماعت کا روحانی ارتقا دونوں کے لیے کوئی خوشگوار نتیجہ مترتب ہوگا تو اسلامی نظامِ تمدنیت کی بدولت۔ لیکن پھر جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں اس وقت کا سیاسی مطلع بڑا مکدر تھا اور مسلمان تھے کہ افراد ہوں یا کسی خاص جماعت سے متعلق ان کی الجھنیں روز بروز بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ یوں اسلامی ریاست کا مسئلہ ایک عقدۂ لاینحل بن کر رہ گیا۔ لوگ اس سلسلے میں طرح طرح کے اعتراضات اٹھاتے۔ طرح طرح کے سوالات کرتے۔ کبھی سیاسی اور معاشی حقائق کی آڑ لیتے۔ کبھی تہذیب و تمدن اور تاریخ کی بحث چھیڑ دیتے، حالانکہ اسلامی ریاست کوئی معمہ نہیں تھا کہ اس کی حقیقت سمجھ میں نہ آتی۔ اسلامی ریاست کا مسئلہ

ریاست کا مسئلہ ہے۔ ریاست کا مسئلہ صاف ہو جائے تو اسلامی ریاست کے فہم میں کوئی مشکل باقی نہیں رہتی۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ لوگ ریاست ہی کے مسئلے پر غور نہیں کرتے تھے۔

ایک روز کچھ ایسی ہی باتیں ہو رہی تھیں۔ حضرتِ علامہ فرما رہے تھے مسلمان انسانیت کے اس تصور کو جو حیاتِ فرد اور جماعت کے بارے میں اسلام کا عظیم ترین عطیہ ہے کسی وطنی، نسلی، یا قومی عصبیت پر قربان نہیں کر سکتے۔ ارشاد ہوا یہ تصور اس وقت بڑا مضمحل ہو رہا ہے، حالانکہ اسلام ان تقاضوں کے خلاف نہیں جو مادی، حیاتی، یا سیاسی معاشی عوامل کے ماتحت ملکوں اور قوموں میں پیدا ہو جاتے ہیں، بلکہ ان کو بحدِ مناسب تسلیم کرتا اور معاشرے کی ہیئتِ ترکیبی میں مناسب جگہ بھی دیتا ہے تاکہ ان سب کی کفالت بطریقِ احسن ہوتی رہے۔ لیکن اسلام کی نظر جغرافی حدود و قیود کی بجائے انسان پر ہے یعنی مادی حیاتی تقاضوں کے ساتھ ساتھ تہذیب ذات پر جس کے بغیر ناممکن ہے زندگی میں کوئی معنی پیدا ہو سکیں۔ اسلام سے جس ثقافتی تحریک کی ابتدا ہوئی، یہ اسی کا فیض تھا کہ اپنی تمام غلطیوں اور فروگذاشتوں کے باوجود اسلامی معاشرے میں ایک آفاقی اور انسانی روح سرگرمِ کار رہی۔ حضرتِ علامہ یہ باتیں کر رہے تھے اور ان کی نگاہیں بار بار دارالسلام کی اس نشست گاہ کے صدرِ دیوار کی طرف اٹھ جاتیں جہاں بیٹھے وہ احباب سے گفتگو فرما رہے تھے۔ یہ نشست گاہ بڑے پُرتکلف سامان سے آراستہ تھی اور اس کی دیواروں کے بالائی حصوں پر چھت کے ساتھ ساتھ کانگرسی رہنماؤں کی قدرتی رنگ و روپ میں بڑی بڑی تصویریں —— خال خال مسلمان —— ایک سرے سے دوسرے سرے تک آویزاں تھیں۔ حضرت علامہ شاید سوچ رہے

تھے کہ وہ ذہن جس میں اسلام نے تقدیرِ انسانی کا ایک خاص تصوّر پیدا کیا تھا اب کس طرح بدل رہا اور اپنا اظہار ایک ایسی شکل میں کر رہا ہے جس کا تقاضا ہے کہ ماضی سے اس کا رشتہ یکسر منقطع ہو جائے۔ محفل برخاست ہوئی اور میں حضرتِ علامہ کے پاس رہ گیا تو اُنھوں نے پھر ان تصویروں پر نظر ڈالی لیکن اس مرتبہ اُن کی نگاہیں گاندھی ٹوپی اور کھدر کا کرتہ پہنے ہوئے، ڈاکٹر انصاری کی تصویر پر جم گئیں۔ معلوم ہوتا تھا حضرتِ علامہ کچھ سوچ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ اس کے بعد اُنھوں نے دفعۃً میری طرف مڑ کر دیکھا اور کہا "بُڈّھا (بیچارا) انصاری"۔ شاید اس لیے کہ وہ انصاری جس کی ساری زندگی تحریکِ علی گڑھ، مسلم لیگ، انجمن خدّامِ کعبہ، وفدِ بلقان اور تحریکِ خلافت کی زندہ سرگزشت تھی اب ایک ایسے گروہ میں شامل تھا جس کے خیالات اور جذبات کی دنیا اس عالم سے یکسر مختلف تھی جس کا ظہور ذہناً اور عملاً کبھی اسلام کی بدولت ہوا تھا۔

اگلے روز حضرتِ علامہ لاہور روانہ ہو گئے۔ مگر روانگی سے پہلے جب ڈاکٹر صاحب نے یہ عرض کیا کہ جامعہ، آپ کی مزید توجّہ اور التفات کی مستحق ہے۔ کیا اچھا ہو آپ، تھوڑا سا وقت نکال کر پھر تشریف لائیں اور اساتذہ و طلبہ کو اپنے ارشادات سے مستفیض فرمائیں۔ یہ ہماری دیرینہ آرزو ہے۔ تو حضرتِ علامہ ان کے خلوص اور دردمندی سے بہت متأثر ہوئے۔ فرمایا بہت بہتر۔ میں عنقریب آپ کے لیے کچھ وقت نکال سکوں گا۔

میں خود بھی ان دنوں لاہور کا عزم کر رہا تھا اور حضرتِ علامہ سے اس کا ذکر بھی کر چکا تھا کہ ۲۶ مارچ کو فریضۂ مغرب کے بعد والدِ ماجد مرحوم و مغفور نے عیدِ قرباں کا چاند

دیکھا تو مرحوم بیٹے کی یاد سے دل کو کچھ ایسی چوٹ لگی کہ ہمیں اپنی یاد میں ہمیشہ کے لیے سوگوار چھوڑ گئے۔ اس حادثۂ الیمہ کی حضرتِ علامہ کو اطلاع ہوئی تو ازرو شفقت فوراً تعزیت فرمائی۔ ۲۸ مارچ کا مکرمت نامہ یہ ہے :-

لاہور۔ ۲۸ مارچ ۱۹۳۳

ڈیئر نیازی۔ السلام علیکم۔

ابھی علی بخش کو سلامت اللہ شاہ صاحب سے معلوم ہوا کہ آپ کے والدِ ماجد نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ خدا تعالیٰ ان کو غریقِ رحمت کرے اور آپ سب بھائیوں کو اور آپ کی والدہ ماجدہ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ گزشتہ دسمبر جب میں دہلی میں تھا تو ان سے رؤف صاحب کے بنگلہ میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت وہ بالکل تندرست معلوم ہوتے تھے۔ مگر کیا معلوم تھا کہ میری ان سے یہ آخری ملاقات ہے۔ بہر حال ہر مصیبت پر اللہ کا شکر، جب ہے۔ مومن کی شان یہی ہے کہ راضی برضائے الٰہی رہے۔ زیادہ کیا عرض کروں۔

مخلص محمد اقبال

میں نے اظہارِ تشکر کے ساتھ ساتھ دعا کی درخواست کی اور ازراہ یاددہانی یہ بھی عرض کیا کہ اہلِ جامعہ آپ کی تشریف آوری کے منتظر ہیں۔ تقریر کا عنوان کیا ہوگا، ارشاد ہوا:

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ کا پوسٹ کارڈ مل گیا تھا۔ مگر میں اس سے پہلے آپ کو خط لکھ چکا تھا۔ ان کی ناگہانی رحلت سے ضعیفہ عیدِ قرباں کا چاند دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا۔

خدا تعالیٰ غریقِ رحمت کرے۔ سید ذاکر حسین صاحب سے کہہ دیجیے کہ میں ۴ اپریل کی شب کو یہاں سے روانہ ہو کر ۵ اپریل کی صبح کو دہلی پہنچوں گا۔ ۶ اپریل کو مسلم ایجوکیشن پر وائسرائے کے ہاں کانفرنس[6] ہے۔ اس کانفرنس میں مجھے بھی مدعو کیا گیا ہے۔ کیونکہ لندن میں جو سب کمیٹی اس کے لیے بنی تھی اُس کا میں بھی ممبر تھا۔ غالباً دو تین روز یا ممکن ہے ایک ہی روز یہ کانفرنس رہے۔ ڈاکٹر صاحب ۵ اپریل کی شام کو میرا لیکچر رکھ سکتے ہیں جس کا عنوان یہ ہوگا:

From London to Granada

محمد اقبال لاہور

۳۱-۳-۱۹۳۳

۵ اپریل کی صبح کو حضرتِ علامہ دہلی تشریف لائے۔ قیام کچھ تو جامعہ میں رہا اور کچھ بطورِ سرکاری مہمان نئی دہلی میں۔ تقریر اسی روز شام کو ہوئی۔ اس سلسلے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ذاکر صاحب نے بحیثیتِ صدرِ جلسہ اور شیخ الجامعہ رسمی طور پر حضرتِ علامہ کا تعارف کراتے ہوئے جو کلمات فرمائے اُن سے گویا نثر میں نظم کا رنگ بندھ گیا۔ حاضرینِ جلسہ ذاکر صاحب کی شاعری پر عش عش کر رہے تھے، حتیٰ کہ جب اپنی تقریر کے خاتمے پر انھوں نے حضرتِ علامہ سے خطاب کرتے ہوئے اُنھیں کا یہ شعر پڑھا:

---

۶ - یہ ایجوکیشن (تعلیم) کا مشاورہ کیا تھا۔ راقم الحروف کو بالکل یاد نہیں رہا۔

۷۔ 'لندن سے غرناطہ تک'۔

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی

تو مجمع میں بے اختیار واہ وا کی صدائیں بلند ہوئیں۔ حضرتِ علامہ بھی بڑے متاثر تھے۔ انھوں نے ذاکر صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تقریر کی ابتدا کی اور لندن سے غرناطہ تک سفر کے سلسلے میں برگساں سے اپنی ملاقات کا ذکر بھی کیا جس کے دوران میں ایک بڑی دقیق اور فلسفیانہ بحث چھیڑ دی۔ مگر پھر یہ دیکھ کر حاضرین جلسہ شاید زمان و مکان اور ماہیتِ شے ایسے خشک مسائل کے متحمل نہیں ہوں گے گفتگو کا رُخ بدل کر اندلس، الحمرا اور قرطبہ پر آگئے۔ لیکن اس طرح اظہارِ مدعا میں جو رکاوٹ سی پیدا ہو گئی تھی اس سے تقریر کا رنگ کچھ پھیکا پڑ گیا۔

اگلے روز سہ پہر میں حضرتِ علامہ پھر جامعہ تشریف لائے۔ مولینا اسلم نے خیر مقدم کیا۔ ان کی تقریر بڑی پُر تکلف اور خلوص و ارادت سے بھری پڑی تھی۔ مولینا نے کہا آپ ہمارے مدۃ العمر کے محبوب ہیں۔ آپ نے شعر کہنا کیا شروع کیا ہمارے دل میں گھر کر لیا۔ ہم اپنی محبت کا اظہار آپ کے استاد ہی کی زبان میں کریں گے۔ انھوں نے کہا تھا:

تخلص داغ ہے اور عاشقوں کے دل میں رہتے ہیں!

آپ کا گھر بھی عشاق کا دل ہے۔ آپ ہم سب کے محبوب ہیں۔

حضرتِ علامہ نے طلبا سے خطاب کیا۔ انجمنِ اتحاد — طلبائے جامعہ

ـــــ کی رکنیت قبول کی قدر سپاس نامے کے جواب میں بڑے حوصلہ افزا کلمات ارشاد فرمائے۔ اس کے بعد طلبا سے بات چیت کے ساتھ ان کی بیاضوں پر دستخط کرتے رہے۔ شام کو مجیب صاحب کے یہاں دعوت تھی۔ کھانے پر بڑے بڑے کی باتیں ہوتی رہیں۔ مولانا اسلم مرحوم سے بھی تبادلۂ خیالات ہوا۔ دعوت میں زیادہ تر بحث اسلامی ریاست ہی کی رہی"[8]۔

میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اسلامی ریاست کا مسئلہ بہت کچھ ابھر کر رہ گیا تھا۔ اس سلسلے میں ایک بات یہ بھی کہی جاتی تھی کہ اسلامی ریاست تو آج تک قائم ہی نہیں ہوئی، دوسری یہ کہ اس قسم کی ریاست کا خیال بہت بعد میں پیدا ہوا (انگریزی کا 'آفٹر تھاٹ' after-thought) اس بنا پر یہ کہ بعض حضرات کو خلافتِ راشدہ میں بھی اسلامی ریاست کا وجود پورے طور پر مشہود و نظر نہیں آتا تھا۔ غرضیکہ کوئی بات نہیں تھی جو اسلامی ریاست کی تنقیص یا اس امر کی تائید میں نہ کہی جاتی ہو کہ اس کا قیام ناقابلِ عمل ہے۔ اور یہ محض اس لیے کہ معترضین نہ تو قرآن سے واقف تھے نہ سنّت سے۔ وہ سمجھتے تھے اسلام مجموعہ ہے چند ایک عقائد کا۔ زندگی کی حقیقی معاملات یا فرد اور جماعت کی ہستی، نظم اور ترکیب سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ پھر ان میں وہ حضرات بھی شامل تھے جن کو اپنے علم کا غرّہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اسلامی تصورات کے طرفدار اس عہد کی علمی ترقیات اور تمدنی تبدیلیوں علیٰ ہذا ان سیاسی، معاشی، افکار، رجحانات اور واقعیات سے بالکل بے خبر ہیں جن کے پیشِ نظر انسان اب ایک نئے عالم کا

۸۔ ذکرِ اقبال میں حضرت سالک نے ان سب واقعات کو ۱۹۳۲ میں جگہ دی ہے جو صریحاً غلط ہے۔

خواب دیکھ رہا ہے۔ بعض حضرات کو اپنی تاریخ دانی کا بھی دعویٰ تھا۔ وہ کہتے تھے تاریخِ اسلام کا کونسا باب ہماری نگاہوں سے مخفی ہے۔ اسلام کا کونسا عقیدہ اور کونسا مسئلہ ہے جو ہماری سمجھ سے باہر ہو۔ کچھ اِس قسم کی فضا تھی جس میں حضرت علامہ کو جامعہ اور جامعہ سے باہر گفتگو کا موقعہ ملا۔ اب جہاں تک میں سمجھتا ہوں اِس پریشاں خیالی اور سوئے فکر و نظر کا سبب ایک تو وہی قرآنِ پاک اور اُسوۂ حسنۂ حضورِ رسالتمآب صلعم سے بے خبری تھی۔ معترضین نہیں سمجھتے تھے قرآنِ پاک نے اصولاً اور حضورِ رسالتمآب صلعم نے عملاً ان حقائق کے اعتراف میں کیا راستہ اختیار کیا ہے جن سے فرد اور جماعت کو واقعتہً سابقہ پڑتا ہے اور جن سے بالآخر تہذیب و تمدن یا سیاست اور عمران کے بارے میں ہمارے تصورات تشکیل ہوتے اور علومِ اجتماعیہ کے نشو و نما کا راستہ کھلتا ہے۔ لیکن پھر اس بحث میں ایک دوسری مشکل تعلیمِ جدید اور تعلیمِ جدید کی وساطت سے مستشرقین نے پیدا کر رکھی تھی۔ ہمیں مستشرقین کے ذوقِ تفتیش و تحقیق سے انکار نہیں؛ ان کی علمی خدمات بھی بڑی وقیع ہیں اور ہم ان غلط خیالیوں اور غلط بیانیوں کی توجیہ شاید یہ کہہ کر بھی کرسکتے ہیں کہ ان کا حقیقی سرچشمہ دراصل ہمارے ہی فکر اور عمل کی وہ خرابیاں ہیں جن کو دیکھتے ہوئے انھیں اسلام یا اسلامی تہذیب و تمدن پر نکتہ چینی کا موقعہ ملتا ہے۔ بایں ہمہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مستشرقین کا نقطۂ نظر ایک ایسی تہذیب کا نقطۂ نظر ہے جس کی اپنی صحت اور برتری، استحکام اور بقا، بلکہ دنیا کی ہر تہذیب پر آخری غلبے کا یقین ہے اور جو سمجھتی ہے کہ انسان کا مستقبل اب اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ پھر چونکہ اِس تہذیب کے، جس کا سلسلہ ایک طرف یونانی رومی دنیا اور دوسری جانب

مسیحی تعلیمات سے جا ملتا ہے۔ لہٰذا یہ مذہب ہو یا سیاست۔ اخلاق یا تہذیب و تمدن مستشرقانہ علم و فضل اور تنقید و تفحص کی انتہا بالآخر اس خیال پر ہوتی ہے کہ انسان کی زندگی کے کچھ معنی یا اس کا کوئی ایسا تصور نظر ہے جس سے تقدیر آدم کی گرہ کھل سکے تو صرف وہ جو مغربی تہذیب میں کار فرما ہے۔ اسلام یا دوسرے مذاہب کے نقطہ ہائے نظر اپنی سب خوبیوں کے باوجود ناکافی، بلکہ اب ایک طرح سے ماضی کی چیز ہیں۔ لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم مسلمان اس علم و فضل اور اس سرمایۂ تفتیش و تحقیق کو کیا کریں جب سیاسی اور ملی اعتبار سے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے مستشرقین کی مختلف جماعتیں بھی ایک طرح سے مغربی استعمار اور شہنشاہیت پسندی کی حمایت میں ارباب سیاست کا ہاتھ بٹا رہی ہیں۔ پھر تاریخ بھی یہی کہتی ہے کہ ارباب سیاست نے جب قوموں میں سیاسی اور معاشی فساد پیدا کیا تو مستشرقین نے قبل اسلام کے ادب، قبل اسلام کی تہذیب و تمدن اور قبل اسلام کی وطنی اور نسلی عصبیت کو ہوا دیتے ہوئے کوشش کی کہ عالم اسلامی کی سیاسی اور ملی وحدت کا شیرازہ درہم برہم ہو جائے۔ ان کا اندازِ بیان اور واقعات کو پیش کرنے کا طریق بھی کچھ اس طرح کا ہے جس سے طلبا کے اندر خود اعتمادی کی بجائے ماضی و حال سے بدظنی اور مستقبل سے مایوسی کا اظہار ہوتا ہے۔ اور جس کا نتیجہ ہے ایک روشِ انکار، ایک خوئے سوال تاکہ ہم نادانستہ اپنی نفی کرتے چلے جائیں۔ دراصل مستشرقانہ علم و فضل ایک حریف اور مبارزت ہے جو تہذیب کی ایک دوسری تہذیب سے دہ رہی ہے جس میں اول الذکر کو بھروسہ ہے کہ اس کا ذہنی تفوق مؤخر الذکر کی لاعلمی اور بے خبری پر غالب آ جائے گا۔ لہٰذا یہ اسلام اور اسلامی تاریخ کے بارے میں مستشرقین کی دور راز کار تعبیریں ہیں جن سے اسلامی ریاست کا فہم مشکل ہو جاتا ہے۔ اب اگر اس پہلو سے دیکھا جائے تو سوال،

پیدا ہوتا ہے کہ جامعہ ملیّہ اسلامیہ ہو، یا کوئی اور اسلامی درسگاہ اس کا وجود اگر حکومتِ وقت کے مروّجہ نظامِ تعلیم سے بے تعلّق ہے تو اس کا تعلیمی لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے۔ جامعہ ایک ایسی ہی درسگاہ تھی اور اس کا وجود بھی ایک ایسی تحریک سے وابستہ جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان غیر ملکی حکومت سے آزادی اور استخلاص کے بعد اپنے سیاسی اور ملّی نصب العین کی، پھر سے عملاً ترجمانی کریں۔ اسے تو ایک طرح سے عالمِ اسلام کی نشاۃ الثانیہ اور تجدیدِ خلافت کا بھی دعویٰ تھا۔ لہٰذا مسئلہ تھا تو یہ کہ جامعہ کا تعلیمی مطمحِ نظر کیا ہے۔ وہ اگر نوجوان مسلمانوں کے ایک بڑے محدود حلقے کی (بحیثیت ایک درسگاہ) تعلیم و تربیت کر رہی ہے تو اس کا پیغام (بہ اعتبار اس کی تبلیغی حیثیت کے) دُور دُور تک بھی تو پہنچ رہا ہے۔ حضرتِ علاّمہ کی رائے تھی کہ جامعہ کو اسلامی اور وطنی قومیت میں فرق کرنا چاہیے۔ وطنی قومیت تقسیم ہے، تفریق ہے۔ حرص و آز ہے، تقابلہ اور مسابقہ ہے۔ اس سے محبّت کی نفی ہوتی ہے۔ خیر خواہی اور رواداری کی جڑ کٹتی ہے۔ وہ قاطعِ اخوّت ہے۔ قاطعِ حرّیت اور قاطعِ مساوات۔ عدل و انصاف اور اتحاد و اشتراک کی ضد۔ اس سے امنِ عالم کو خطرہ ہے۔ وہ اخلاق اور انسانیت کی دشمن ہے۔ لہٰذا جبر و استبداد ہو یا غصب و تغلّب اس کے خلاف آواز اٹھانا، خواہ یہ افراد ہوں، طبقات یا کوئی محکوم و مقہور قوم، انسان کا حق ہے۔ بعینہٖ افراد و اقوام کا یہ بھی حق بلکہ فرض ہے کہ اپنی انفرادیت قائم رکھیں اور تعمیرِ شخصیت میں کوشاں رہیں۔ لیکن اس کے لیے ہمیں اپنی ذات کے اندر کسی اصول کی جستجو کرنا ہوگی۔ بظاہر ہے اس اصول کی بنا جغرافی حدود و قیود یا رنگ اور نسل کے رشتوں پر نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے کوئی عالمگیر، اخلاقی اور انسانی اساس قائم کرنا ہوگی جو قوموں کی رقابت اور ایک دوسرے سے وحشت اور بیگانگی کو کسی مشترک نصب العین میں بدل دے۔ اسلامی

قومیت میں بھی حکمت مُضمر ہے۔ اندریں صورت جامعہ کا فرض یہ ہے کہ اسلام نے اپنی دعوت کی بنا جن حقائق پر رکھی ہے ان کی تشریح مذہب، تاریخ، تہذیب و تمدن، سیاست اور شعر ان سب کا لحاظ رکھتے ہوئے کرے۔ یوں ہی مسلمانوں کے اندر ایک اسلامی ذہن پیدا ہوگا اور یوں ہی علما کی تعلیم و تربیت بھی اس رنگ میں ہوگی جس سے اسلامی کردار کی پرورش ہو سکے۔ برعکس اس کے اگر نظامِ تعلیم جوں کا توں غیر اسلامی (مغربی یا جیسا کہ اس زمانے میں کانگریسی تحریک کے ماتحت 'قومی' بن رہا تھا) ہے اور علوم و فنون کی تحصیل و اکتساب میں بھی اسی روش سے کام لیا جا رہا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ اگر اسلامیات کا پیوند جوڑ بھی دیا گیا تو اس سے فائدہ؟ اس سے کوئی مفید مطلب نتیجہ مترتب نہیں ہو سکتا۔

'تشکیلِ جدید' کا ترجمہ کب سے ٹل رہا تھا۔ حضرت علامہ نے دریافت فرمایا تو میں نے عرض کیا چند دنوں میں کشمیر جا رہا ہوں انشاء اللہ وہاں نظرِ ثانی کے ساتھ ساتھ مسودے کی تبییض بھی ہو جائے گی۔

حضرتِ علامہ لاہور واپس تشریف لے گئے اور اس کے چند ہفتوں کے بعد میں کشمیر روانہ ہو گیا۔ سری نگر اور گلمرگ میں قیام رہا۔ مشغلہ زیادہ تر ترجمے کی تکمیل اور نظرِ ثانی کا تھا۔ اب انتظار تھا تو خطبات کے اس نسخے کا جو کسی قدر ترمیم و اصلاح کے ساتھ آکسفرڈ پریس سے شائع ہو رہا تھا۔ میں چاہتا تھا نظرِ ثانی کے وقت یہ نسخہ میرے پیشِ نظر رہے۔ حضرت علامہ کا منشا بھی یہی تھا لیکن وہ ان دنوں کشمیر کمیٹی کی سرگرمیوں میں حصہ لے رہے تھے۔ میں نے خیریتِ مزاج کے ساتھ ساتھ نسخۂ آکسفرڈ کے بارے میں دریافت کیا کیونکہ میں چاہتا تھا خطبات کا ترجمہ جلد سے جلد مکمل ہو جائے تو فرمایا:-

ڈیئر نیازی صاحب۔

السلام علیکم۔ آپ کا خط مل گیا ہے۔

میں نے آکسفورڈ لکھا ہے کہ خطبات کے متعلق انھوں نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ اجازت طباعت کی تو میں نے دے دی تھی مگر یہ اب تک معلوم نہیں ہوا کہ اس کی طباعت شروع ہوئی یا نہیں۔ اس خط کے جواب آنے پر آپ کو مطلع کروں گا۔ آپ فی الحال کتاب کا ترجمہ شائع کر دیں۔ ترمیمات معمولی ہیں۔ جب آپ اگست کے اوائل میں لاہور آئیں گے تو نظر ثانی کے وقت بتا دوں گا۔ کوئی ایسی بات نہیں جس کے بغیر اس کے دلائل میں نقص رہ جائے۔ کشمیر کمیٹی کا اجلاس اس اتوار کو ہوگا۔ ہم سب اس بات کے متمنی ہیں کہ وہاں امن قائم رہے۔ اور وہاں کے لوگ ان اصلاحات سے متمتع ہوں جو فی الحال ان کو مل گئی ہیں۔ باقی یارزندہ صحبت باقی۔

والسلام۔

لاہور میں خوب گرمی ہے۔ بارش نہیں ہوئی یا بہت کم ہوئی ہے۔ ساون کے مہینے کا آغاز ہے۔ شاید اس ماہ میں بارش ہو۔

محمد اقبال لاہور

۱۱ جولائی ۱۹۳۳

حضرتِ علامہ کو گویا اب سیاسی ہنگاموں سے فراغت تھی۔ کشمیر کمیٹی کا اجلاس اتوار کو ہوا۔ لیکن اب اس کے وجود کی کوئی خاص ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ گو اس کا خاتمہ بہت آگے چل کر ہوا۔ بات یہ ہے کہ کشمیر کو اس زمانے میں جو اصلاحات ملیں مسلمانوں کے اس عملی اقدام کا نتیجہ تھیں جو انھوں نے ڈوگرہ راج کے مظالم کے خلاف

کیا اور جس میں کشمیر کمیٹی کی کوششیں بھی شامل تھیں۔ لیکن اصلاحات کے بعد نہ تو اس عام تحریک کا جو مسلمانوں کی مختلف جماعتوں نے شروع کی تھی کشمیر کمیٹی سے کوئی جوڑ جُڑ سکا نہ کشمیر کمیٹی ان مختلف عناصر میں جن پر اس کا وجود مشتمل تھا مستقبل کے لیے اتحاد و اتفاق کی کوئی صورت پیدا کر سکی۔

دہا ترجمہ سو اس کی اشاعت کے لیے میں جامعہ سے برابر خط و کتابت کر رہا تھا۔ میرا خیال اگست کے اوائل میں لاہور واپس جانے کا تھا لیکن بعض موانع سدِ راہ ہوئے حتّٰی کہ آخر اگست میں سیالکوٹ پہنچ کر بھی حضرتِ علامہ کی خدمت میں اطلاع نہ کر سکا۔ چنانچہ ۱۱ ستمبر کا مکتوب ہے:

ڈیئر نیازی صاحب۔ السّلام علیکم۔

آپ کا خط مجھے سلامت اللہ شاہ صاحب سے ملا۔ کتاب کی طباعت آکسفرڈ یونیورسٹی نے شروع کر دی ہے اور میں نصف کے قریب پروف دیکھ چکا ہوں۔ یہ پہلا پروف ہے۔ مسٹر ملفورڈ مہتمم یونیورسٹی پریس نے مجھے اطلاع دی ہے کہ کتاب فروری میں چھپ کر تیار ہو جائے گی۔ پروف دیکھتے وقت بعض جستہ جستہ تبدیلیاں ہو گئی ہیں جن میں سے کچھ ضروری ہیں۔ اس واسطے ضروری ہے کہ آپ ترجمہ کی اشاعت میں ان تبدیلیوں کا لحاظ رکھیے۔ بہتر ہے کہ آپ کے ترجمے کی طباعت فروری میں شروع ہو۔ کتاب فی الحال شروع ہو سکتی ہے۔ والسّلام۔

محمد اقبال لاہور

۱۱ ستمبر ۱۹۳۳ء

ترجمے کی اشاعت پھر رک گئی اور حسبِ ارشاد حضرتِ علامہ ملتے فروری ۱۹۳۴

تک ملتوی کرنا پڑا۔ مَیں اب سیالکوٹ میں تھا اَور سیالکوٹ سے لاہور کچھ زیادہ دُور نہیں لیکن عجیب بات ہے باوُجود کوشش کے لاہور نہ جا سکا' حالانکہ حضرتِ علّامہ میری آمد کے منتظر تھے۔ وُہ سمجھے مَیں شاید دہلی میں ہُوں۔ لیکن پھر اس خیال سے کہ کوئی امرِ خاص ہے جس نے مجھے لاہور آنے سے روک رکھا ہے خاموش ہو گئے۔ چُنانچہ آخرِ ستمبر میں جب وُہ افغانستان تشریف لے گئے تو گو اُن کا ارادہ تھا کہ اس سفر میں ذاکر صاحب اَور مجھے بھی اپنے ساتھ شریک کریں لیکن کچھ وقت کی تنگی اَور سفر کی فوری طیاری کے باعث اور کچھ اس لیے کہ اُنھیں ٹھیک معلوم نہیں تھا مَیں ہوں کہاں مجھ کو اطلاع نہ کر سکے۔ بہرحال آخرِ ستمبر میں حضرتِ علّامہ کابل روانہ ہو گئے۔ اکتوبر کا سارا مہینہ افغانستان میں گزرا۔ نومبر میں غزنیں اَور قندھار ہوتے ہُوئے لاہور واپس تشریف لے آئے۔ مَیں نے خیریتِ مزاج دریافت کی تو فرمایا:

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلامُ علیکم۔

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ روڈز لیکچرز[۱۰] کا موضوع زمان و مکان فلسفۂ اسلام کی تاریخ میں ہوگا۔ مَیں نے دعوت قبول کر لی ہے۔ مگر ابھی یقیناً

۹۔ افغانستان سے واپسی کے بعد یہ بات حضرتِ علّامہ نے خود مجھ سے بیان کی جسے سُن کر میری حسرت و افسوس کی کوئی انتہا نہ رہی۔ مَیں نے عرض کیا۔ آپ کا ارادہ تو بھی ہوتا اور مجھے پتہ چل جاتا تو شاید غالب کی زبان میں عرض کرتا:

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضُور کی!

۱۰۔ Rhodes' Lectures

نہیں کہہ سکتا کہ ۲۴ میں جاؤں گا یا ۲۵ میں۔ مضمون مشکل اور دقیق سا ہے۔ وقت لکھنے کے لیے بہت کم ہے۔ بہرحال جو کچھ ہو گا کیا جائے گا۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔

محمد اقبال

۸ نومبر ۱۹۳۳

افسوس ہے اس موضوع پر قلم اٹھانے کی نوبت نہیں آئی۔ اللہ کو کچھ ایسا ہی منظور تھا ورنہ اسلامی، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ انسان کی تاریخِ فکر میں ایک بیش بہا اضافہ ہو جاتا۔ تاریخِ فلسفہ کے لحاظ سے تو یہ مسئلہ جیسا اہم ہے ظاہر ہے، لیکن اسلامی فکر، بلکہ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ خالص اسلامی نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ خطبات (خطبۂ پنجم) میں ایک جگہ حضرتِ علامہ نے لکھا ہے کہ زمان و مکان کا مسئلہ مسلمانوں کے لیے موت و حیات کا مسئلہ ہے اور پھر اپنے اس خیال کی تھوڑی سی وضاحت بھی کر دی ہے۔ لہٰذا یہ مضمون ذرا تفصیل سے بیان ہو جاتا اور متفکرینِ اسلام کے گوناگوں خیالات اور نظریات بھی سامنے آ جاتے تو کیا خوب ہوتا۔ بات یہ ہے کہ زمان و مکان کا ایک سہل سا تصور تو یہ ہے کہ ہم ان کو لمحوں اور نقطوں پر مشتمل سمجھیں، یعنی زمانے کا تصور یوں کریں کہ اس میں ایک لمحے کے بعد دوسرا لمحہ آتا ہے اور مکان کا یوں کہ اسے جس سمت سے دیکھیے نقطوں کے ایک سلسلے پر ممتد ہو گا۔ اب اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو بحث یہ ہے کہ نقطہ کیا ہے اور لمحہ کیا۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ نقطوں اور لمحوں کے دو الگ الگ نظام پہلو بہ پہلو قائم ہیں جیسا کہ قدیم طبیعیات کا خیال تھا مگر جس کے متعلق فلسفہ

کا یہ کہنا ہے کہ نقطوں اور لمحوں کے یہ نظامات محض ہمارے ذہن کی پیداوار ہیں۔ خارج میں ان کا کوئی وجود نہیں۔ دوسرا یہ کہ لمحہ کو نقطے یا نقطے کو لمحہ میں ضم کر دیا جائے۔ پہلی صورت تو ممکن نہیں، اس لیے کہ باوجود نظریۂ اضافیت اس طرح زمانے کی حقیقت سمجھ میں نہیں آئے گی۔ دوسری صورت البتہ ممکن ہے۔ چنانچہ حضرتِ علامہ کی رائے بھی یہی تھی کہ لمحہ نقطے سے مقدم ہے۔ وہ کہتے ہیں نقطہ لمحہ ہی کو دیکھنے کا ایک طریق ہے۔ اسے گویا لمحے کی مرئی تصویر کہیے جو خارج میں پیدا ہو جاتی ہے۔ بہر حال لمحہ کی نفی زمان و مکان کے اس سارے عالم کی نفی ہے جس میں ہم زندگی بسر کرتے ہیں اور جسے اگر مان لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ عالمِ کائنات ایک سراب ہے اور اس لیے حقیقت سے بالکل بے تعلق۔ لہٰذا عملاً اس سے گریز ہی واجب ہے۔ لیکن یہ زمان و مکان کا وہ تصور ہے جسے اسلام کبھی برداشت نہیں کر سکتا، کیونکہ اس کے نزدیک زمان و مکان کی یہ دنیا باطل نہیں، بلکہ حقیقت ہی کی ایک آیت۔ پھر یہی دنیا ہے جس میں اسلام ہمیں زندگی بسر کرنے کا حکم دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ ہم اس میں حصہ لیں اور اس طرح اپنا مقصود و مدعا پورا کریں۔

تین ہفتے اور گزر گئے اور حضرتِ علامہ کا کوئی مکرمت نامہ موصول نہ ہوا، حالانکہ میں نے عرض کیا تھا میں بعض ضروری امور میں مشورہ کے خیال سے لاہور آ رہا ہوں۔ اس اثنا میں جامعہ کی طرف سے بھی ایک خط حضرتِ علامہ کی خدمت میں پہنچ چکا تھا، جسے حضرتِ علامہ نے گویا بواپسی ڈاک مجھے واپس بھیج دیا۔

بواپسی ڈاک بھی اور اس طرح کہ اب کے حضرتِ علامہ نے جو کچھ لکھا اس کی پشت پر لکھا۔ لہٰذا جامعہ کا یہ خط بھی حضرتِ علامہ کے مجموعۂ مکتوبات میں محفوظ ہے۔

ڈیئر نیازی صاحب۔

یہ خط جامعہ کی طرف سے ہے "۔ چونکہ آپ لاہور آنے والے تھے اور جیسا کہ مجھے گزشتہ رات سلامت اللہ شاہ صاحب سے معلوم ہوا جامعہ سے کچھ دل برداشتہ بھی ہیں۔ اس واسطے اس خط کا جواب آپ کے لاہور آنے پر جامعہ کو دیا جائے گا۔ آپ اس خط کو ساتھ لیتے آئیے اور اسے حفظ سے رکھیے۔

والسلام۔

محمد اقبال ۱۵ دسمبر ۱۹۳۳

لاہور

میں واقعی جامعہ سے بددل ہو رہا تھا، اس لیے کہ جامعہ کی تعلیمی اور سیاسی روش سے میرا اختلاف روز بروز بڑھ رہا تھا۔ اختلاف کی وجہ وہی جامعہ کا اسلامی قومیت کی بجائے وطنی قومیت کی طرف رُجحان تھا جس سے ظاہر ہے اسلامی نظامِ تعلیم، علیٰ ہذا اسلامی اُصُولِ حیات پر نوجوانوں کے دل و دماغ کا وہ تصوّر جو بانیِ جامعہ مولانا محمد علی کے ذہن میں تھا لحظہ بہ لحظہ

---

۱۱۔ یہ خط ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب ایم اے۔ پی ایچ ڈی (اس وقت جامعہ پھر لکھنؤ اور اب علی گڑھ یونیورسٹی سے منسلک) نے اردو اکادمی جامعہ ملیہ دہلی کی طرف سے لکھا تھا۔ مضمون یہ تھا کہ خطبات کی طباعت کے بارے میں آپ ہماری درخواست منظور فرما چکے ہیں لہٰذا اجازت دیجیے کہ ہم اس کی طباعت اور اشاعت کا اہتمام کریں۔ مزید یہ کہ حضرت علامہ مجھے ہدایت فرمائیں کہ ترجمے کا مسودہ میں ان کے حوالے کر دوں۔

نظر انداز ہو رہا تھا۔ میں چاہتا تھا لاہور جاؤں اور اپنے مستقبل کے متعلق حضرت علامہ سے مشورہ کروں۔ چنانچہ میں اپنے اس ارادے کی اطلاع سلامت اللہ شاہ مرحوم سے بھی کر چکا تھا، جو بالالتزام حضرتِ علامہ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ معلوم ہوتا ہے انھوں نے بھی میری بددلی کا ذکر حضرتِ علامہ سے کر دیا تھا اور اس لیے حضرتِ علامہ بھی جامعہ کے بدلتے ہوئے حالات کو دیکھ کر کچھ کبیدہ خاطر ہو گئے۔ میں نے جملہ حالات عرض کیے تو فرمایا:

ڈیئر نیازی صاحب۔ آپ کا خط مل گیا ہے۔

بہتر ہے آپ تشریف لائیں گے تو یہ امر طے ہو جائے گا۔ قطعات کے لیے اجازت ہے مگر زیادہ اشعار نہ ہوں اور قطعات بیچے نہ جائیں لیکن بلا اجازتِ مصنف شائع کر دیا جائے (کسی گوشے میں) یہ اور لوگوں کے خلاف ہے جو فوراً چھاپنا شروع کر دیتے ہیں۔ حال میں اس کا تلخ تجربہ ریکارڈوں کے متعلق ہوا۔ والسلام۔

محمد اقبال لاہور

۲۱ دسمبر ۱۹۳۳

قطعات کا اشارہ حضرتِ علامہ کے بعض اشعار کو چھوٹے چھوٹے قطعات کی صورت میں چھاپنے کی طرف ہے۔ میں نے یہ اجازت ذاکر صاحب کے ارشاد پر طلب کی تھی۔ جامعہ اس سے پہلے پیغامِ عمل اور بعض دوسرے عنوانات کے ماتحت چھوٹے چھوٹے قطعات شائع کر چکی تھی جو بڑے خوبصورت اور دیدہ زیب تھے اور ان کو حضرتِ علامہ نے بھی بے حد پسند فرمایا تھا۔ ریکارڈوں

کا قصہ یہ ہے کہ کسی گراموفون کمپنی نے حضرتِ علامہ سے جب یہ درخواست کی کہ اسے ان کی بعض نظموں بالخصوص شکوہ کی صدابندی کی اجازت دی جائے تو شروع میں تو حضرتِ علامہ نے اس درخواست کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی اور شاید بعض مجبوریوں کے عذر میں کمپنی کو ٹال بھی دیا لیکن جب کمپنی نے بار بار اس پر اصرار کیا اور حضرتِ علامہ کو بھی اطمینان ہو گیا کہ اگر ان کے دو چار قطعات کی صدابندی ہو جائے تو قطعِ نظر اس سے کہ اس میں کچھ مالی منفعت بھی ہے ان کے خیالات کا چرچا اور عام ہو جائے گا کیونکہ اس طرح کے ریکارڈ اگرچہ لوگ محض گانے کے شوق میں سنیں گے پھر بھی ان پر کچھ نہ کچھ اثر خیالات کا بھی ہو گا۔ پھر ایک رائے یہ بھی تھی کہ اس طرح عام اور سوقیانہ گانوں سے ہٹ کر کمپنیاں اچھی اچھی نظموں کی صدابندی کرنے لگیں جس سے لوگوں کے ذوقِ سخن اور ذوقِ موسیقی دونوں کی اصلاح ہو جائے۔ لیکن کمپنی کو یہ اجازت ملی تو ایک تو شاید حضرتِ علامہ کو ویسا معاوضہ نہیں ملا جس کا خیال تھا ثانیاً نظموں کے بارے میں جو قید حضرتِ علامہ کی طرف سے عائد کی گئی تھی اس کی پابندی بھی پورے طور پر نہیں کی گئی۔ لہٰذا حضرتِ علامہ کو بالآخر کمپنی سے یہ معاملہ توڑنا پڑا اور آیندہ کے لیے یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ میں یہ سارا واقعہ قیاساً لکھ رہا ہوں۔ تحقیق پر بھی اصل حالات کا پتہ نہ چل سکا اس لیے ممکن ہے میں نے جو باتیں لکھی ہیں ان میں ایک آدھ کی نوعیت قدرے مختلف ہو۔ علی بخش کو بھی یہ واقعہ پورے طور پر یاد نہیں۔ حضرتِ علامہ کے کاغذات کی تحقیق کی جائے تو شاید پورا حال معلوم ہو سکے اتنا بہرکیف یقینی ہے کہ حضرتِ علامہ کا معاملہ جس کمپنی سے ہوا تھا انھیں اس کے طرزِ عمل سے بڑی شکایت تھی جیسا ان کا اپنا ارشاد ہے "مجھے اس بارے میں بڑا تلخ

تجربہ ہوا"۔

رہے قطعات سو میں نہیں کہہ سکتا کہ حضرتِ علامہ نے جامعہ کی درخواست منظور فرمائی تو اس پر اربابِ جامعہ کو کس قدر مسرت ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب، عابد صاحب اور مجیب صاحب نے ذوقِ سلیم نے بعض تصورات کی رعایت سے تھوڑے ہی دنوں میں مختلف اشعار اس طرح ترتیب دیے کہ ان سے بآسانی چند ایک قطعات تیار ہو گئے۔ مقصد یہ تھا کہ بعض حقائق کے بارے میں حضرتِ علامہ کے ارشادات بہ یک نظر شائقین کے ذہن نشین ہو جائیں۔ میں نہیں کہہ سکتا اب ان قطعات میں سے کچھ محفوظ ہیں بھی یا نہیں مگر اس زمانے میں ان کو بڑی محنت سے طبع کیا گیا تھا۔ نہایت اعلیٰ کاغذ پر نہایت مناسب رنگوں اور نہایت درجہ دیدہ زیب نستعلیق بلاکوں میں۔ کتابت کچھ تو جامعہ کے استادِ خطاطی ——— اور ویسے بھی بڑے ماہرِ فن اور استادانِ خطاطی میں سے ایک ——— منشی علی محمد مرحوم فرخ آبادی نے کی کچھ محمد یوسف صاحب دہلوی نے کی۔

○

# ۱۹۳۷

ڈاکٹر بہجت وہبی
آغازِ علالت
ادارۂ طبع و نشر ادبیاتِ اسلامیہ
حکیم عبدالوہاب انصاری مرحوم و مغفور
جنوبی افریقہ کی دعوت
دہلی تشریف آوری
سفرِ سرہند
عزمِ یورپ
مسافر
تعمیرِ مکان (جاوید منزل)
علی گڑھ اور سفرِ علی گڑھ
بیگم صاحبہ کی علالت

جنوری کا مہینہ یونہی گزر گیا۔ میرا اپنا ارادہ بھی لاہور جانے کا تھا۔ بڑا مسئلہ یہ تھا کہ

خطبات کی اشاعت کیسے ہو اور یہ مسئلہ روز بروز ایک عقدۂ لاینحل کی صورت اختیار کر رہا تھا۔ نظرِ ثانی تو ہو چکی تھی لیکن نسخۂ آکسفرڈ کا انتظار تھا۔ خیال یہ تھا کہ اب اس کی اشاعت کا اہتمام حضرتِ علامہ خود ہی کریں گے مگر پھر انہی دنوں ذاکر صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ وسط فروری میں ڈاکٹر بہجت وہبی[1] پیرس سے دہلی آ رہے ہیں۔ ڈاکٹر انصاری صاحب نے بسلسلہ توسیعی خطبات انھیں تشریف آوری پر آمادہ کر لیا ہے۔ میں حضرتِ علامہ سے درخواست کروں کہ حسبِ سابق زیادہ نہیں تو ایک خطبے کی صدارت قبول فرمائیں۔ ڈاکٹر صاحب[2] خود بھی خط لکھ رہے ہیں۔ لیکن میں نے ذاکر صاحب کی درخواست حضرتِ علامہ کی خدمت میں پہنچائی اور حضرتِ علامہ کی طرف سے اس کا جواب موصول ہوا تو سرنامہ اور سوادِ تحریر کو دیکھ کر میرے تعجب کی انتہا نہ رہی:۔

لاہور ۱۲ فروری ۱۹۳۴ء

مکرمی۔ السّلامُ علیکُم۔

آپ کا خط ملا۔ میری طبیعت کئی دنوں سے علیل ہے اس لیے دہلی ڈاکٹر وہبی صاحب کے لکچر کی صدارت کے لیے نہیں جا سکوں گا۔ ڈاکٹر انصاری کا تار بھی آیا تھا مگر میں نے ان کو جواب لکھ دیا کہ میں بوجہ علالت دہلی آنے سے

۱۔ انجمنِ اتحاد و ترقی کے رُکن۔ کمالی دور آیا تو بہ سبب اختلافِ رائے پیرس میں مقیم ہو گئے۔ بڑے پرجوش اور غیور مسلمان تھے۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم کے رفیقِ مدرس رہ چکے تھے۔

۲۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم و مغفور۔

معذور ہوں۔ ڈاکٹر ذاکر صاحب کا خط بھی اسی مطلب کا آیا ہے۔ مَیں علیحدہ ان کو نہیں لکھ سکا۔ آپ ہی انھیں اطلاع دے دیجیے گا۔ نیز آپ کا لاہور آنے کا ارادہ ہو تو زیادہ اچھا یہی ہے کہ اس وقت تشریف لائیں۔ جب مَیں اچھا ہو چکوں گا۔ اُمید ہے آپ کے مزاج اچھے ہوں گے۔ فقط والسلام۔

من راقم

محمد اقبال

مَیں نے اس مکتوب کو ایک نہیں کئی بار لوٹ پوٹ کر دیکھا۔ عنایت نامہ تو حضرتِ علامہ ہی کا تھا لیکن لکھا ہوا کسی دوسرے کے ہاتھ کا[۳]۔ لکھا تھا "میری طبیعت کئی دنوں سے علیل ہے"۔ دل نے کہا کیسی علیل کہ اپنے ہاتھ سے خط بھی نہیں لکھ سکتے۔ بہر حال مَیں نے ذاکر صاحب سے حضرتِ علامہ کی معذوری کا اظہار کر دیا تھا اور ذاکر صاحب کی وساطت سے ڈاکٹر انصاری سے۔ اس بات کا ہر کسی کو افسوس تھا کہ حضرتِ علامہ تشریف آوری سے معذور ہیں۔ مَیں نے اسی دوران خط میں اپنی تشویش کا اظہار کیا اور خیریتِ مزاج دریافت کی جب بھی ہفتہ عشرہ خاموشی رہی۔ بالآخر کوئی دو ہفتے کے بعد ایک والا نامہ صادر ہوا:۔

لاہور ۲۷ فروری ۱۹۳۴ء

ڈیئر نیازی صاحب۔ آپ کا خط مل گیا ہے۔ ڈاکٹر بہت دلچسپی

۳۔ بعد میں معلوم ہوا یہ مکتوب منشی طاہر الدین مرحوم مرحوم "دل نوز" سے لکھوایا گیا تھا۔ وہ حضرتِ علامہ کے پیرو کار تھے۔

صاحب سے نہ مل سکنے کا بہت افسوس ہے۔ میں کئی دنوں سے علیل ہوں انفلوئنزا ہو گیا تھا۔ اب صرف گلے کی شکایت باقی ہے جو ابھی تک صاف نہیں ہوا۔ بہرحال آپ تشریف لے آئیں تاکہ کتاب کی نظرِ ثانی ہو جائے۔ اس کے علاوہ میرا خیال ہے ایک ادارہ قائم کیا جائے جس کا مقصد جدید کتابوں کی اشاعت ہو۔ اچھے لٹریچر کی اشاعت نہایت ضروری ہے۔ آپ بھی اس میں شریک ہو جائیں۔ اور کام کیجیے جو تجویز میرے ذہن میں ہے اس کا ذکرِ مفصل بروقتِ ملاقات ہوگا۔ والسلام

محمد اقبال

اس اثنا میں ڈاکٹر بہجت وہبی خطبات سے فارغ ہو کر واپس تشریف لے جا چکے تھے۔ میں نے اُن کی غیرتِ اسلامی اور حُبِ دینی کا ذکر کیا تو حضرتِ علامہ کو بے حد افسوس ہوا کہ ان سے ملاقات کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ علالت کے متعلق اس وقت تک یہی خیال تھا انفلوئنزا کی شکایت ہے، عید کے موقع پر سویاں اور دہی کھا لینے کے باعث۔

ادارے کا اشارہ "ادارۂ طبع و نشر" کی طرف ہے۔ حضرتِ علامہ کی تجویز یہ تھی کہ عصرِ حاضر کے جدید افکار اور رجحانات کے پیشِ نظر اسلام کی ترجمانی نئے نئے علمی تقاضوں کے علاوہ اس کے عمرانی، تہذیبی اور ثقافتی پہلوؤں کا لحاظ رکھتے ہوئے اس طرح کی جائے کہ عالمِ اسلام میں ذہناً اور عملاً جو انتشار پھیل رہا ہے اس کا ازالہ ہو جائے۔ لیکن اس انداز میں کہ قدیم و جدید کی غلط بحث کو سر اٹھانے کا موقع نہ ملے۔ حضرتِ علامہ کا خیال تھا کہ اس ادارے کی مطبوعات کی

اشاعت اور فروخت کا کام شرکائے ادارہ ہی کی ایک فرم کے سپرد کر دینا چاہیے۔ کیونکہ وہ اس طرح اپنے لیے زیادہ سے زیادہ منافع پیدا کر سکیں گے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فکرِ معاش سے آزادی اور فراغت کے باعث وہ حضرتِ علامہ کی نگرانی میں کچھ ویسی ہی خدمات سرانجام دے سکیں گے جیسی معارفِ اسلامیہ کے کسی ادارے کو سرانجام دینا چاہیے یا جن کے پیشِ نظر علومِ مشرقی کی کانفرنسیں منعقد کی جاتی ہیں۔ چنانچہ ۱۹۳۲ء میں مسلم کانفرنس کا خطبۂ صدارت ارشاد کرتے ہوئے حضرتِ علامہ نے خود بھی تو یہ تحریک فرمائی تھی کہ مسلمانوں کو چاہیے اپنی ذہنی تعمیر کے لیے ایک 'علمی وقف' قائم کریں۔ لہٰذا حضرتِ علامہ کا مکرمت نامہ صادر ہوا تو میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ معلوم ہوتا تھا محمد علی مرحوم نے جامعہ کی بنیاد جس مقصد کے لیے رکھی تھی اس کی تکمیل کا وقت آ پہنچا۔ میں نے حضرتِ علامہ کی صحت یابی پر مبارک باد عرض کی اور اس کے ساتھ اپنے اس ارادے کا اظہار بھی کیا کہ حسبِ ارشاد جلد سے جلد حاضرِ خدمت ہونے کی کوشش کروں گا۔ مگر پھر ہوا یہ کہ فروری اور مارچ میں بعض موانع کے باعث مجھے دہلی ہی میں رکنا پڑا۔ بلکہ آخر الامر لاہور پہنچا تو اپریل میں۔ اس حیص بیص میں خط و کتابت کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ مجھے یک گونہ اطمینان تھا کہ حضرتِ علامہ بفضلہٖ تعالیٰ صحت یاب ہو چکے ہیں اور حضرتِ علامہ اس امر کے منتظر کہ میں کب لاہور آتا ہوں۔ لیکن لاہور پہنچ کر حضرتِ علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھیں بے حد علیل پایا اور ان کے زرد زرد چہرے کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ دریافتِ حالات پر معلوم ہوا کہ قلب کے اوپر ایک رسولی بن رہی ہے جس سے بڑا خدشہ ہے، بلکہ علی بخش نے تو شاید یہ بھی کہا کہ ڈاکٹروں نے ان سے وصیت کے لیے کہہ دیا ہے۔ علاج معالجے کا ذکر آیا اور اس سلسلے میں معالجین کی بددلی کا تو میں

نے عرض کیا ۱۹۲۸ میں گُردوں کی تکلیف بھی تو حکیم نابینا صاحب ہی کے علاج سے دُور ہُوئی تھی، کیوں نہ ان سے رُجوع کیا جائے۔ حضرتِ علّامہ کو میری یہ تجویز پسند آئی۔ فرمایا عجیب بات ہے مجھے اس کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ بہر حال اب جو دہلی واپس جاؤ تو حکیم صاحب سے مرض اور علاج کی ساری کیفیت بیان کرو۔ میں چاہتا ہوں ایلوپیتھک علاج پُورے طور پر آزماؤں، اگر افاقہ نہ ہُوا تو حکیم صاحب ہی سے رُجوع کیا جائے گا۔ میں نے عرض کیا بہت بہتر، بلکہ یہ کہ میں آیا تو کسی اور ارادے سے تھا۔ لیکن اب آپ کی صحت کا یہ حال ہے تو مجھے زیادہ نہیں ٹھہرنا چاہیے۔ ادارے کا خیال بھی اب پُورا ہوتا نظر نہیں آتا تھا۔ میرے لیے یہ امر بڑا تکلیف دہ تھا۔ بہر حال شروع مئی میں بادلِ ناخواستہ دہلی واپس آیا اور آتے ہی حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ حکیم صاحب مرحوم سے معمولی سا تعارف تو اُس وقت سے تھا جب وہ پانچ چھ برس پہلے دہلی تشریف لائے اور حوض قاضی میں مطب کرتے تھے لیکن اب جو یہ عرض کیا کہ "ڈاکٹر صاحب" کا پیغام لے کر آیا ہُوں تو بڑی شفقت اور محبت سے پیش آئے۔ میں نے حضرتِ علّامہ کے مرض اور علاج معالجے کے جملہ حالات عرض کیے اور پھر ان کی رائے اور مشورے کی اطلاع حضرتِ علّامہ کی خدمت میں کر دی۔ یہ کہنا لاحاصل ہے کہ حکیم صاحب مرحوم نے حضرتِ علّامہ کی علالت اور خرابیِ صحت کی ساری رُوئیداد نہایت خاموشی اور توجّہ سے سُنی۔ میں نے انھیں بے حد متردّد پایا۔

دو ہفتے یُونہی گزر گئے۔ میں سمجھ گیا حضرتِ علّامہ ایلوپیتھک علاج آزما رہے اور ڈاکٹر صاحبان کو پُورا پُورا موقع دے رہے ہیں۔ ۲۴ مئی کا مکتوب یہ ہے:

۲۴ مئی ۱۹۳۴

ڈیئر نیازی صاحب۔

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ گلے کی شکایت تو ابھی باقی ہے مگر اب رفتہ رفتہ صحت کی طرف ترقی ہے اور یہ ترقی نمایاں طور پر کل ہی سے شروع ہے۔ علاج ڈاکٹر یار محمد خان صاحب کا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ہندوستانی دواخانہ دہلی میں کوئی شربت ہے۔ جو گلے کی سب بیماریوں کے لیے بہت مفید ہے۔ اگر یہ بات درست ہو تو آپ وہاں سے ایک بوتل شربت بذریعہ وی۔پی میرے نام بھجوا دیجیے۔ میرے خیال میں فی الحال آپ صرف مجموعۂ نظم اور ترجمۂ لیکچرز کے لیے ہی شرائط طے کریں۔ جب ہم اپنا کام بطور ایک فرم کے شروع کریں گے اس وقت دیگر شرائط طے ہوں گے۔ فی الحال جو کام درپیش ہے اس تک محدود رہنا چاہیے۔ آپ معلوم کریں کہ ان دو کتب کے متعلق ان کی ٹرمز کیا ہیں؟ مجموعۂ نظم میری رائے میں پانچ ہزار چھپنا چاہیے۔ آپ ان کی رائے بھی معلوم کریں۔ اس کے صفحات شاید دو سو سے زیادہ ہوں گے۔ سائز وہی ہو گا جو میری کتابوں کا عام طور پر ہوتا ہے۔ یعنی ۲۲ × ۱۷۔ قیمت میرے خیال میں ۸؍ ہونی چاہیے اور اگر صفحات زیادہ ہوں تو زیادہ۔ بہر حال آپ پہلے ان کے ٹرمز معلوم کریں۔ اگر کتابت و کاغذ و طباعت اچھی ہو تو کیا مضائقہ ہے۔ کتاب دہلی میں چھپ سکتی ہے۔ آپ خود نگرانی کریں گے تو اور بھی اچھا ہے۔

محمد اقبال

ہمارے مجوزہ فرم کا خیال ابھی تک قائم تھا، جس سے ایک گونہ اطمینان ہوا۔

علیٰ ہٰذا اس امر سے کہ حضرتِ علامہ کی صحت رُو بہ ترقی ہے۔ تربیتِ صدکی شیشی
میں نے اسی روز بھیج دی۔
مجموعۂ نظم کا اشارہ بالِ جبریل کی طرف ہے۔ ترجمے کا ترجمۂ خطبات یعنی
تشکیلِ جدید کی طرف۔
لیکن ایک ہفتے کے بعد جو گرامی نامہ موصول تھا۔ اس سے صحت کے بارے
میں پھر تشویش پیدا ہو گئی۔

۲۹ مئی ۳۴

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔
آپ کا خط مل گیا ہے۔ کتابیں بھی ولایت سے آگئی ہیں [۲]۔ میں نے علی بخش
سے کہہ دیا ہے کہ وہ ایک کاپی آپ کے نام ارسال کر دے۔ شربت کی بوتل
بھی مل گئی ہے۔ آپ حکیم نابینا صاحب کی خدمت میں پھر میری طرف سے حاضر
ہوں اور بیماری کے حالات عرض کر دیں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ گلے کے نیچے جو آلۂ
صوت larynx ہے اس کا تار ڈھیلا ہو گیا ہے۔ اس وجہ سے آواز بیٹھ
گئی ہے۔ چار ماہ تک علاج ہوا مگر کچھ خاص فائدہ اس سے نہیں ہوا۔ جسم کی
کمزوری بڑھ رہی ہے۔ دردِ گردہ اور نقرس کا حال تو حکیم صاحب کو خود ہی معلوم
ہے۔ دردِ گردہ کا پھر دورہ نہیں ہوا۔ جب سے ان کا علاج کیا ہے آج چھ سال
ہو گئے ہیں۔ اس درد نے پھر تکلیف نہیں دی۔ البتہ نقرس کی شکایت کبھی کبھی

---

۲۔ یعنی خطبات کا نسخہ آکسفرڈ جس کی ایک جلد اگلے روز مجھے مل گئی۔

ہو جاتی ہے۔ بعض ڈاکٹر یہ کہتے ہیں کہ نقرس کا اثر بھی گلے پر پڑ سکتا ہے۔ وَ اللّٰہُ اَعْلَم!

غرض کہ تمام حالات ان کی خدمت میں عرض کر دیں۔ مَیں خود بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتا مگر صحت کمزور ہے اور گرمی سے ڈرتا ہوں۔ باقی خیریت ہے۔

محمد اقبال

حسبِ ارشاد حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ حضرتِ علّامہ کا والا نامہ پڑھ کر سُنایا۔ حکیم صاحب دیر تک خاموش رہے۔ پھر فرمایا بہتر ہو گا "ڈاکٹر صاحب" دہلی تشریف لے آئیں۔ حکیم صاحب کو اُن کی طبیعت اور مزاج کا خوب علم تھا اس لیے مرض کی نوعیت کا بھی اُنھوں نے ایک حد تک بخوبی اندازہ کر لیا تھا۔ مگر وہ چاہتے تھے ایک مرتبہ نبض دیکھ لیں تاکہ تشخیص میں آسانی ہو گی۔ لیکن مَیں ابھی حکیم صاحب مرحوم و مغفور کی رائے گوش گزار کرنے نہیں پایا تھا کہ تیسرے ہی دن ایک اَور گرامی نامہ صادر ہو گیا:—

ڈیئر نیازی صاحب۔

اس سے پہلے ایک خط لکھ چکا ہُوں۔ اُمید ہے کہ آپ حکیم صاحب قبلہ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہوں گے۔ اگر اب تک آپ ان کی خدمت میں حاضر نہیں ہو سکے تو جلد جائیں۔ ڈاکٹروں نے مزید معائنہ کیا ہے اور چھاتی وغیرہ کی ایکس ریز X-ray فوٹو لیے گئے۔ معلوم ہُوا ہے کہ دل کی اُوپر کی طرف ایک نئی growth ہو رہی ہے جس کے دباؤ سے

ووکل کارڈ Vocal chord متاثر ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک اس بیماری کا علاج الیکٹرک ہے اور بہترین الیکٹرک علاج یورپ میں ہی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی اندیشہ ہے کہ اس growth کا اثر پھیپھڑوں پر نہ پڑے۔ اس وقت تک پھیپھڑے اور دل اور دیگر اعضاء اندرون بالکل صحیح اور تندرست حالت میں ہیں۔ ان امور کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ظاہر ہے کہ معاملہ پیچیدہ ہے لیکن میں اس سے پہلے مغربی اطبا کا امتحان کر چکا ہوں۔ حکیم صاحب سے مشورہ کیے بغیر یورپ نہ جاؤں گا اور یورپ کے علاج پر روپیہ خرچ بھی نہیں ہو سکتا۔ پہلے حکیم صاحب کی عنایت سے ہی میں اچھا ہو گیا تھا۔ اب پھر میرا بھروسا انھی پر ہے۔ اگر ضروری ہوا تو میں خود بھی ان کی خدمت میں حاضر ہو کر سب حالات عرض کروں گا۔ جواب جلد۔

محمد اقبال

۲ جون ۳۴

## بڑھاؤ growth اور آلۂ صوت Vocal chord

یہ مکتوب بڑا پریشان کن تھا۔ ضمناً اس سے یہ بھی مترشح ہوتا تھا کہ ایلوپیتھک علاج سے شفا کی کوئی اُمید نہیں۔ اُدھر حکیم صاحب کی رائے تھی کہ حضرتِ علامہ کو قطعی دہلی آنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے پھر عرض کیا کہ حکیم صاحب فرماتے ہیں آپ فوراً دہلی تشریف لے آئیں۔ لیکن میرا عریضہ ابھی لاہور نہیں پہنچا تھا کہ حضرتِ علامہ نے فرمایا:۔

ڈیئر نیازی صاحب - السلام علیکم -

آپ کا پوسٹ کارڈ ابھی ملا ہے۔ اس سے پہلے میں ایک خط آپ کی خدمت میں لکھ چکا ہوں - وہ خط بھی حکیم صاحب قبلہ کو سنا دیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی بتا دیجیے کہ دو دفعہ ڈاکٹروں نے خون کا معائنہ کیا ہے - پہلی دفعہ خون باسلیق سے لیا گیا تھا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ خون میں زہریلے جراثیم ہیں - اور دوسری دفعہ پھر انگلی سے خون لیا گیا - جس کا نتیجہ یہ تھا کہ خون کی حالت بالکل نارمل ہے -

باقی اکس ریز سے جو تصویر لی گئی ہے اس کا حال میں آپ کو لکھ چکا ہوں یعنی یہ کہ تصویر کی رو سے دل کی اوپر کی طرف ایک growth دکھائی دیتا ہے جس نے اس نرو nerve پر دباؤ ڈالا ہے جو دل کی طرف اور حلق کی طرف جاتی ہے۔ اس دباؤ کی وجہ سے ووکل کانڈ کے function میں خلل آگیا ہے - اب آج شام کو معلوم ہوگا کہ علاج کلی طور پر الیکٹرک ہوگا یا انجکشن یا دونوں - بہرحال سب کچھ حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کر دیجیے ان سب حالات کے معلوم ہونے کے بعد معاً تیار ہو تو بہت خوب ہے - یا اگر حکیم صاحب فرمائیں کہ میرا دہلی آنا ضروری ہے تو میں خود حاضر ہو کر تمام حالات زبانی عرض کر دوں۔ اس خط میں ایک اور خط ملفوف ہے جو آپ کے ترجمہ Reconstruction کی پانچ کاپیاں مانگتا ہے -

محمد اقبال

۳ جون ۳۴

لہٰذا میں پھر حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور پھر حضرتِ علامہ کی خدمت میں ایک مفصل خط لکھا۔ مگر ۵ جون کو وہ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر ایک والانامہ رقم فرما چکے تھے :۔

ڈیئر نیازی صاحب ۔ السّلامُ علیکُم۔

ابھی ایک خط ڈاک میں ڈال چکا ہوں۔ بعض باتیں فراموش کر گیا تھا۔ اب لکھتا ہوں۔ حکیم صاحب سے دریافت کر کے فوراً مطلع کر دیں۔ میرا معمولی کھانا حسبِ ذیل ہے :۔

(۱) صبح مکھن توس اور ایک انڈا نیم برشت یا نیم بائیل مع چاء۔

(۲) گیارہ بجے دوپہر کھانا۔ گوشت سبزی اور کبھی کبھی پلاؤ۔ یا پلاؤ۔
اس کے بعد آم بھی کھاتا ہوں۔

(۳) چار بجے کے قریب بادام مقشر کی کھیر۔

(۴) شام کو صرف نمکین چائے یا کھیر دلیا مع دودھ۔

آم اور بیموں کے متعلق ہدایت مل گئی ہے۔ اس کے مطابق آیندہ عمل کروں گا۔ یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ کون کون سا پھل بھی کھا سکتا ہوں۔ چائے اور انڈے کے استعمال کے متعلق ارشاد ہدایت کیا ہے۔ کوئی مزید چیز کھانے کے متعلق فرمائیں تو مطلع فرمائیں۔

شربت صدر جو آپ نے ارسال کیا تھا میں نے ابھی تک استعمال نہیں کیا۔ یہ بھی تحریر فرمائیں کہ آیا استعمال کیا جائے یا نہیں۔ نیز حکیم صاحب اور اپنے امریکی دوست سے دریافت کریں کہ وہ اس growth کے متعلق کیا کہتے ہیں۔

جس کا ذکر میں نے پہلے خطوں میں کیا ہے اور جس کو ڈاکٹر صاحب بیماری کی اول علت قرار دیتے ہیں۔ بلغم کے متعلق لکھ چکا ہوں زیادہ مرکب بلغم نکلتی ہے۔ کبھی کبھی منجمد بھی آتی ہے مگر کم۔ شام کے قریب بالعموم بہت بھاری ہو جاتی ہے۔ بات آہستہ کر سکتا ہوں اونچی آواز بالکل نہیں نکل سکتی نہ صبح نہ شام۔ کہتے ہیں ایکس ریز ایکسپوژر سے یہ گرہ یا تو تحلیل ہو جائے گی یا اس کا نشوونما رک جائے گا۔ کیا یہ حکم ہے کہ حکیم صاحب دوا کے استعمال کے ساتھ ساتھ یہ علاج بھی جیسا کہ لاہور میں موجود ہے کیا جائے؟

پیاس ہو تو کیا پیا جائے۔ کوئی شربت یا کچھ اور۔ برف کے استعمال کے متعلق کیا ہدایت ہے۔ فی الحال میں ایک صراحی میں جو مکہ شریف سے ایک شخص تحفہ لایا تھا پانی سرد کر لیا کرتا ہوں۔ والسلام۔

محمد اقبال ۵ جون ۳۴

"مکہ شریف کی صراحی" بظاہر یہ سادہ سے الفاظ ہیں لیکن ان جذبات سے مملو جو اہلِ دل کے اندر حرمِ پاک کے ذکر سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ یوں بھی وہ کب سے خانۂ کعبہ کی زیارت اور روضۂ رسول صلعم پر حاضری کے آرزومند تھے۔ پھر جیسے جیسے مرض میں اضافہ ہوا ان کا یہ اضطراب بڑھتا ہی چلا گیا کہ کہیں ایسا نہ ہو فریضۂ حج کی ادائیگی سے محروم رہ جائیں۔

اس اثنا میں حکیم صاحب کی تجویز کردہ دوائیں حضرت علامہ کی خدمت میں بھیج چکا تھا۔ حکیم صاحب بدستور مصر تھے کہ حضرت علامہ دہلی آئیں مگر پھر اسی روز کا ایک دوسرا خط ہے:-

لاہور۔ ۵ جون ۳۴ء

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ الحمد للہ کہ خیریت ہے۔ میرے تمام احباب کو تشویش ہے۔ اور میرے معالجوں کو بھی۔ مگر میں خود حکیم صاحب قبلہ پر کامل اعتماد رکھتا ہوں۔ اور موت و حیات کو اللہ کے ہاتھ میں سمجھتا ہوں۔ آپ کے خط سے یہ نہیں معلوم ہوا کہ آیا آپ نے میرا دوسرا خط بھی حکیم صاحب کی خدمت میں پیش کیا یا نہیں۔ اس خط میں میں نے لکھا تھا کہ کرنل ڈِک صاحب کے نزدیک دل کے اوپر کی طرف ایک نئی growth پیدا ہو گئی ہے جس نے نرو پر دباؤ ڈال رکھا ہے اور اس دباؤ کی وجہ سے آلۂ صوت کا بایاں تار بیکار ہو گیا ہے۔ اس کا علاج ان کے نزدیک یا تو ریڈیم سے ہوگا یا ایکس ریز سے اور یہ دونوں علاج یورپ میں ہی بہتر ہو سکتے ہیں۔ بہرحال ڈک صاحب اور دوسرے ڈاکٹر یہی سمجھتے ہیں کہ یا تو فوراً ویانا (آسٹریا) یا لندن جانا چاہیے تاکہ علاج مذکورہ سے اس growth کا مزید نشوونما رک جائے یا کُل ایکس ریز یا ریڈیم سے تحلیل ہو جائے۔ ان کے نزدیک اگر اس growth کی طرف توجہ نہ کی گئی تو زندگی خطرے میں ہے۔ کیونکہ ممکن ہے یہ growth بڑھ کر پھیپھڑوں پر بھی اپنا دباؤ ڈالے یا کسی اور طرح ان کے عمل پر موثر ہو۔ گروتھ جس کا اوپر میں نے ذکر کیا ہے ایکس ریز کی تصویر لینے سے معلوم ہوئی۔ اس سے پہلے معلوم نہ تھی اور ڈاکٹر صاحبان ووکل کارڈ کے ضعف کے اصلی سبب کے متعلق اندھیرے میں تھے۔ ممکن ہے اب تک وہ اندھیرے ہی میں ہوں اور اس growth کا بھی اس سے کوئی

تعلق نہ ہو۔ لیکن چونکہ تصریح سے آپ ہی معلوم ہوتا ہے اور یہ لوگ تصوّر پر ایمان رکھتے ہیں اس واسطے ان کے نزدیک اصلی علت بیماری کی یہی ہے۔ معلوم نہیں آپ نے حکیم صاحب سے اور اپنے امریکن دوست سے اس growth کا ذکر کیا یا نہیں کیا۔ حکیم صاحب اس کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟ (بلغم بھی نکلتی ہے مگر کبھی کبھی خون ملا بلغم بھی نکلتی ہے مگر بہت کم)۔ والسلام۔ باقی میری عام صحت بالکل اچھی ہے اور کسی قسم کی شکایت نہیں۔ دل اور پھیپھڑے دونوں اب تک بالکل تندرست ہیں۔ ان کا بارہا معائنہ کیا گیا ہے۔

محمد اقبال

حکیم صاحب کو تمام حالات معلوم ہونے چاہئیں۔ میں خود بھی چند روز دوا استعمال کرنے کے بعد حاضر ہوں گا۔

کل شام ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اگر حکیم صاحب کامیاب ہو گئے تو یہ اُن کا بڑا معجزہ ہوگا۔

اِس گرامی نامے کے مندرجات بھی حرف بحرف حکیم صاحب کی خدمت میں پہنچا دیئے گئے۔ لیکن اُنھوں نے رسولی کے نظریے سے اِتفاق نہیں کیا اور میرے امریکی دوست کی رائے بھی یہی تھی[۲]۔ بہرحال ایلوپیتھک طریقۂ تشخیص کے ذریعہ (جن سے حضرت علامہ برابر فائدہ اُٹھا رہے تھے) جب اس امر کی تحقیق ہو گئی کہ قلب

---

۲۔ ڈاکٹر [illegible] شرما، ایم۔ ایس، ایم۔ ڈی جو امریکہ اور لندن سے فارغ التحصیل ہو کر آئے تھے۔ حضرت علامہ انھیں میرے امریکی دوست ہی کہا کرتے تھے۔

کے اوپر ایک دسولی بن رہی ہے تو انھیں بڑی تشویش ہوئی اور احباب نے رائے دی کہ وہ یورپ کے کسی اعلیٰ طبی مرکز، مثلاً ویانا تشریف لے جائیں۔ مگر حضرتِ علامہ کو شعاع ریزی کے نتیجے کا انتظار تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ڈاکٹر صاحبان کا آخری فیصلہ معلوم ہو جائے تو وہاں تشریف لے جائیں۔ دراصل حضرتِ علامہ کا اپنا رجحان طب ہی کی طرف تھا اور اس کی وجہ تھی کچھ تو ماضی کے ساتھ اُن کا جذباتی لگاؤ، کچھ ذاتی تجربہ۔ مثلاً یہی درد گردہ کی تکلیف جو حکیم صاحب مرحوم کے علاج سے رفع ہوئی اور جس کی بنا پر وہ سمجھتے تھے کہ ڈاکٹری طریقِ علاج کو دوسرے طریقوں پر وہ مطلق برتری حاصل نہیں جس کا اُسے دعویٰ ہے۔ ان کا تو یہ بھی خیال تھا کہ اگر اطبا زیادہ کاوش اور محنت سے کام لیں تو بہت ممکن ہے انھیں اپنے یہاں ایسی مؤثر اور کارگر دوائیں مل جائیں جن کو فی الواقعہ 'اکسیر' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ پھر اگر اس ملک کی آب و ہوا، عادات و خصائل، غذا اور طرزِ زندگی کا لحاظ رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو طبی علاج شاید ڈاکٹری طریقِ علاج سے کچھ بہتر ہی ثابت ہوگا۔ مگر پھر ایک اور جہت سے انھیں طبی علاج ہی مرغوب تھا اور جس میں ان کے فلسفۂ حیات کو بڑا دخل ہے۔ ان کے نزدیک ڈاکٹری علاج کچھ بڑا مادی اور میکانکی قسم کا علاج تھا جس میں بدن کو محض ایک مشین سمجھتے ہوئے صاحبِ بدن کے مزاج اور طبیعت کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ ڈاکٹری دواؤں کی ترکیب اور تیاری دونوں میں نفعِ عامہ کی بجائے تجارتی اور کاروباری اغراض کا غلبہ ہے۔ اس کے برعکس طبی دوائیں ہیں کہ ان سے تجارت اور کاروبار میں کچھ زیادہ مدد نہیں ملتی۔ پھر یہ طریقِ علاج انسان کو انسان سمجھتا ہے اور مرض کے ازالے میں اس کے مزاج اور طبیعت، علیٰ ہٰذا خیالات اور جذبات ہر بات کا لحاظ رکھتا ہے۔ لہٰذا اس

کا نقطۂ نظر ڈاکٹری علاج سے زیادہ معقول ہے۔ بہر حال ۸ جون کا والا نامہ ہے:-

لاہور۔ ۸ جون ۳۴

ڈیئر نیازی صاحب۔ السّلام علیکم۔

آپ کا خط ابھی ملا۔ تشویش صرف اس بات کی تھی کہ دل کے اوپر کی طرف جو خالی area ہوتا ہے وہاں ڈاکٹر ایکس ریز کی تصویر کو دیکھ کر ایک growth بتلاتے ہیں جس کا بہتر علاج ان کے نزدیک ایکس ریز ایکسپوژر یا ریڈیم ہے جو یورپ میں میسر آئے گا۔ آج معلوم ہوا کہ بعد بحث مباحثہ خود ان میں بھی اختلاف ہوگیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ خود حاضر ہو کر حکیم صاحب کی خدمت میں کُل حالات عرض کر دوں۔ اس واسطے دو چار روز حکیم صاحب قبلہ کی دوا استعمال کر کے حاضر ہوں گا۔ میرا ارادہ صرف ایک روز آنے کا ہے۔ صبح وہاں پہنچوں گا اور اسی وقت حکیم صاحب سے مل لوں گا۔ شام کی گاڑی یا اس سے پہلے کسی گاڑی میں واپس آجاؤں گا۔ وہاں قیام کا ارادہ نہیں ہے۔ ہاں اگر حکیم صاحب فرمائیں کہ علاج کے لیے قیام ضروری ہے۔ مجھے صرف تشویش اس growth کی وجہ سے ہے باقی میری تمام صحت اس وقت تک خدا کے فضل سے اچھی ہے۔ صرف آواز اونچی نہیں نکل سکتی۔ اگر دہلی میں قیام ضروری نہ ہوا تو اسٹیشن پر ہی چند گھنٹے قیام کروں گا۔ والسلام۔ چلنے سے پہلے آپ کو خط لکھوں گا یا تار دے دوں گا۔

محمد اقبال

لہٰذا ڈاکٹر صاحبان کی رائے میں اختلاف ہوا تو حضرتِ علامہ نے زحمتِ سفر اُٹھائی اور ۱۱ کی صبح کو دہلی تشریف لائے۔ حکیم صاحب قبلہ کو میں نے پہلے سے اطلاع

کر دی تھی اور وہ گویا حضرتِ علامہ کے اِنتظار میں چشم براہ تھے۔ حضرتِ علامہ تشریف لائے تو حکیم صاحب نے حکم دیا کہ مطلب خالی کر دیا جائے۔ صرف ان کے نُسخہ نویس یا ذاتی ملازم باقی رہ گئے۔ حکیم صاحب اُٹھنے سے معذور تھے۔ حضرتِ علامہ نے آگے بڑھ کر مُصافحہ کیا۔ حکیم صاحب بھی سرتاپا تواضع اور انکسار تھے۔ بڑی محبت اور دِلسوزی سے پیش آئے۔ بڑی توجّہ اور ہمدردی سے حال سُنا۔ پھر نبض دیکھی، نُسخہ تجویز کیا، دوائیں منگوائیں اور ضروری ہدایات دیں۔ حضرتِ علامہ نے شکریہ ادا کیا۔ پھر اسٹیشن تشریف لے آئے جہاں شام تک اُن کا قیام رہا۔ اگلے روز صُبح لاہور پہنچتے ہی مفصّل خط لکھا:۔

۱۲ جون ۳۴

ڈیئر نیازی صاحب۔

مَیں بخیر الخیر لاہور پہنچ گیا۔ سفر میں تو آواز کی حالت کچھ ویسی ہی رہی مگر لاہور پہنچ کر تمام دِن (سوائے شام) آواز کی حالت بہ نسبتاً سابقہ بہتر رہی۔ حکیم صاحب سے مندرجہ ذیل اُمور دریافت کر کے مطلع فرمایئے:۔

(۱) تربوز کھاؤں یا نہ کھاؤں ؟

(۲) دہی اور اُس کے آمائتہ اور لسّی کے مُتعلّق کیا ہدایت ہے ؟

(۳) کسی سرد مقام مثلاً مری، شملہ وغیرہ جانا اور وہاں قیام کرنے کے مُتعلّق کیا ہدایت ہے ؟

(۴) اُنھوں نے فرمایا تھا کہ شربت بنفشہ اور عناب صُبح پیا جائے مگر صُبح دوائی نہار کھانی پڑتی ہے۔ اِس کے تھوڑے عرصے بعد پھر

ناشتہ کے ساتھ دُوسری دوائی ۔ شربت کے لیے کوئی وقت نہیں
ہوتا ۔ پھر شربت کس وقت پیا جائے ؟ تیسرے پہر اگر بنفشہ یا عناب
یا دیگر شربت جو آپ نے خریدے تھے پیے جائیں تو کیا ہرج ہے ؟
(۵) صُبح جو دوائی کھائی جاتی ہے وہ پاخانہ کی فراغت کے بعد کھائی جاتی
ہے پہلے بھی کھا سکتے ہیں ؟ یہ سوال اس واسطے کیا ہے کہ بعض دفعہ
پاخانہ دیر سے آتا ہے ۔

(۶) خشک چاول کھانے کے متعلق کیا ہدایت ہے ؟ (۷) دالوں میں
کونسی دال کھائی جائے اور کس سے پرہیز کیا جائے ؟ (۸) کشمیر
کے مشہور گلاس کے متعلق کیا ہدایت ہے ۔ اس میں کسی قدر ترشی
ہوتی ہے ۔ علیٰ ہٰذا القیاس آلوچہ کے متعلق کیا حکم ہے ؟
باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے ۔ پبلشرز کے ساتھ جو گفتگو ہو
اُس سے بھی مطلع کریں ۔ والسلام

محمد اقبال

اور پھر ۱۳ کو ایک اور جس میں چند اور باتیں لکھی تھیں :۔

۱۳ جون ۳۴ء

ڈیئر نیازی صاحب ۔ السلامُ علیکم ۔
کل ایک خط لکھ چکا ہوں ۔ دریافت طلب اُمور کا جواب حکیم صاحب سے
معلوم کر کے لکھیے ۔
آج دوائی کا چوتھا روز ہے ۔ آواز میں کچھ فرق ضرور ہے ۔ مگر گلا مقابلۃً

خشک ہے اور بلغم کسی قدر دِقت سے نکلتی ہے۔ منجمد بلغم کم نکلتی ہے۔ کچھ بلغم زیادہ نکلتی ہے۔ میرا یہ خیال ہے کہ شاید اندر منجمد بلغم ہے اگر وہ آسانی سے نکل جائے تو آواز میں نمایاں فرق ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ ریح کا اخراج تو ہوتا ہے مگر کسی قدر قبض ضرور ہے پاخانہ کھُل کر نہیں آتا۔ زیادہ خیریت ہے۔ والسلام۔

محمد اقبال

مَیں بالالتزام حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہو رہا تھا۔ حضرتِ علامہ کے علالت نامے پڑھ کر سناتا، دعائیں اور ضروری ہدایات حاصل کرتا اور پھر حضرتِ علامہ کی خدمت میں ایک ایک بات کی اطلاع کر دیتا۔ نغمے اور مجموعۂ نظم کی اشاعت اور طباعت کے بارے میں بھی گفتگو جاری تھی۔ رہی یہ بات کہ اب جو مَیں نے حضرتِ علامہ کی خدمت میں خط لکھا اور اس میں اپنے مرحوم دوست سیّد سلامت اللہ شاہ کے توسّط کی ضرورت کیوں پیش آئی کچھ ٹھیک یاد نہیں پڑتی۔ شاید اس لیے کہ مجھے حضرتِ علامہ کی طرف سے اپنے عریضے کے جواب کا انتظار تھا۔ مَیں سمجھا میرا عریضہ شاید اُن کی خدمت میں نہیں پہنچا۔ لہٰذا بتقاضائے احتیاط مَیں نے اپنے عزیز دوست کا سہارا ڈھونڈا۔ ایک تو اس لیے کہ ان کا قیام حضرتِ علامہ کے قریب ہی تھا (میکلوڈ روڈ والی کوٹھی سے) ثانیاً وہ بالالتزام ان کی خدمت میں حاضر رہتے۔ بہر حال ۱۶ جون کا گرامی نامہ ہے:-

۱۶ جون ۳۴

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ کا خط سلامت اللہ شاہ صاحب کی وساطت سے مل گیا ہے۔

آج ساتواں روز ہے۔ گویا آج شام کو سات روز ہو جائیں گے۔ میں صبح کی نماز کے بعد آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔

(۱) پہلے میں لکھ چکا ہوں کہ بلغم کچھ نکلتی ہے۔ اب ناک کی راہ سے بھی کچھ کچھ نکلتی ہے۔ مجھے ایسے احساس ہے کہ اندر بلغم ہے اگر آسانی کے ساتھ اندر سے ہو کر نکل جائے تو یقیناً فائدہ ہوگا۔

(۲) گلے کے اندر خارش سی خصوصاً دائیں طرف معلوم ہوتی ہے۔ اس سے پہلے یہ کبھی نہیں ہوا۔ کہتے ہیں خارش صحت کی علامت ہے۔ واللہ اعلم۔

(۳) ان دنوں میں آواز میں فرق ضرور آیا ہے مگر ایسا نہیں جس کو سب لوگ نوٹ کر سکیں۔

(۴) قبض کی کسی قدر شکایت ہے پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔

(۵) گلابی رنگ کی گولی حکیم صاحب نے ریح کے لیے دی تھی جو کھانے کے بعد کھائی جاتی ہے۔ اُس وقت میں نے شکایت کی تھی کہ ریح جمع ہو کر تکلیف دیتی ہے۔ وہ چار روز کے بعد استعمال سے ریح کی شکایت جو اُس وقت تھی دُور ہو گئی تھی اب وہ شکایت باقی نہیں۔ پھر وہ گلابی رنگ کی گولی کھانے کے بعد کھائی جائے یا اس کا استعمال اب چھوڑ دیا جائے؟

یہ تمام اُمور حکیم صاحب قبلہ کی خدمت میں عرض کر دیجیے اور نیز یہ بھی عرض کر دیجیے کہ اگر کوئی اور دوا اس سے زیادہ طاقتور ہو تو عطا فرمائیں کیونکہ یہاں کے تمام احباب منتظر ہیں کہ کب ڈاکٹروں کو شکست ہوتی ہے۔ یہ عجیب معاملہ ہے بہر حال اگر موجودہ نسخے میں کوئی ترمیم ضروری ہو تو حکیم صاحب خود سمجھیں۔ اب

پانچ روز کی مدا باقی ہے۔ اب خود اندازہ کر کے مدا بھجوا دیں۔ والسلام۔

پبلشرز کے متعلق جلد طے کریں کیونکہ یہاں کے لوگ بھی اصرار کر رہے

ہیں۔ مَیں نے عبدالمجید کاتب کو فی الحال دو چار دن کے لیے ٹال دیا ہے۔

محمد اقبال لاہور

جیسا کہ قارئین کو خود ہی اندازہ ہو گا کہ حضرتِ علامہ کو ایک ایک بات میں تفصیل سے کام لینا پڑتا۔ وہ طرح طرح کے سوال کرتے اور ان کا جواب مانگتے۔ اس لیے کہ ان کے اور حکیم صاحب کے درمیان ۳۰۰ میل کا فاصلہ حائل تھا۔ بہتر تو یہ ہوتا کہ حضرتِ علامہ دہلی جا سکتے، یا حکیم صاحب مرحوم کا قیام لاہور میں ہوتا۔ لیکن دونوں میں کوئی بات ممکن نہیں تھی۔ لہٰذا حضرتِ علامہ چاہتے تھے کہ اس جسمانی دوری کی تلافی جو انھیں حکیم صاحب سے تھی ہر اُس امر کی تشریح و تفصیل سے کریں جو انھیں اپنی دانست میں ضروری معلوم ہوتا تھا۔ وہ چاہتے تھے حکیم صاحب کی نظر ان کے مرض اور مرض سے متعلق جملہ عوارض پر ایسے ہی رہے جیسے گویا وہ روزمرہ خود ان کو دیکھ کر اندازہ کرتے۔ بہرحال حضرتِ علامہ ان تفصیلات پر مجبور تھے۔ یوں بھی کہا جاتا ہے مریض کا تعلق معالج سے ایسا ہونا چاہیے جیسے 'کالمیّت بینِ الغسّال'

لیکن مَیں ابھی حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے نہیں پایا تھا کہ اگلے روز ایک اور گرامی نامہ صادر ہوا۔

۱۷ جون ۳۴

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ کا خط آج مل گیا جس کے لیے بہت شکرگزار ہوں۔

سمرنا کی انجیر بہت تلاش سے ایک پنساری کی دوکان سے ملی ہے جو دیکھنے میں نہایت مخدوم ہے اور پچھلے سال کی ہے۔ حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کریں کہ یہ ممکن نہیں کہ کاسر الریاح (گلابی رنگ کی گولی) کی جگہ کوئی قبض کشا رکھ دی جائے۔ کیونکہ ریاح کی تکلیف اب جاتی رہی ہے۔ کاسر الریاح کے متعلق میں اپنے پہلے خط میں بھی لکھ چکا ہوں۔

آواز میں جیسے کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں فرق آگیا ہے۔ عجب معاملہ ہے جس سے انسانی ضمیر کے اندر جو کچھ گذر رہا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ لوگ میری بیماری میں محض اس واسطے دلچسپی لے رہے ہیں کہ دیکھیں ڈاکٹروں کو کب شکست ہوتی ہے۔ بہرحال جو کچھ میں گذشتہ خط میں لکھ چکا ہوں حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کر دیں کہ اب کی دفعہ کوئی اس سے زیادہ طاقتور دوا ہو تو اور بھی اچھا ہے۔ معجزہ کا ظہور جلد ہو۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ حکیم صاحب اوقاتِ خاص میں مجھے بھی یاد رکھیں۔ والسلام۔

محمد اقبال

اوقاتِ خاص کا سن کر حکیم صاحب بے قرار ہو گئے۔ وہ بڑے عبادت گزار اور صوفی منش بزرگ تھے۔ شب و روز اوراد و وظائف میں مشغول رہتے۔ تسبیح سے تو ہاتھ کبھی خالی نہ ہوتا۔ یہ حضرت علامہ کا تعلق باللہ تھا، اُن کا جذب و گداز اور عجز و نیازمندی کہ وہ اہل اللہ سے ہمیشہ دُعا کی درخواست کرتے۔ پھر اوقاتِ خاص وہ لمحے ہیں جب عبد کے سامنے بجز اپنے معبودِ حقیقی کے اور کوئی نہیں ہوتا اور اس لیے ظاہر ہے ان اوقات میں کسی دوسرے کی یاد خلوص و محبت کی انتہا ہے۔ حکیم صاحب نے یہ الفاظ سنے

تو بار بار ہاتھ اٹھائے اور حضرتِ علامہ کے لیے دعا کی۔

اب ایک طرف حکیم صاحب کی ہدایات تھیں، دوسری جانب حضرتِ علامہ کا سلسلۂ استفسارات۔ یوں قرول باغ سے جامع مسجد (جہاں حکیم صاحب مطب فرماتے) اور جامع مسجد سے قرول باغ کی آمد و رفت میرا روز کا معمول بن گیا۔ حضرتِ علامہ کی بحالیٔ صحت کا مسئلہ واقعی ایک معجزے کی شکل اختیار کر چلا تھا اور لوگ واقعی اسے قدیم اور جدید طب کے درمیان ایک زبردست (بلکہ فیصلہ کن) جنگ تصور کرتے تھے۔ جس کی بڑی وجہ میرے نزدیک یہی ہے کہ قطعِ نظر اصولی اور علمی بحث کے اس مسئلے نے ایک "تہذیبی" (ثقافتی۔ کلچرل) مسئلے کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ڈاکٹری طریقِ علاج، ڈاکٹری دوائیں، ڈاکٹر کی شخصیت اور نقطۂ نظر شروع شروع میں تو واقعی بڑا غیر مانوس ہو گا، اس لیے کہ یہ فن باہر سے آیا تھا لیکن امتدادِ زمانہ سے لوگ بہت کچھ اس سے مانوس ہو چکے تھے اور پھر ڈاکٹر صاحبان کو بھی آخر اپنی قوم اور تہذیب کا اتنا ہی پاس تھا جتنا کسی اور کو۔ بایں ہمہ قدیم طب پر جدید طب کی مطلق برتری کا دعویٰ لوگوں کو بہت ناگوار گزرتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ طبِ قدیم اگرچہ بوجوہ زبوں حال ہے لیکن اس کو ذرا سا سہارا مل جائے تو طبِ جدید کے پہلو بہ پہلو اپنی ایک حیثیت قائم کر سکتی ہے۔ لہٰذا وہ منتظر رہتے کہ کہاں اور کس طرح قدیم طریقِ علاج کو جدید طریقِ علاج پر فتح حاصل ہوتی ہے۔

اس اثنا میں حضرتِ علامہ کی طبیعت بہت کچھ بحال ہو چلی تھی۔ چنانچہ اب جو میرا عریضہ اور دوائیں ان کی خدمت میں پہنچیں تو ارشاد ہوا:

عزیز نیازی صاحب! السلام علیکم۔

دوا کا پارسل ابھی ملا ہے جس کے لیے حکیم صاحب کی خدمت میں بہت

بہت شکریہ عرض کیجیے۔ ان سے کہیے کہ آپ انصار ہیں میں مہاجر ہوں سے ہوں کیونکہ میں نے زمانۂ حال سے خیرالقرون کی طرف ہجرت کی ہے۔ جسمانی نہیں تو روحانی اعتبار سے ہی سہی۔ اس واسطے میرا ان پر حق ہے اور میں ان سے اسی سلوک کا متوقع ہوں جو انصار نے مہاجرین سے کیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی میں ان کی کرامت کا مستحق ہوں۔ کہ مستحق کرامت گناہگارانند۔ میری مجموعی صحت بہت اچھی ہے۔ دن میں تین چار دفعہ چھینک بھی آتی ہے۔ بعض دفعہ ناک سے بھی بلغم نکلتی ہے۔ گلے میں خراش بھی ہے جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں نیند بھی رات کو خوب آتی ہے۔ البتہ آواز کے کھلنے کی رفتار کسی قدر سست ہے۔ آج چلغوزہ کھایا ہے۔ تازہ انجیر کی تلاش جاری ہے۔ سردہ کا موسم ابھی شروع نہیں ہوا۔ لیکن ترشی کے لیے ترس گیا ہوں۔ لیموں کو تو میں ہاتھ لگاتا نہیں۔ کیونکہ حکیم صاحب نے منع کر دیا ہے مگر کیا اور قسم کا پھل بھی منع ہے؟ دہی کی اجازت حکیم صاحب نے دی تھی لیکن اس میں بھی ترشی ہے۔ اس واسطے ڈرتا ہوں۔ ایک روز دہی کا آمیزہ کھایا تھا مگر وہ دہی اس قدر میٹھا تھا کہ آمیزہ میں کوئی لطف نہ تھا۔ پودینہ اور انار دانہ کی چٹنی کے لیے کیا حکم ہے؟ بٹیر بھی مارکیٹ میں نہیں ملے تھے۔ چوزہ کا گوشت کھایا ہے مگر گرمی اس قدر ہے کہ بھوک نہیں لگتی۔ والسلام۔

محمد اقبال ۲۰ جون ۳۴

"ہجرت الی الخیر القرون" کا سن کر حکیم صاحب بے حد متأثر ہوئے۔ فرمایا میں تو ہمیشہ ان کے لیے دست بدعا رہتا ہوں۔ بے شک ان کا مجھ پر حق ہے۔ باقی سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ہم اپنی طرف سے ہر ممکن تدبیر کر رہے ہیں۔

یہ درِاصل حضرتِ علامہ کا جذبۂ شکر گزاری و احسانمندی تھا کہ اُنھوں نے حکیم صاحب کی مخلصانہ توجّہ، مروّت اور محبت کو اس بے غرض ایثار اور قربانی پر محمول کیا جو انصارِ مدینہ نے مہاجرینِ مکّہ کے لیے کیا تھا۔ پھر انصار اور مہاجرین کی مثال بھی دی تو اس لیے کہ حضرتِ علامہ کی سیرت اور شخصیت جس طرح اسلام کے سانچے میں ڈھل گئی تھی اس کا تقاضا تھا کہ ان کے تعلقات اور روابط کی دُنیا میں بھی انھیں عواطف اور جذبات کی کارفرمائی ہو جو لوجہ اللہ انسان کے دِل میں پیدا ہوتے ہیں اور جن کی بِنا پر اس کی بے غرض محبت — خواہ اس کی سطح، اس کا موضوع اور اس کا محل کچھ بھی ہو — ایک مشترک نصب العین، ایک اعلیٰ و ارفع مطمحِ نظر اور بالخصوص تعلق باللہ کے ماتحت ایک ایسے اُصول پر مرتکز ہو جاتی ہے جو نوعِ انسانی کے لیے ایک سرچشمۂ خیر، ایثار اور ہمدردی بن جاتا ہے۔ اس پر حضرتِ علامہ کا دِلی انکسار اور حکیم صاحب کے خلوص و توجّہ کا اعتراف ان کے اخلاقِ عالیہ کا ثبوت ہے۔ یہ اس لیے کہ احسانمندی ایک فضیلت ہے (من لم یشکر النّاس لم یشکر اللّٰہ) اور جب ہی پیدا ہوتی ہے جب ایک طرف خلوص اور بے غرضی ہو، دوسری جانب حُسنِ سلوک کی پذیرائی۔ درِاصل احسان اور شکر کے جذبات زندگی کی گہرائیوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے ناقابلِ فصل ہیں اور ان سے خودی کے اِستحکام اور تقویت کا سامان پیدا ہوتا ہے۔

"رُوحانی نہیں تو دماغی اعتبار سے ہی سہی"۔ ان الفاظ کی صحت میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔ اور کسے معلوم ہے کہ ان کی بدولت کتنے انسانوں نے رُوحانی نہیں تو دماغی اعتبار سے خیرالقرون کی طرف ہجرت کی۔ یوں بھی یہ ہجرت اس ہجرت سے کہیں زیادہ مشکل ہے جو مقامی اعتبار سے کی جاتی ہے۔ حضرتِ علامہ کے ان الفاظ سے تو راقم الحروف کا ذہن

مولینا رومؔ کے اُن اشعار کی طرف مُنتقل ہو گیا جو اُنھوں نے رجعنا من جهاد الاصغر الی جهاد الاکبر کے زیرِ عنوان غزوۂ خیبر کے ذکر میں لکھے ہیں اور جن کا مطلب یہ ہے کہ کسی مضبوط سے مضبوط قلعے کو سر کر لیا آسان ہے۔ مُشکل ہے اپنے نفس پر قابو پانا۔ پھر اگرچہ مُہاجرین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی ہجرت ہر پہلو سے —— رُوحانی، دماغی، مقامی —— افضل اور کامل ترین ہجرت ہے۔ پھر بھی حضُورِ رسالت مآب صلعم کا یہ ارشادِ گرامی ایک اُصُول کی طرح ہمارے سامنے ہونا چاہیے کہ ہر شخص کی ہجرت کا فیصلہ اس کی نیت سے ہوگا۔ فهجرتهٗ الی ما هاجر الیه۔

کھانے پینے کے متعلق یہ کثرتِ سوالات اور یہ طرح طرح کے استفسارات جو قارئین کی نظر سے گزر چکے ہیں یا آیندہ نظر سے گزریں گے محض احتیاط اور پرہیز کے خیال سے نہیں کیے جاتے تھے بلکہ اس لیے کہ کچھ تو حکیم صاحب کا ارشاد تھا کہ حضرتِ علامہ لذیذ، لطیف، دِل پسند اور مقوی غذائیں استعمال کریں، کچھ اس لیے کہ حضرتِ علامہ کا ذوقِ حیات کبھی مضمحل نہیں ہوا تھا۔ وُہ کچھ بہت زیادہ کھانے والے نہیں تھے، حقیقۃً وُہ بڑے کم خور تھے۔ لیکن اُن کے مزاج میں تجمّل اور رہبانیت نہیں تھی۔ اس میں نفاست تھی، سلیقہ تھا، شگفتگی تھی۔ ذرا مُلاحظہ فرمائیے یہ الفاظ آرائشۃ کھایا مگر وہی اس قدر میٹھا تھا کہ لطف نہ آیا، گویا وُہ آرائشتہ ہی کیا جس میں ندا سی تُرشی نہ ہو۔

ظاہر ہے اب حکیم صاحب کی دوائیں حضرتِ علامہ کو راس آرہی تھیں۔ مزید تصدیق اسی تاریخ کے ایک دُوسرے والا نامہ سے ہو گئی جس سے صاف مترشح ہوتا تھا کہ ان کا ذہن پھر علمی مشاغل کی طرف مائل ہے:۔

لاہور ۲۰ جون ۳۴

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ الحمد للہ سب خیریت ہے۔

حکیم صاحب فرماتے تھے کہ اوّل خوراک کا پہلا حصّہ دیا جاتا ہے۔ مَیں خود اسے محسوس کرتا تھا۔ اسی واسطے نہیں لکھتا تھا کہ دوائی کی طاقت ذرا زیادہ کر دی جائے تو شاید فائدہ زیادہ ہو۔ مگر وہ بہتر سمجھتے ہیں۔ ان کا ارشاد مقدم ہے جیسا انھوں نے فرمایا تھا دوائی کا استعمال تو دیر تک رہے گا۔ آواز جلد تبدیل ہو تاکہ آیندہ پروگرام وضع کر سکوں۔ کل جنوبی افریقہ سے دعوت آئی ہے۔ وہاں کے مسلمان مصر ہیں کہ یہاں کا ضرور دورہ ضروری ہے۔ گزشتہ ہفتہ ایک خط جرمنی سے آیا جس سے معلوم ہوا ہے کہ ترکی کی طرف سے بھی دعوت دی جانے والی ہے۔ بہرحال میری خواہش ہے کہ اس جہان سے رخصت ہونے سے پہلے :

برآمد ہر چہ اندر سینہ داری
سرودے نالۂ آہ و فغانے!

فالودہ پینے کو کچھ کچھ دل چاہتا ہے مگر حکیم صاحب سے پوچھنا بھول گیا۔ آپ دریافت کر کے مطلع فرمائیں۔

سردہ ابھی لاہور میں نہیں آیا۔ کابل میں سردہ کا موسم تو اگست میں شروع ہو گا۔ البتہ گرشک (مستونگ) کا سردہ شاید مل جائے۔ مَیں نے وہاں لکھوایا ہے۔ انجیر تازہ۔ تلاش کرواؤں گا۔ حکیم صاحب کے نسخہ کی

ایک مطبوعہ کاپی ارسال فرمائیں یعنی مطبوعہ کاغذ جس پر سبزی ترکاری وغیرہ کے استعمال کے متعلق ہدایات درج ہیں۔

آپ نے پبلشرز کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ ان سے گفتگو کریں۔ پھر جلد مطلع کریں تاکہ اگر ان سے یہ معاملہ طے نہ ہو تو کتابت اور طباعت کا انتظام یہاں ہی شروع کر دیا جائے۔ لوگ اصرار کر رہے ہیں کہ کتاب جلد شائع کی جائے۔ اگر اور نہیں تو اپنے ترجمے کے متعلق جلد فیصلہ ان سے کر لیں۔

والسلام۔

محمد اقبال

جیساکہ عرض کر چکا ہوں اس مکرمت نامے سے دل کو بڑا اطمینان ہوا اور خوشی بھی کہ حضرتِ علامہ عنقریب اچھے ہو کر ان ارادوں کی تکمیل کر سکیں گے جو پچھلے دو تین برس سے ان کے ذہن میں تھے۔ پھر یہ خیال بھی کچھ کم مسرت خیز نہیں تھا کہ جنوبی افریقہ کے مسلمان اور جرمنی کے بعض قدردان حضرتِ علامہ کی تشریف آوری کے منتظر ہیں۔ پھر یہ خبر بھی شاید انہی کی وساطت سے پہنچی تھی کہ ترکی کے بعض حلقے حضرتِ علامہ کو دعوت دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ کتابوں کی طبع و اشاعت کا مسئلہ البتہ طے ہونے میں نہیں آتا تھا۔ ۲۲ جون کا گرامی نامہ ہے :۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

کل ایک خط لکھ چکا ہوں۔

(۱) آج صبح دوائی کھائی تو معلوم ہوا کہ صبح کی غذا اور شام کی غذا متوازن نہیں رہیں۔ ۱۹ بدنہ کی خوراک سے کم ہیں۔ اس سے پہلے بھی یہ دوائیں

سولہ روز کے لیے بھیجی گئی ہیں۔ مگر ان کی تعداد زیادہ معلوم ہوتی تھی۔ کہیں غلطی تو نہیں ہو گئی۔ خط میں آپ لکھتے ہیں کہ دواؤں کی مقدار دگنی کر دی گئی ہے۔ مگر یہ صحیح ہے تو ان دونوں دواؤں کی مقدار دگنی ہونی چاہیے تھی یا ممکن ہے آپ کی عبارت کا مفہوم کچھ اور ہو۔ حکیم صاحب کی خدمت میں یہ عرض بھی کیجیے کہ بالعموم طلوع و غروبِ آفتاب کے وقت آواز کی حالت اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ باقی اوقات اچھی خاصی معلوم ہوتی ہے۔

(۲) خون کے زہریلے مادّوں کا ذکر میں نے حکیم صاحب کی خدمت میں خاص طور پر کیا تھا نیز ان سے استدعا کی گئی تھی کہ وہ دوا تجویز کرنے میں اس امر کا خاص خیال رکھیں۔ مہربانی کر کے مجھے مطلع کریں کہ اس کے لیے خاص طور پر کونسی دوا ان چار دواؤں میں سے ہے۔

(۳) اس مادہ کی تحلیل کے لیے جس کو ڈاکٹر Fresh Growth بتاتے ہیں کس قدر عرصہ درکار ہو گا۔ حکیم صاحب نے فرمایا تھا کہ وہ تحلیل ہو جائے گا۔ تخمیناً کتنے عرصے میں! تاکہ اگر دوبارہ ایکس ریز کیا جائے تو وہ کس وقت اور کتنی مدت کے بعد لینا چاہیے۔

پبلشرز سے گفتگو کا جو نتیجہ ہو اس سے جلد مطلع کرنا چاہیے۔ پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ والسلام

محمد اقبال ۲۲ جون ۳۴

طبع و اشاعت کے سلسلے میں گفتگو کا سلسلہ برابر جاری تھا اور پھر جیسا کہ عرض کر چکا ہوں خطبات کے ترجمے کی نظرِ ثانی بھی ابھی باقی تھی۔ حضرت علامہ چاہتے تھے

ایک مرتبہ سارا ترجمہ سُن لیں اور بعض باتوں کا اضافہ فرمائیں - یہ اس لیے کہ ان کے نزدیک بعض باتیں تشریح طلب تھیں - یُوں بھی خیال تھا کہ خُطبات میں بحیثیت خطبات جو بحثیں اُٹھائی گئی ہیں - بڑی مختصر اور تشنہ ہیں - لہٰذا ڈر ہے کہ اس سے طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہو جائیں گی، یا پیدا کر دی جائیں گی - رہا صحت کا مُطالبہ سو حضرتِ علامہ اب میرے خط کا انتظار کیے بغیر جو بات سمجھ میں آتی رقم فرما دیتے - چنانچہ پہلے تو ۲۳ جُون کا لکھا ہُوا ایک والا نامہ صادر ہُوا :-

لاہور - ۲۳ جُون ۳۴

ڈیئر نیازی صاحب - السلام علیکم -

آج آپ کے خط کی توقع تھی مگر نہیں ملا -

اس سے پہلے خط لکھ چکا ہُوں - ان میں جو باتیں حکیم صاحب سے پُوچھ کر لکھنی ہیں ان کا جواب لکھیے - آج دو ہفتے ہو گئے جب میں دہلی گیا تھا دوائی تو دہلی ہی میں شروع کر دی تھی - کل پُورے پندرہ سولہ روز ہو جائیں گے - پچھلے ہفتے میں جو کسی قدر ترقی آواز میں ہُوئی تھی دُوسرے ہفتے میں اس پر کوئی اضافہ معلوم نہیں ہُوا - حالت وُہی ہے جو پچھلے ہفتے کے آخر میں تھی - حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کر دیں نیز یہ بھی معلوم کیجیے کہ بالعموم دن اور رات میں آواز کی حالت بہتر ہوتی ہے - طلوعِ آفتاب و غروبِ آفتاب کے وقت حالت کچھ بہتر نہیں ہوتی - معلوم نہیں اس کا کیا سبب ہے -

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ گلے کے دونوں اطراف جونک لگانی چاہیے - حکیم صاحب اس بارے میں کیا فرماتے ہیں -

تجربے سے معلوم ہوا کہ دہی اور لسی کا اچھا اثر نہیں ہوتا۔ علیٰ ہٰذا القیاس فالودہ پی کے بھی میں نے دیکھا ہے اس کا اثر بھی اچھا نہیں ہوا۔ باقی خیریت ہے۔ پبلشرز کے متعلق آپ نے ابھی تک کچھ نہیں لکھا۔

محمد اقبال

اور پھر اس سے اگلے روز، یعنی ۲۴ کا :

لاہور۔ ۲۴ جون ۳۴

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم

آپ کا کوئی خط نہیں ملا۔ خدا کرے آپ تندرست ہوں۔ میں اس سے پہلے لکھ چکا ہوں کہ دوسرے ہفتے کی دوا نے پہلے ہفتے سے ترقی جو آواز میں ہوئی تھی کوئی اضافہ نہیں کیا بلکہ ترقی معکوس میں ہوئی ان کے وجوہ جہاں تک سوچ سکتا ہوں تین ہو سکتے ہیں :۔

(۱) میں نے دہی کھایا اور لسی بھی پی۔

(۲) فالودہ پیا (برف ڈال کر)۔

(۳) آپ نے پچھلے خط میں لکھا تھا کہ دوا کی مقدار دگنی کر دی گئی ہے۔

شاید ڈوس [۱۰] کے بڑھ جانے کی وجہ سے آواز نے ترقی معکوس کی۔ اس تیسری وجہ کے متعلق حکیم صاحب سے دریافت کریں اور مجھے فوراً اطلاع دیں۔

---

۱۰۔ خوراک

یہ خط آپ کو کل ملے گا۔ کل ہی حکیم صاحب سے دریافت کریں۔ مجھے فوراً جواب دیں تاکہ مجھے بدھ کے روز جواب مل جائے۔ پہلے جو خطوط میں نے آپ کو لکھے تھے ان کا جواب بھی دیں۔ ممکن ہے آج آپ کا کوئی خط مل جائے۔ بہرحال آج کا خط نہایت ضروری ہے اس کا جواب جلد آنا چاہیے۔ والسلام

محمد اقبال

لیکن اس طرح سلسلۂ ڈاک بے ربط ہو گیا اور مجھے خیال گزرا کہ میرا کوئی عریضہ شاید حضرتِ علامہ کی خدمت میں نہیں پہنچا۔ اس گھبراہٹ میں میں نے اپنے مرحوم دوست سید سلامت اللہ شاہ صاحب کو لکھا کہ حضرتِ علامہ کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافتِ حالات فرمائیں جس سے حضرتِ علامہ کو بڑا تعجب ہوا کہ ان کے گرامی نامے کیا ہوئے۔ ارشاد فرمایا:۔

لاہور ۲۷ جون ۳۴

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

میں نے آپ کو پانچ سات خط لکھے۔ کسی کا جواب نہیں آیا۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ شاید آپ بیمار ہو گئے ہوں۔ کل سلامت اللہ شاہ صاحب سے معلوم ہوا کہ آپ نے میری خیر خیریت ان سے معلوم کی ہے۔ تعجب ہے! معلوم ہوتا ہے آپ کو میرا کوئی خط نہیں ملا۔ ان خطوط میں کئی باتیں حکیم صاحب سے دریافت کرنے کی تھیں۔ اب تو میں بھول ہی گیا کہ کیا کیا باتیں دریافت طلب تھیں۔ ضروری بات جو ان سے دریافت کرنی ہے وہ یہ ہے کہ پہلے ہفتہ میں آواز میں کچھ ترقی ہوئی مگر دوسرے اور اب تیسرے ہفتے میں اس ہفتہ کی ترقی پر کوئی اضافہ نہیں ہوا جس سے

نیز مستفسر ہوں کہ دوا کیوں موثر نہیں ہوئی۔ حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کیجیے کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ دوسری بات یہ تھی کہ خون کے زہریلے مواد کے ازالہ کے لیے جس کا میں نے خاص طور پر حکیم صاحب سے ذکر کیا تھا انھوں نے موجودہ دوائی میں کوئی خاص اہتمام کیا ہے یا نہیں؟ تیسری بات یہ ہے کہ دوا کا استعمال کب تک جاری رہے گا اور دوا ہمیشہ یہی رہے گی یا اس میں وقتاً فوقتاً تبدیلی ہوگی۔ موجودہ دوا نے پہلے ہفتہ میں فایدہ کسی قدر کیا مگر دوسرے ہفتے اور تیسرے ہفتے میں اس فایدہ میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ یہ بھی دریافت کیجیے کہ شہد کھانے کی ممانعت تو نہیں ہے۔ دہی کھانے کی اجازت حکیم صاحب نے دی تھی مگر میں نے کھا کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کا اثر اچھا نہیں ہوتا۔ علیٰ ہذا القیاس فالودہ بھی کھایا۔ اس کا اثر بھی گلے پر اچھا نہیں پڑا۔ بھنڈی توری[11] کے متعلق حکیم صاحب کا کیا حکم ہے؟

قبض کی بھی کسی قدر شکایت رہتی ہے۔ اس دوا میں اس کا بھی اہتمام ہو جائے تو خوب ہو۔ تازہ انجیر نہیں مل سکی۔ کابل و قندھار کی خشک انجیر مل سکے گی۔ اس کے متعلق بھی دریافت کیجیے۔ سردہ ابھی آنا شروع نہیں ہوا۔ بہر حال سب سے زیادہ ضروری بات جو دریافت طلب ہے یہ ہے کہ دوسرے ہفتے اور تیسرے ہفتے دوا نے وہ فائدہ کیوں نہیں کیا جو پہلے ہفتہ میں ہوا تھا۔ پہلے ہفتے کے فائدہ سے تو مجھے بہت امید بندھ گئی تھی اور میں سمجھتا تھا کہ شاید

---

۱۱۔ توری یعنی تری۔

ایک ماہ کے عرصے میں آواز اپنی اصلی حالت میں عود کر آئے گی۔ والسلام

مسٹر محمد اسد[۱۲] (Leopold Weiss) کو ایک خط لکھا تھا اس کا جواب نہیں آیا۔ ان سے بھی دریافت کریں کہ میرا خط ان کو ملا ہے یا نہیں۔ ڈاک خانہ سے دریافت کرنا چاہیے کہ یہ خطوط میں نے لکھے ہیں وہ آپ تک کیوں نہیں پہنچے۔ والسلام

محمد اقبال

اس اثنا میں میرا عریضہ حضرت علامہ کی خدمت میں پہنچ گیا تھا۔ میں نے لکھا تھا آپ رجسٹرڈ خط کیوں بھیجتے ہیں جواباً فرمایا:۔

ڈیئر نیازی صاحب۔

آپ کا خط ابھی ملا جس کے لیے بہت بہت شکریہ قبول کیجیے۔ میں نے رجسٹرڈ خط آپ کو لکھا ہے اس خیال سے کہ شاید پہلے خطوط آپ کو نہیں ملے۔ بہرحال اس خط سے بہت اطمینان ہوا۔ دوا کا پیکٹ بھی مل گیا ہے۔ ان شاء اللہ کل سے

---

۱۲- محمد اسد (Leopold Weiss لیوپولڈ ویس)۔ ۱۹۳۲ء میں جب وہ (غیر منقسم) ہندوستان آئے۔ تو اوّل کشمیر میں ان سے ملاقات ہوئی، پھر دہلی میں۔ اتفاق سے انھیں مکان بھی ہمارے قرول باغ میں ملا یک طرح سے میرے مکان کے برابر میں اتنا قریب کہ روز ملاقات ہو جاتی۔ چند دنوں میں دوستانہ مراسم قائم ہو گئے۔ حضرت علامہ نے ان کی تصنیف Islam at the Cross Roads کو پسند فرمایا تھا۔ اسد صاحب اوّل اوّل اگرچہ صحیح بخاری کا ترجمہ کر رہے تھے لیکن ایک طرح سے تھے بیکار۔ اس لیے میں نے ان کی مرضی پا کر حضرت علامہ سے درخواست کی کہ انھیں اسلامیہ کالج سے منسلک کر دیا جائے۔

استعمال شروع ہوگا۔ مہربانی کرکے حکیم صاحب قبلہ سے ہر چیز کے متعلق فرداً فرداً دریافت کرکے مجھے مطلع کیجیے کہ کون سی چیز کھائی جائے اور کون سی نہ کھائی جائے۔ سبزی ترکاری۔ پھل پھول گوشت اور پینے کی چیزیں وغیرہ۔ علیٰ ہٰذا القیاس چاول خشک و پلاؤ۔ شہد وغیرہ۔ نسخہ واپس ہے۔

علی بخش سلام کہتا ہے۔ والسلام۔

محمد اقبال

۲۷ جون ۳۴

حکیم صاحب نے دواؤں میں مُناسب تبدیلی کر دی۔ پھلوں کے متعلق بھی ہدایات دے دیں۔ حضرتِ علامہ کی صحت بہتر ہو رہی تھی۔ اس گرامی نامہ کا جواب میں نے اسی روز عرض کر دیا اور حضرتِ علامہ نے بھی گویا واپسی ڈاک جواب مرحمت فرمایا :-

لاہور۔ ۲۹ جون ۳۴

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلامُ علیکم۔

آپ کا خط مل گیا ہے۔ الحمد للہ خیریت ہے۔ نئی دوا کل سے شروع کر دی ہے۔ اُمید ہے کہ فائدہ ہوگا۔ صحت مجموعی بہت اچھی ہے بلکہ اس سے چار ماہ پیشتر جو حالت صحت کی تھی وہ عود کر آئی ہے۔ البتہ آواز پر ابھی کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ آپ کھانے پینے کی چیزوں کے مفصل ہدایات حاصل کریں تاکہ کوئی بے احتیاطی نہ ہو۔ اس کے علاوہ یہ بھی عرض کریں کہ مجھے کسی قدر قبض کی شکایت بھی رہتی ہے۔ اگر انہی دواؤں میں جو میں استعمال کر رہا ہوں کوئی ایسی دوا ڈال دیں جس سے یہ شکایت نہ رہے تو بہت اچھا ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ قبض کا اثر بھی آواز پر ہوتا ہے۔

آج شام کی گاڑی میں سرہند شریف جا رہا ہوں۔ چند روز ہوئے صبح کی نماز کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔ خواب میں کسی نے مندرجہ ذیل پیغام دیا:-

"ہم نے جو خواب تمھارے اور شکیب ارسلان [13] کے متعلق دیکھا ہے وہ سرہند بھیج دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ خدا تعالیٰ تم پر بہت بڑا فضل کرنے والا ہے۔"

پیغام دینے والا معلوم نہیں ہو سکا کون ہے۔ اس خواب کی بنا پر وہاں کی حاضری ضروری ہے۔ اس کے علاوہ جاوید جب پیدا ہوا تھا تو میں نے عہد کیا تھا کہ جب وہ ذرا بڑا ہوگا تو اسے حضرت کے مزار پر لے جاؤں گا۔ وہ بھی ساتھ جائے گا تاکہ یہ عہد بھی پورا ہو جائے۔ چودھری محمد حسین، منشی طاہرالدین اور علی بخش ہمراہ ہوں گے۔ اتوار کی صبح کو لاہور واپس پہنچیں گے۔

باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ معلوم نہیں محمد اسد کیا کرتے ہیں۔ شاید وہ کوئی انگریزی اخبار یا رسالہ نکالنے والے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ ان کو کہیں دینیات کا یا عربی زبان کا پروفیسر کر دیا جائے۔ ان کی انگریزی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دینِ اسلام کے اسرار سے ناواقف نہیں۔ اگرچہ ان کے pessimism [14] سے مجھے اتفاق نہیں۔ والسلام

محمد اقبال

---

13- امیر شکیب ارسلان مشہور دروزی رہنما۔ اتحادِ اسلامی اور اسلام کی نشاۃ الثانیہ کے بہت بڑے داعی۔

14- قنوطیت۔

۲۹ جون کی شام کو حضرتِ علامہ حسبِ قرار داد سرہند تشریف لے گئے۔ حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کے مزار پر حاضری دی اور ۳۰ کی شام کو لاہور واپس آ گئے۔ رہا خیال کا معاملہ سو حضرتِ علامہ 'وارداتِ باطن' کے قائل تھے (ملاحظہ ہوں خطبات)۔ پھر ان واردات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس طرح مستقبل کے متعلق ذہن میں آسودگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی تعبیر کے لیے البتہ ذوقِ حقیقت شرط ہے۔ ہم اپنے عقلی اور دنیوی معیارات کی بنا پر ان کی صحت و عدمِ صحت کی طرح اس امر کا فیصلہ بھی تو نہیں کر سکتے کہ اس قسم کی واردات کی صحیح تعبیر کیا ہو گی۔

'اس کے علاوہ جب جاوید پیدا ہوا تھا . . . یہ دوسری وجہ تھی جس کی بنا پر حضرتِ علامہ نے سرہند کا عزم کیا۔ حضرت مجدد علیہ الرحمۃ سے انھیں جو عقیدت تھی اس کا تقاضا بھی یہ تھا کہ حضرتِ علامہ کمسن بیٹے کے ساتھ مزار پر حاضری دیں تاکہ از روئے تعلیم و تربیت وہ سب اثرات جن سے ایک اسلامی ذہن تیار ہوتا ہے ہمیشہ کے لیے دل رنقش ہو جائیں۔

۲ جولائی کا گرامی نامہ ہے :-

لاہور - ۲ جولائی ۳۴ - بمبئی پیر

ڈیئر نیازی صاحب - السلامُ علیکم -

مَیں ہفتہ کی شام کو سرہند سے واپس آ گیا تھا۔ نہایت عمدہ اور پُر فضا جگہ ہے۔ انشاء اللہ پھر بھی جاؤں گا۔

آج کا دن چھوڑ کر پانچ دن کی دوا باقی ہے۔ یعنی ہفتہ کے روز دوا ختم ہو جائے گی۔ اس واسطے بہتر ہے کہ آپ بدھ کے روز مجھے دوا روانہ کر دیں۔ یا اگر

ممکن ہو تو جمعہ کے روز یا جمعرات کے روز غرضیکہ ہفتہ کے دن مرجون دوا کی آخری خوراک ہوگی۔ جو دوا آپ نے ارسال کی تھی اس کو کھاتے ہوئے چار روز ہو گئے ہیں۔ یہ پانچواں دن ہے۔ ناشتہ کے ساتھ کھائی جاتی ہے مگر حکیم صاحب قبلہ کی خدمت میں عرض کریں کہ آواز میں ابھی تک کوئی خاص اثر کسی دوا کا نہیں ہوا۔

کھانے پینے کی چیزوں کے متعلق مفصل ہدایات مرقوم کر کے مجھ کو مطلع کر دیں۔ میں نے چند نام جو مجھ کو یاد آتے ہیں لکھ دیئے ہیں۔ والسلام۔

محمد اقبال

حسبِ ہدایت میں پھر حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آواز کی کشائش کے متعلق خاص طور پر عرض کیا۔ میں اس سے پہلے سفرِ سرہند کی کیفیت دریافت کر چکا تھا۔ ارشاد ہوا:—

عزیز نیازی صاحب۔ السلامُ علیکم۔

آپ کا پوسٹ کارڈ مل گیا ہے۔ الحمدللہ خیریت ہے۔ عام صحت خوب ترقی کر رہی ہے مگر جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں آواز میں ابھی کوئی نمایاں فرق نہیں تھا۔ نئی دوا کے استعمال سے بھی کوئی خاص فرق نہیں ہوا۔ حکیم صاحب کی خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ ان سے یہ بھی عرض کریں کہ انھی دواؤں میں کوئی ایسی دوا بھی شامل کر دیں جس سے ہر صبح با فراغت پاخانہ آجایا کرے۔ اور قبض کی شکایت نہ رہے۔ شہد کے استعمال کے متعلق بھی دریافت کیجیے۔ سرہند کے متعلق خاص انتظام کیا ہے مگر جولائی کے آخر میں

آئیں گے۔ کابل سے آیا کریں گے۔ سفیر صاحب کابل نے ان کے آنے کا انتظام کر دیا ہے۔ سرہند خوب جگہ ہے مزار نے میرے دل پر بڑا اثر کیا ہے۔ بڑی پاکیزہ جگہ ہے۔ پانی اس کا سرد اور شیریں ہے۔ شہر کے کھنڈرات دیکھ کر مجھے مصر کا قدیم شہر فسطاط یاد آگیا جس کی بنا حضرت عمرو بن العاص نے رکھی تھی اگر سرہند کی کھدائی ہو تو معلوم نہیں اس زمانے کی تہذیب و تمدن کے کیا انکشافات ہوں۔ یہ شہر فرخ سیر کے زمانے میں بحال تھا اور موجودہ لاہور سے آبادی و وسعت کے لحاظ سے دگنا[15] تھی۔

والسلام۔

محمد اقبال

۳ جولائی ۳۴

حضرتِ علامہ سرہند سے بڑا گہرا اثر لے کر آئے تھے اور انھیں اس بات کا بڑا رنج تھا کہ مسلمان اپنی تاریخ اور تہذیب و تمدن سے کس درجہ بے خبر ہیں بلکہ اس سے غفلت برت رہے ہیں۔ راقم الحروف کے دل پر ایک تو اس اسلوب کا بڑا اثر تھا جس میں حضرتِ علامہ نے سرہند کا نقشہ کھینچا تھا ــــ یہ اسلوب کیسا برجستہ اور تصنع سے پاک تھا، صاف و سادہ اور شہر کے اُن احوال پر جیسا کہ مشاہدے سے ان کا انکشاف ہوا یعنی حقیقت پر مبنی ــــ ثانیاً اس کا ذہن بعض سکھ گرووں کے اس قتل کی طرف منتقل ہو گیا جس کو سکھوں نے مکتوبات کے حوالے سے کسی نہ کسی طرح حضرتِ مجدد" کے اثر کا نتیجہ سمجھ لیا ہے اور جس کی بنا پر یہ اُن کا ایک مذہبی فریضہ بن گیا تھا کہ ہر آنے جانے والا سکھ سرہند کی ایک ایک

---

۱۵۔ یہاں در اصل عبارت ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن حضرت علامہ قلم روک نہ سکے۔ "تھی" کا اضافہ ہو گیا۔

اینٹ دریا میں ڈال دے۔ اسلام اور مسلمانوں کے اس ثقافتی مرکز کی تباہی گویا سکھوں کے ہاتھ سے ہوئی۔ اور پھر ابدالی کی غلط بخشی ملاحظہ ہو کہ ۱۷۶۷ء میں سکھوں کا زور توڑ دینے کے باوجود سرہند کی حکومت ایک سکھ سردار کے سپرد کر دی! تقسیم (۱۹۴۷ء) کے بعد اب وہاں جو حالات ہیں معلوم نہیں کیا ہیں۔

جہاں تک صحت کا تعلق ہے ڈاکٹر صاحبان نے بھی بڑھاؤ growth کے متعلق اپنا نظریہ بدل لیا، گو اس سے پہلے اُن کا کہنا یہ تھا کہ رسولی کا علاج گہری لاشعاعوں deep X-ray سے ہونا چاہیے۔ مگر اس کے لیے لاشعاع معائنے کا انتظار تھا۔ بایں ہمہ حضرتِ علامہ نے فرمایا :-

لاہور۔ ۵ جولائی ۳۴ء

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ کا خط ابھی ملا۔ دوائیوں کا پارسل بھی موصول ہوا۔

رات کو سوتے وقت کھانسی کی جو دوا ہے اس کو نگلنا ہے یا مُنہ میں رکھ کر آہستہ آہستہ چُوسنا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی ہدایت تھی اس کے متعلق فوراً لکھیں کیونکہ یہ دوا کل سے شروع کی جائے گی۔

کل صبح دس بجے X-ray کے لیے وقت مقرر تھا۔ مگر میو ہسپتال کے ڈاکٹر کرم کی دفعتہً تبدیلی ہو گئی ہے۔ جو اس کی جگہ مقرر ہو کر آئے ہیں انھوں نے ابھی آلات کا معائنہ نہیں کیا۔ اس واسطے سوموار کے روز X-ray فوٹو پھر لیا جائے گا۔ مگر ڈاکٹر یار محمد خاں کل کہتے تھے کہ fresh growth یا ٹیومر کی تھیوری غلط معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ آپ کی صحت دیگر حالات سے

مطابق نہیں۔

یہ ممکن ہے کہ شاہرگ اس مقام پر اگر ذرا پھیل گئی ہو جہاں وہ growth نظر آتی ہے۔ اس دفعہ جو X-ray ہوگا اس سے یہ بات تحقیق ہو جائے گی۔ اُن کے نزدیک اگر شاہرگ کا پھیلاؤ ہو تو پھر جیسا کہ اغلب ہے کوئی دوا اس کو اپنی اصلی حالت پر نہیں لا سکتی۔ ہاں دوا اس کے مزید پھیلاؤ کو روک سکتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آواز بھی ابھی نارمل حالت کی طرف عود نہیں کر سکتی۔ واللہ اعلم۔
بہرحال جو کچھ نتیجہ ہوگا اس سے مَیں آپ کو مطلع کروں گا۔

fresh growth یا ٹیومر کے لیے radium یا deep X-ray کا علاج ضروری ہے لیکن چونکہ غالباً fresh growth نہیں ہے۔ صرف شاہرگ کا پھیلاؤ ہے اس واسطے radium وغیرہ کے علاج کی ضرورت نہیں ہے۔ انگریزی ڈاکٹر اب یہ کہتے ہیں کہ اگر ٹیومر ہوتا تو عام صحت اس قدر جلد ترقی نہ کر سکتی۔ بلکہ روز بروز بدتر ہوتی جاتی۔ غرضیکہ اس وقت جو قیاسات مَیں نے لکھ دیے ہیں آپ حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کر دیں۔ اور جو کچھ وہ کہیں اس سے مجھے مطلع کریں۔ سوموار کے روز X-ray کا نتیجہ آنے کے بعد مفصل لکھوں گا۔ اگر نتیجہ اسی روز معلوم ہو گیا تو خط بھی ان شاء اللہ اسی روز لکھوں گا۔ والسلام

علی بخش آداب کہتا ہے۔

محمد اقبال

مَیں نے یہ سارا مکتوب لفظ بلفظ حکیم صاحب کو سنا دیا۔ یہ معلوم کر کے کہ رسولی کا

نظریہ غلط ہے بڑی تسلی ہوئی۔ اب صرف لاشعاع معائنے کے نتیجے کا انتظار تھا۔ حکیم صاحب نے دواؤں میں کچھ ردو بدل کیا، کچھ نئی ہدایات دیں، لیکن حضرت علامہ اسی بعد ایک اور خط لکھ چکے تھے۔ میں واپس آیا تو یہ گرامی نامہ آیا رکھا تھا۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ ایک خط آج پہلے لکھ رہا ہوں۔

ابھی ملک برکت علی صاحب سے ملاقات ہوئی جو شملہ سے آئے ہیں۔
شملہ میں میرے ایک مہربان خواجہ حبیب اللہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کشمیر میں گلقند کستر علیکہ پرانی ہو تقویت کے لیے اکسیر ہے۔ پچاس سال پرانی گلقند خواجہ صاحب مذکور کے پاس موجود ہے۔ مہربانی کر کے حکیم صاحب سے ذکر کر دیں اور ان سے پوچھیے کہ گلقند کے استعمال کے متعلق کیا مشورہ دیتے ہیں۔ اس کا جواب بہت جلد آنا چاہیے۔

نیز یہ بھی دریافت کیجیے کہ اگر مرچ سرخ، مسالہ، گوشت اور سبزی وغیرہ ڈالنا چاہیے یا نہ۔

شہد honey کے استعمال کے متعلق بھی ہدایات معلوم کیجیے۔

محمد اقبال

۶ جولائی ۳۴

حکیم صاحب نے فرمایا گلقند سے کیا فائدہ ہوگا، ویسے استعمال میں حرج نہیں۔ لیکن میرا قیاس ہے حکیم صاحب کو لاشعاع معائنے کے نتیجے کا انتظار تھا۔
ملک صاحب کی شخصیت معروف ہے۔ افسوس ہے ۱۹۴۷ میں انتقال ہو گیا۔

۱۰ جولائی کا عنایت نامہ ہے :۔

۱۰ جولائی ۳۴

ڈیئر نیازی صاحب۔

السلام علیکم۔ آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ الحمد للہ کہ خیریت ہے۔ x - ray x ہُوا[۱۴] ہوگا۔ فی الحال مندرجہ ذیل باتیں حکیم صاحب قبلہ کی خدمت میں عرض کریں:۔

(۱) نئی دوا جسے پان میں رکھ کر چبانے کی ہدایت ہے اور جو آواز کے لیے مخصوص ہے مفید ثابت نہیں ہُوئی۔ آج اسے کھاتے ہُوئے چار روز ہُوئے ہیں۔ ہفتہ ختم ہونے کے بعد پھر لکھوں گا۔ کوئی خاص اثر اس کا آواز پر نہیں ہوا۔ آواز کی حالت وہی ہے جو اس دوا کے استعمال سے پہلے تھی۔

(۲) مَیں نے عرض کیا تھا کہ قبض نہ ہُوا کرے۔ حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کیجیے قبض کی شکایت رفع نہیں ہُوئی۔

(۳) پہلے نسخے کے مطابق جو دوا رات کو کھائی جاتی تھی وہ آہستہ آہستہ چوس لی جاتی تھی لیکن جو دوا موجودہ نسخہ کے مطابق رات کو کھائی جاتی ہے اس کے متعلق کوئی ہدایت نہیں کہ نگل لی جائے یا چوسی جائے۔ اس کے متعلق جلد لکھیے۔ آپ کے خط میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ والسلام

محمد اقبال

اگلے روز لاشعاع معائنہ ہُوا اور نتیجہ یہ کہ:

---

۱۴۔ "کر" سہواً رہ گیا۔

١١ جولائی ٣٤

ڈیئر نیازی صاحب - السلام علیکم -

کل ایک خط لکھ چکا ہوں - ابھی دوبارہ X Ray سے سینہ دکھا کے گیا ہوں یہ بات اب یقین ہو گئی کہ ٹیومر یا گرہ تو نہیں صرف شاہرگ کا پھیلاؤ ہے - حکیم صاحب کی خدمت میں یہ عرض کر دیں - کہتے ہیں کہ یہ شاہرگ کا پھیلاؤ یا تو خون کے بعض مادوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے یا بعض پہلوانوں اور گویوں کو بھی ہو جاتی ہے - نفس کے زیادہ استعمال کی وجہ سے - بہرحال حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کر دیں اور جو کچھ وہ فرمائیں مجھے اس سے مطلع فرمائیں -

عام صحت تو جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے بہت اچھی ہے مگر آواز پر اب تک کوئی اثر نہیں ہوا - یہ آخری دوا جو پان میں رکھ کر چبائی جاتی ہے - اس کا اثر بھی نہیں ہوا - مجھے اسے کھاتے ہوئے پانچ روز ہو گئے ہیں - حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کیجیے کہ کوئی ایسی دوا مرحمت کریں جس کا نمایاں اثر آواز پر ہو - آواز جہاں تھی وہیں ہے - اب تک اس پر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی - پچھلے خطوں میں جو تین باتیں لکھ چکا ہوں ان کا جواب حکیم صاحب سے دریافت کر کے جلد دیں - زیادہ کیا عرض کروں - خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے - والسلام -

محمد اقبال

افادہ نمبر ۱۳ کے گرامی نامے سے اس کی مکرر تصدیق ہو گئی کہ رسولی (Tumor) کا نظریہ غلط ہے - جو کچھ ہے صرف شاہ رگ کا پھیلاؤ - لہٰذا سوال یہ تھا کہ حکیم صاحب اب اس تشخیص کے پیشِ نظر کیا تدبیر اختیار کرتے ہیں -

لاہور - ۴: جولائی ۴۴

ڈیئر نیازی صاحب - السّلام علیکم۔

پہلے خط میں لکھ چکا ہوں ٹیومر کی تھیوری خود ایکس رے نے غلط ثابت کر دی ہے - ڈاکٹر اب کہتے ہیں کہ گروہ نہیں ہے تاہم شاہرگ کا پھیلاؤ ہے ۔اور یہ بھی ایک قسم کی swelling[۱۷] ہے ۔ان کی رائے میں یہ مرض خطرناک نہیں ہے ۔لیکن نارمل حالت کی طرف عود کر آنا ان کے نزدیک بہت مشتبہ ہے ۔ان کے علم میں اب اس کا علاج صرف یہی ہے کہ موجودہ آواز پر اکتفا کی جائے اور شاہرگ کے پھیلاؤ کو دواؤں کے ذریعے سے روکنے کی کوشش کی جائے اور بس! جسٹس آغا حیدر صاحب مجھے بتاتے تھے کہ یہ بیماری یعنی شاہرگ کا پھیلاؤ ان لوگوں کو بھی ہو جاتی ہے جو نفس سے زیادہ کام لینے والے ہوں ۔ مثلاً پہلوان اور گویّے ۔ بہر حال یہ صورت حال ہے آپ حکیم صاحب کی خدمت میں مفصل عرض کر دیں ۔میری آواز میں ابھی تک کوئی خاص فرق نہیں ہوا ۔ اس امر خاص کی طرف حکیم صاحب قبلہ کی خصوصی توجہ کی ضرورت ہے ۔ عام صحت ایسی درست ہے کہ کئی سال سے ایسی صحت نہ تھی ۔ اب کسی ایسے نسخے کی ضرورت ہے جس کا فوری اثر آواز پر ہو تاکہ مجھے اطمینان ہو اور ڈاکٹروں کو بھی پوری شکست ہو کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ آواز کا نارمل[۱۸] ہو جانا مشکل بلکہ ناممکن ہے ۔زیادہ کیا عرض کروں ۔

---

۱۰ - ۱۴

۱۸۔ normal ، طبعی

محمد اسد صاحب کو مَیں نے خط لکھ دیا ہے۔

اقبال

گویا حضرتِ علامہ کے علاج کا دار و مدار اب صرف حکیم صاحب کی دوائیں پر تھا اور حکیم صاحب کی ساری کوشش یہ کہ کسی نہ کسی طرح آواز عود کر آئے۔ لیکن آواز کی حالت میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ حضرتِ علامہ نے فرمایا:۔

۱۶ جولائی ۳۷

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ کا خط مل گیا ہے۔ اس سے پہلے ایک خط لکھ چکا ہوں جس میں جرّاح کے مرہم یا لیپ کا ذکر تھا۔ اس کا جواب حکیم صاحب سے دریافت کر کے لکھیے۔

دیگر عرض یہ ہے کہ دوماہ کا باقاعدہ استعمال ہو رہا ہے اور جیسا حکیم صاحب فرماتے جائیں گے عمل ہوتا جائے گا۔ اس میں تساہل نہ ہوگا۔ صبح کو ناشتہ ۷ ۸ کے درمیان کرتا ہوں۔ ۱۱ بجے کھانا کھاتا ہوں مگر تیتر کا ملنا اس موسم میں ناممکن ہے۔ سردا اگست سے شروع ہوگا۔ مَیں نے اس کا انتظام سفیر صاحب افغانستان کی معرفت کر لیا ہے۔ پستہ کی مٹھائی بھی وہیں سے آئے گی۔ باقی رہا چھیپھڑا سو وہ مَیں کھا نہ سکوں گا کیونکہ مجھے اس سے کراہت آتی ہے بلکہ مَیں اسے پکا ہوا دیکھ بھی نہیں سکتا۔ ہواخوری کی کوشش کروں گا۔ مگر اس کی عادت پڑنا مشکل ہے کیونکہ تمام عمر میں کبھی ایسا نہیں کیا۔ حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کیجیے گا کہ مجھے نماز کا پورا پابند کرنے اور ہواخوری کی عادت ڈالنے کے لیے آپ کے روحانی اثر کی ضرورت ہے۔

رات کو دلیا مع دودھ کھاتا ہوں۔ اگر ایسا نہ کروں تو قبض رفع نہیں ہوتی۔
زیادہ کیا عرض کروں حکیم صاحب ٹھیک فرماتے ہیں کہ نزلہ ایک مدت سے ہے ۔
اس بیماری سے پہلے بھی میرا گلا اکثر خراب رہتا تھا اور اس میں خراش رہتی تھی ۔ یہ
ان کا خیال بالکل درست ہے ۔ صحت بالکل خراب رہتا تھا اور اس میں خراش
رہتی تھی ۔ یہ ان کا خیال بالکل درست ہے ۔ صحت بالکل اچھی ہے اب صرف آواز
کی وجہ سے بے اطمینانی ہے ۔ اس کے متعلق ہر روز ان کی خدمت میں عرض کرتے
رہیے ۔ تھوڑا سا فرق بھی ہو جائے تو سب کو اطمینان ہو جائے گا ۔ والسلام

محمد اقبال

سفیر افغانستان، یعنی سردار اصلاح الدین سلجوقی جو حضرت علامہ سے بڑی ارادت
اور عقیدت رکھتے اور ہمیشہ ان کی خدمت کے لیے حاضر رہتے تھے ۔ حکیم صاحب قبلہ
نے تو محض ہوا خوری کے لیے کہا تھا ۔ حضرت علامہ نے ازرہ انکسار نماز کا ذکر بھی کر دیا ۔
یہ نتیجہ تھا ان کی روحانی تڑپ، عجز اور فروتنی کا ۔ ہوا خوری فی الواقع کبھی نہیں کی ۔ وہ رات
کو بہت دیر میں سوتے، بہت صبح اٹھتے، کبھی تہجد اور کبھی فجر ادا کرتے ۔ پھر اپنے غور
و فکر یا شعر و سخن کی دنیا میں ڈوب جاتے ۔ دن چڑھے ذرا سا ناشتہ کرتے، پھر جیسی
ضرورت ہوتی عدالت یا مقدموں کی تیاری میں مصروف رہتے ۔ دوپہر میں کھانا کھا کر ذرا
سا آرام کرتے، سہ پہر میں پھر نشست ہوتی، الا یہ کہ فوری ضرورت باہر لے جائے ۔

اسی روز ایک دوسرا مکرمت نامہ صادر ہوا :-

ڈیئر نیازی صاحب ۔ السلام علیکم

امید ہے آپ نے میرے سب خطوط حکیم صاحب کو سنا دیے ہوں گے ۔ کل اتوار

آپ کے خط کا انتظار تھا امید ہے آج ملے گا اور شاید دوا بھی اگر حکیم صاحب سے معلوم کیجیے :-

(۱) مجھ کو بعض تجربہ کار لوگوں نے ہدایت دی ہے گلے کے دونوں طرف جونک لگوائی جائے۔

(۲) جراحوں کا ایک پرانا خاندان لاہور میں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے پاس ایک لیپ ہے جو اس مرض کے مریضوں کے گلے پر لگایا جاتا ہے۔ میں نے ان سے لیپ کے اجزا دریافت کیے تو معلوم ہوا کہ چار قسم کے گوندوں سے بنا ہے جن کے اثر سے بلغم جل کر کافور ہو جاتی ہے۔ جراح کا بھی یہی خیال ہے کہ آواز کی خرابی نزلے کی وجہ سے ہے۔ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ پانچ روز تک متواتر لگانے سے آواز میں بے حد ترقی ہو گی بلکہ ممکن ہے کہ بالکل اچھی ہو جائے اور پھر کسی دوا لگانے یا کھانے کی ضرورت نہ رہے۔ غرضیکہ اس کو بہت دعوے اس پر ہے شہر کے لوگ جو ہمارے ہمدرد ہیں مجبور کر رہے ہیں۔ میں نے سب کو یہی جواب دیا ہے کہ حکیم صاحب کے مشورے کے بغیر کچھ نہ ہو گا۔

زیادہ کیا عرض کروں۔ والسلام۔ جواب جلد ملے۔

محمد اقبال

لاہور ۱۶ جولائی

حکیم صاحب نے فرمایا مجھے لیپ پر کوئی اعتراض نہیں، (بلکہ ایک لیپ خود بھی تجویز کر دیا) مگر دواؤں کا استعمال ضروری ہے۔ جونکیں تو قطعی نہیں لگوانی چاہییں۔ ڈاکٹر صاحب سے کہیے تسلی رکھیں اور لوگوں کے چٹکلوں کو زیادہ اہمیت نہ دیں۔

میں نے حکیم صاحب کے ارشادات من و عن حضرتِ علّامہ کی خدمت میں پہنچا دیے اور دوائیں بھی۔ حضرتِ علّامہ نے فرمایا :-

لاہور

ڈیئر نیازی صاحب۔ السّلامُ علیکم

آپ کی مُرسلہ دوائیاں تمام پہنچ گئی ہیں۔ مَیں نے ایک روز مسہل لے لیا تھا۔ اِس واسطے اس اَور اس کے دُوسرے روز دوا نہیں کھائی۔ آج صُبح سے پھر شُرُوع کی ہے حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کر دیں کہ اب ان کی عنایت سے میری صحت بہُت اچھی ہو گئی ہے صرف آواز کی کسر ہے اس لیے کوئی اکسیر تجویز کیجیے۔ مُمکن ہے مُجھے اس ماہ کے اندر اندر انگلستان جانا پڑا۔ اس واسطے مَیں اُن کی خاص توجّہ کا طالب ہُوں۔

تازہ انجیر کا انتظام ہو گیا ہے۔ ہر روز مُلتان سے آجاتی ہے اَور انجیر بھی نہایت عُمدہ۔ کابل اَور قندھار کی انجیروں سے بھی بہتر۔ سردہ کا انتظام بھی ہو گیا ہے مگر وہ اگست میں کابل سے آنا شُرُوع ہو گا۔ اَور انشاء اللّٰہ ہر ہفتہ آیا کرے گا۔

محمد اسد صاحب سے کہیے کہ کالج کمیٹی منگل کے روز ان کے مُعاملے کا فیصلہ کرے گی۔ مَیں نے خلیفہ شجاعُ الدّین سیکریٹری کمیٹی سے کہہ دیا ہے کہ فیصلہ سے ان کو مُطلع کر دیں۔ والسّلام

محمد اقبال

۲۲ جولائی ۳۴

حضرتِ علامہ کی صحت برابر ترقی کر رہی تھی۔ چنانچہ اگلے ہی روز ایک دوسرا عنایت نامہ صادر ہُوا :۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ کا خط مل گیا ہے۔ الحمد للہ خیریت ہے۔ اگر میری آواز اصلی حالت پر عود کر آئی تو میں اس بیماری کو خدا کی رحمت تصوّر کروں گا۔ کیونکہ اس بیماری نے حکیم صاحب سے وُہ ادویہ استعمال کرنے کا موقع پیدا کیا جنھوں نے میری صحت پر ایسا نمایاں اثر کیا ہے۔ تمام عمر میں میری صحت ایسی اچھی نہ تھی جیسی اب ہے۔

چودھری صاحب [۲۱] کو بھی ان گولیوں نے بڑا فائدہ کیا ہے جو حکیم صاحب نے ان کو دی تھیں۔ ان کی تمام شکایت رفع ہو گئی ہے۔

مجھ کو اب صرف آواز کی وجہ سے بے اطمینانی ہے اور بس۔

آپ کو یاد ہوگا ایک دفعہ میں شیخ غلام جابر ٹھیکیدار کے ہاں قرول باغ میں ٹھہرا تھا۔ مَیں نے سُنا ہے اُن کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے جس سے مجھ کو بہت افسوس ہُوا۔ مرحومہ بچے چھوڑ گئی ہے اور یہ بڑے درد و سوز کی بات ہے۔ میری طرف سے آپ شیخ موصوف کی خدمت میں جا کر اظہارِ افسوس کریں۔ غالباً قرول باغ میں ہی طلبیہ کالج ہے۔ محمد اسد صاحب سے کہہ دیں کہ کالج کمیٹی کی میٹنگ منگل کی بجائے جمعرات کو ہوگی جو فیصلہ ہوگا اُس سے آپ کو مطلع کیا جائے گا۔ حکیم

---

۲۱۔ چودھری محمد حسین مرحوم۔

صاحب کی خدمت میں بہت بہت سلام کہیے۔

انگلستان جانا ابھی یقینی نہیں ہے۔ اگر یقین ہو گیا تو آپ کو مطلع کروں گا بلکہ ایک روز دہلی میں بھی ٹھہروں گا اور حکیم صاحب سے مفصل ملاقات کرنے کے بعد آگے جاؤں گا۔ آپ نے لیکچروں کی طباعت کے متعلق بھی کچھ نہیں لکھا۔ اگر آپ کو جامعہ سے بہتر ٹرمز ملتے ہیں تو فیصلہ کر کے طباعت کے لیے ان کو دے دینے چاہئیں۔ والسلام۔

محمد اقبال ۲۳ جولائی ۳۴

شیخ صاحب سے تعزیت کر دی گئی اور راس مسعود صاحب کو پیغام پہنچا دیا۔ انگلستان جانا ابھی یقینی نہیں'۔ یہ انگلستان جانا' روڈز لیکچرز' کے سلسلے میں تھا۔ یہ بھی خیال تھا کہ اس طرح مغربی اطبا سے مشورے' بلکہ علاج کی صورت بھی پیدا ہو جائے گی۔ حضرت علامہ بھی سمجھتے تھے کہ اگر بحالیِ صحت کی رفتار یہی رہی تو بہت ممکن ہے مسئلۂ مکان و زمان پر وہ اپنے خیالات چند مہینوں میں مرتب کر لیں؛ مگر افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔

اب حکیم صاحب بھی مطمئن تھے۔ میں نے ان سے جملہ حالات عرض کر دیے اور دوائیں بھیج دیں۔ دواؤں کا پارسل اور میرا عریضہ ان کی خدمت میں پہنچا تو ارشاد ہوا:۔

۲۷ جولائی ۳۴

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ الحمد للہ کہ خیریت ہے۔

صحت بے شک بہت اچھی ہے مگر افسوس ہے کہ آواز میں مطلق کشائش نہیں ہوئی۔ دوا اتوار کے روز شروع کی تھی۔ آج جمعہ ہے یعنی چھ روز

ہو گئے۔ حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کر دیجیے زیادہ کیا عرض کروں سوائے اس کے کہ حکیم صاحب کی خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ جہاں تک آواز کا تعلق ہے ابھی تک کوئی دوا کارگر نہیں ہوئی۔ لیپ کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔

محمد اقبال

اور پھر دوسرے دن ایک اور :-

۲۸ جولائی ۳۴

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

میں کل آپ کو لکھ چکا اور خط ڈاک میں ڈال چکا تو دو ایک باتیں یاد آئیں۔

حکیم صاحب کی خدمت میں اوّل تو یہ عرض کیجیے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ دوائی کا کوئی خاص اثر آواز پر نہیں ہوتا۔ اب تک آواز بدستور ہے اور کوئی کشائش اس میں نہیں ہوتی۔ چھینک دو چار دفعہ دن میں آتی ہے اور اس سے ریلیف بھی ہوتا ہے۔ بلغم بھی کچھ خارج ہوتا رہتا ہے مگر آواز پر اثر نہیں ہوتا۔

پہلے مُدرح الذہب دیا جاتا تھا۔ اس سے بہت فائدہ ہوا۔ کیا اب حکیم صاحب نے اس کا دینا بند کر دیا ہے؟

کیا یہ ممکن نہیں کہ دواؤں کی تعداد گھٹا دی جائے اور چار پانچ دواؤں کی جگہ صرف ایک یا دو ہوں؟

لیپ کی دوا استعمال کر رہا ہوں اس سے تو کوئی خاص فائدہ مرتب نہیں ہوا۔ ممکن ہے کوئی اور قوی تر لیپ ہو جس کا اثر ہو۔ اور جس کی وجہ سے کسی قسم کے دانے یا پھنسی گلے پر نہ نکلے۔ اس لیپ سے بھی کوئی دانہ وغیرہ نہیں نکلا۔ تاہم

مؤثر بھی نہیں ہے۔

یہ جو کچھ میں نے لکھا ہے اپنے خیال کے مطابق لکھا ہے۔ حکیم صاحب قبلہ میرے مزاج اور مرض کو مجھ سے بہتر پہچانتے ہیں۔ وہ جس طریق پر چل رہے ہیں وہی بہتر ہوگا۔ میں نے صرف اپنا خیال ظاہر کیا ہے جو ممکن ہے بالکل غلط اور ناقابلِ عمل ہو۔ مختصر یہ کہ آواز کے لیے خاص زود اثر دوا کی ضرورت ہے

محمد اسد صاحب سے کہہ دیجیے کہ کالج کمیٹی نے ان کا تقرر منظور کر لیا ہے۔ ابتداءً چھ ماہ کے لیے ان کی تنخواہ مقرر کرنے کا اختیار انھوں نے یعنی کالج کمیٹی نے مجھ کو دیا ہے۔ کمیٹی سے باقاعدہ اطلاع آنے پر میں ان کو خط لکھوں گا۔ میرے خیال میں ان کو کم تنخواہ پر بھی یہ جگہ قبول کر لینی چاہیے کیونکہ اس جگہ کے امکانات بہت ہیں۔ والسلام

محمد اقبال

حضرت علامہ آواز کی خستگی سے بڑے بددل ہو رہے تھے۔ میں اس والا نامہ کا جواب عرض کرنے نہیں پایا تھا کہ ۲۷ کا لکھا ہوا ایک اور مکرمت نامہ صادر ہوا۔ حسبِ ہدایت اسد صاحب سے گفتگو کی اور حکیم صاحب سے مل کر جملہ ارشادات گوش گزار کر دیے، دوائیں لیں اور ایک طویل عریضہ حضرت علامہ کی خدمت میں ارسال کیا۔ مگر اس اثنا میں سلسلۂ ڈاک پھر بے ربط ہو گیا۔ اوّل ۳۰ جولائی کا ایک والا نامہ پہنچا:۔

۳۰ جولائی ۳۴

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا جس میں ایک ذرا سی پُڑیا بھی تھی۔ کھولا تو اس میں

بجائے مدد کے ایک گولی جو جواہر مہرہ کی نکلی۔ اس واسطے واپس ارسالِ
خدمت کرتا ہوں تاکہ حکیم صاحب سے ایک اور گولی لے کر اس کو پان میں
چبانے کی مدد کے ساتھ ملوائیں اور پھر مجھے ارسال کریں۔ اس کے علاوہ جو خط
میں نے کل ڈاک میں ڈالا ہے اس کا مضمون بھی آپ کو اور حکیم صاحب کو معلوم ہو
جائے تو بہتر ہے۔ ممکن ہے حکیم صاحب کوئی اور تبدیلی بھی کریں۔ قبض کی اب مجھے
شکایت نہیں سوائے آواز کی شکایت کے۔

مسٹر محمد اسد کے متعلق لکھ چکا ہوں ان کا خط بھی آج آیا ہے۔ میرا پیغام
ان تک پہنچا دیں جس میں میں نے کالج کمیٹی والے فیصلے کی اطلاع دی ہے۔ کمیٹی نے
ان کے حق میں فیصلہ کیا ہے یعنی ان کو ملازم رکھنے کا فیصلہ کیا ہے اور مجھ کو اختیار
دیا ہے کہ میں ان کی تنخواہ مقرر کر دوں۔ ابھی تک میرے پاس باقاعدہ اطلاع کمیٹی کی
طرف سے نہیں آئی۔ مولوی غلام محی الدین صاحب سیکرٹری انجمن نے زبانی سنا
ہے۔ اطلاع آنے پر میں ان کو خود لکھوں گا۔ فی الحال میں ان کو صرف اسی قدر
مشورہ دیتا ہوں کہ کچھ تنخواہ پر بھی اس جگہ کو قبول کر لیں۔ وہ ۲۵۰ روپیہ
ماہوار پر راضی ہیں مگر کالج کے فنڈ ابھی اس تنخواہ کی شاید اجازت نہیں دیتے
وہ خود اس میں reasonable reduction کر دیں۔ مجھے امید ہے کہ اگر
آیندہ چھ ماہ میں انھوں نے تعلیم دہی کو عمدگی کے ساتھ سرانجام دیا تو انجمن ان
کی تنخواہ بڑھا دے گی۔ میرے خیال میں وہ فی الحال ۲۵۰ روپیہ
ماہوار قبول کر لیں۔ اگر یہ ناممکن ہے تو اطلاع دیں۔ اگر مجوزہ رسالہ
بھی وہ نکالتے ہیں تو ممکن ہے اس سے ان کی آمدنی میں اضافہ

پھر۔ والسلام۔[۲۲]

محمد اقبال

حسبِ ارشاد مَیں حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ دوائیں لیں اور حضرتِ علّامہ کی خدمت میں بھیج دیں۔ گولی کے بارے میں بھی تعمیلِ ارشاد کر دی۔ اسد صاحب سے گفتگو ہُوئی۔ اُنھوں نے کہا مَیں خود ہی لاہور جا رہا ہُوں۔ حضرتِ علّامہ سے مل کر سب باتیں کر لُوں گا۔ مگر پھر اُسی روز حضرتِ علّامہ نے ایک پوسٹ کارڈ رقم فرمایا:۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السّلامُ علیکم۔ اس سے پہلے خطوط لکھ چکا ہوں۔ یہ پوسٹ کارڈ محض یہ بات یاد دلانے کے لیے لکھتا ہُوں کہ دوا ہفتہ یا اتوار کے دن یعنی ۴ یا ۵ اگست کو ختم ہو جائے گی۔ والسّلام۔

محمد اقبال

۳۱ جولائی ۳۴

آواز کی حالت کچھ بہتر ہو چلی تھی۔ دوائیں شاید دُوسرے روز پہنچیں۔ حضرتِ علّامہ نے فرمایا:

ڈیئر نیازی صاحب۔ السّلامُ علیکم۔

آج دوا کا انتظار رہا مگر نہیں ملی اُمید ہے کل مل جائے گی۔ کل پرسوں سے آواز پھر کچھ رو بصحت معلوم ہوتی ہے۔ مجھ کو یقین ہے کہ جواہر مہرہ کر ضرور

۲۲۔ یہ خط اگرچہ بے تاریخ ہے، لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید ۳۰ جولائی کو لکھا ہو گا۔

مفید ثابت ہوگا۔ حکیم صاحب قبلہ سے یہ بھی دریافت کیجیے کہ جواہر مہرہ کے اجزا کیا کیا ہوتے ہیں۔ دیگر خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ اُمید ہے آپ بھی اچھے ہوں گے۔ عابد صاحب کا خط آیا تھا ان کا شکریہ ادا کر دیجیے۔ میرا انگلینڈ جانا ابھی یقینی نہیں ہُوا۔ غالباً نہ جاؤں گا۔ والسلام۔

محمد اقبال لاہور ۲ اگست ۳۴

عابد صاحب۔ یعنی ڈاکٹر سیّد عابد حسین اُستاذ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ 'انگلستان نہیں جاؤں گا' مطلب یہ تھا روڈز لیکچرز کے سلسلے میں اور یہ اطلاع بڑی یاس انگیز تھی۔ اس اثنا میں میرا عریضہ بھی حضرتِ علّامہ کے مُلاحظے سے گُذر چکا تھا۔ اِرشاد ہُوا:۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السّلامُ علیکم

آپ کا مرسلہ پارسل دوا کا مِل گیا ہے۔ اس میں جو خط تھا وہ بھی مَیں نے پڑھ لیا ہے۔ حسبِ ہدایت عمل ہوگا۔ اِنشاء اللہ۔ مَیں اس سے پہلے لکھ چُکا ہُوں کہ آواز اب ایک دو روز سے دو بعنت معلُوم ہوتی ہے۔ اُمید ہے اس دوا سے مزید فائدہ ہوگا۔ آپ نے لکھا ہے کہ وسطِ ناشتہ جو دوا کھائی جائے وہ گُھلا کر کھائی جائے۔ معلُوم نہیں گُھلا کر کھانے سے آپ کا کیا مطلب ہے۔ پہلے تو مَیں ناشتہ کے درمیان چائے کے ایک گھونٹ کے ساتھ نگل لیا کرتا ہوں۔ شاید گُھلا کر کھانے سے آپ کا مطلب یہ ہے کہ گولی کو مُنہ میں کچھ دیر رکھا جائے۔ حتیٰ کہ گُھل کر خود بخُود حلق سے اُتر جائے یہ مفصّل لکھیے۔ آپ کا مطلب کیا ہے؟ یہ بھی تحریر کریں۔ آیا جواہر مہرہ بھی ان دواؤں میں ڈالا گیا ہے یا نہیں؟ نیز اس کے

اجزا کیا ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ حکیم صاحب قبلہ کی خدمت میں سلام عرض کریں۔ والسلام۔

علی بخش ٹکٹ ارسال کرے تو مضائقہ نہ سمجھیے۔ وہ سلام کہتا ہے۔

محمد اقبال لاہور ۔ ۴ اگست ۳۴ء

ٹکٹوں کا معاملہ یہ ہے کہ ایک روز حضرتِ علامہ کا ملفوف کھولا تو اس میں ڈاک کے متعدد ٹکٹ برآمد ہوئے جن کو میں نے ویسے ہی واپس کر دیا۔ میرا خیال تھا یہ ٹکٹ علی بخش یا کسی ملازم نے شاید غلطی سے لفافے میں رکھ دیئے ہیں۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا (علی بخش ہی کی زبانی) کہ ٹکٹ حضرتِ علامہ کے زیرِ ہدایت بھیجے گئے تھے۔ ان کا خیال تھا دواؤں کی ترسیل میں چونکہ مصارف خاصے بڑھ گئے ہیں اس لیے علی بخش ٹکٹ بھیج دیا کرے۔ لیکن میں نے باادب اور نیازمندانہ گذارش کی کہ حضرتِ علامہ اگر ایسا نہ کریں تو ان کی بڑی ذرہ نوازی ہو گی۔ حضرتِ علامہ نے میری یہ درخواست منظور فرمالی اور آیندہ یہ سلسلہ بند ہو گیا۔

۵ اگست کو حضرتِ علامہ شاید ملیریا بخار میں مبتلا ہو گئے۔ چنانچہ اسی روز کا عنایت نامہ ہے:۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ پہلے خط لکھ چکا ہوں۔

آج صبح سے دوا شروع کی ہے مگر اس وقت ۴ بجے شام ہے۔ میرا بدن ٹوٹ رہا ہے۔ بخار کی آمد آمد ہے۔ چونکہ سردی محسوس ہوتی ہے۔ اس واسطے معلوم ہوتا ہے ملیریا ہے۔ حکیم صاحب قبلہ کو مطلع کریں اور پوچھیں کہ اگر بخار جاری رہے تو اس کے ساتھ دوا جاری رہے یا ترک کر دی جائے۔ نیز یہ بھی

دریافت کریں کہ کونین کھاؤں۔ آج صبح مجھے پیشاب بہت سُرخ رنگ کا آیا تھا۔
معلوم ہوتا ہے حکیم صاحب کی دوائیں بھی گرم مزاج ہیں۔ والسلام

۵ اگست ۳۴ محمد اقبال

اور پھر اگلے روز کا ایک اور ــــــ

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلامُ علیکم۔

کل مَیں نے آپ کو خط لکھا تھا کہ سہ پہر کو بخار ہو گیا۔
صُبح کی دوائی کھائی تھی۔ رات کو نہیں کھائی۔ مَیں نے بھی کُتی دوا حکیم
صاحب کی نہیں کھائی کونین کھائی تھی۔ بخار مجھے نہیں ہُوا۔ الحمد للہ۔
حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کر دیں۔ آواز کچھ رُو بصحت معلوم
ہوتی ہے مگر اس کی ترقی نہایت خفیف ہے خدا جانے کب تک یہ سلسلہ جاری
رہے گا۔ مَیں نے پھیپھڑوں اور دل کا دوبارہ معائنہ کرایا ہے سب کچھ دُرست
ہے۔

حکیم صاحب سے عرض کریں کہ اب رُوحانی اثر کی ضرورت ہے زیادہ
کیا عرض کروں۔ انگلینڈ غالباً نہ جاؤں گا۔

مُسافر (سیاحتِ افغانستان) کاتب کو دے دی ہے۔ اس کے
بعد اُردو کا مجموعہ دے دیا جائے گا۔ والسلام۔

محمد اقبال ۷ اگست ۳۴

لاہور

اِس اثنا میں مَیں حکیم صاحب سے مل چکا تھا۔ ملیریا کی شکایت عارضی تھی۔

لیکن تعجب تھا تو اس بات پر کہ جب قلب اور شش ٹھیک نہیں، صحت بھی ترقی کر رہی ہے، بلکہ آواز بھی اصلاح پذیر ہے تو مستقل فائدہ کیوں نہیں ہوتا۔

انگلستان نہ جانے کا پھر ذکر تھا۔ مسافر کا یہ نسخہ خاص تھا اور مصروف احباب میں تقسیم کے لیے طبع ہوا اور یہ راقم الحروف کی خوش قسمتی ہے کہ اس سلسلے میں حضرتِ علامہ نے اسے بھی نظرانداز نہیں کیا۔

اس امر کا البتہ افسوس تھا کہ حضرتِ علامہ انگلستان نہیں جا رہے۔ خیال یہ تھا کہ شاید انگلستان، یا جرمنی، یا مثلاً ویانا میں ان کے علاج کی کوئی بہتر صورت نکل آتی، یا ضمناً اس سے طبی علاج کا افادہ بڑھ جاتا۔

اس کے بعد جو نوازش نامہ موصول ہوا بڑا حوصلہ افزا تھا:۔

لاہور ۱۰ اگست ۳۴ء

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ کا خط مل گیا تھا۔ الحمد للہ کہ بخار جاتا رہا۔ پرسوں سے میں حکیم صاحب کی دوا کھا رہا ہوں۔ اُمید ہے اس دوا سے آواز کی کشائش ہوگی۔

بخار سے جو ترقی معکوس ہو گئی تھی وہ جاتی رہی۔ اب آواز اس حالت پر آگئی ہے جو بخار سے پہلے تھی مگر یہ دوا جو اب آئی ہے زیادہ مؤثر معلوم ہوتی ہے۔

آپ کو معلوم ہے سنگ فساں وہ پتھر ہے جس سے چھری چاقو تیز کرتے ہیں۔ ہندی میں اسے سان کہتے ہیں مگر محاورہ اردو کیا ہے سان پر چڑھانا۔ سان پر چڑھنا یا سان پر لگانا یا سان پر چڑھانا (بغیر حروفِ پر کے) فارسی میں بر فساں زدن، بر فساں کشیدن اور فساں خوردن محاورات ہیں۔ محاورۂ اردو کی

تحقیق کسی سے کیجیے یہاں اردو کی کوئی لغت اس وقت میرے سامنے نہیں۔

ادارے کے متعلق رائے قائم ہے مگر اس کی عملی صورت کے لیے ابھی تک کوئی قدم نہیں اُٹھایا گیا۔ انشاء اللہ ذرا تندرست ہو جاؤں تو خط کروں گا۔ باقی خیریت ہے۔ حکیم صاحب قبلہ کی خدمت میں آداب عرض کریں۔ والسلام۔

محمد اقبال

آواز کے ساتھ صحت بھی ترقی کر رہی ہے۔ یہ خیال بڑا مسرت انگیز تھا اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ حضرتِ علامہ فکرِ سخن کر رہے ہیں جیسا کہ بَینُ السُّطُور سے صاف مترشح ہو رہا تھا۔ تحقیق جیسی بھی تھی عرضِ خدمت کر دی گئی۔

ادارے کا خیال پھر عود کر آیا تھا۔ شب و روز یہی دُعا تھی کہ حضرتِ علامہ کی صحت بحال ہو جائے اور وہ اس کی ابتدا کر دیں۔

محمد اسد لاہور پہنچ گئے۔ ارشاد ہوا:۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السّلامُ علیکم۔

اس سے پہلے خط لکھ چکا ہوں۔ کل مسٹر محمد اسد کی زبانی آپ کا پیغام بھی ملا۔ غذا کی خوراک وہی استعمال میں آتی ہے جو حکیم صاحب نے مقرر کی ہے۔ اب گرمی کم ہو گئی ہے اور ہوا بھی چلتی ہے۔ چند باتیں حکیم صاحب سے دریافت طلب ہیں ان کی خدمت میں عرض کر دیجیے۔

(۱) پہلے کسی قدر قبض تھی مگر پاخانہ کی حالت بہت اچھی تھی۔ اب مجھے صبح پاخانہ تو کھُل کر آتا ہے مگر بہت نرم تر قریباً دست شاید جو دوا نات کو کھائی جاتی ہے وہ دست آمد ہے۔ دن کے وقت انجیر بھی ہر روز ملتان سے منگا کر کھاتا

ہوں وہ بھی قبض کشا ہوتی ہے۔

(۲) لیپ دوا بہت تھوڑی ہے۔ میں ایک گولی جو پان کے پانی میں گھلا کر لگائی جاتی ہے اگر اس کی مقدار دگنی کر دی جائے تو شاید مزید فائدہ ہو۔

آواز میں خفیف سی تبدیلی ہے۔ دوا بدھ کو شروع کی تھی آج ہفتہ ہے گویا آج دوا کھاتے ہوئے چوتھا روز ہے۔ آواز میں hoarseness معلوم ہوتی ہے۔ بلغم کل سے نکلتا ہے۔

ہاں یہ کہنا بھول گیا کہ شام کو مرغ کے چوزہ کا شوربا پیتا ہوں۔ شاید نرم پاخانہ آنے میں اس کا بھی دخل ہو۔

محمد اقبال

۱۱ اگست ۳۴

لیپ حکیم صاحب ہی کا تجویز کردہ تھا۔ اب کے اُنھوں نے سب حالات سُنے تو فرمایا ہم خود بھی ڈاکٹر صاحب کو خط لکھیں گے۔ چنانچہ ۲۶ اگست کا والا نامہ ہے:۔

لاہور۔ ۱۶ اگست ۳۴

ڈیئر نیازی صاحب۔ السّلام علیکم۔

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ حکیم صاحب قبلہ کا خط ملا جس کے لیے اُن کی خدمت میں بہت بہت شکریہ عرض کیجیے۔

دوا کا استعمال جاری ہے بلکہ اس دوا کے استعمال سے کوئی گرمی

محسوس نہیں ہوتی۔ مگر پیشاب کا رنگ کسی قدر زردی مائل ہے۔ اس واسطے خوراک نصف کرنے کی ضرورت نہیں ہے آواز میں کچھ خفیف تبدیلی ہے مگر یہ کئی دن سے ہے اور کشائش آواز میں مزید ترقی نہیں ہوئی۔ ابھی ہفتے کی دوا شاید باقی ہے۔ دو چار روز کے بعد مزید دوا بھجوانے کا انتظام کریں۔

لیپ کی دوا دگنی کر دی گئی ہے۔ شاید حکیم صاحب اس میں کوئی تبدیلی کریں۔ یہ بھی تو ان سے دریافت کیجیے کہ استعمالِ دوا کا سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟ ایک شخص نے مشک کے استعمال کا مشورہ دیا ہے۔ شاید موجودہ دوا میں یہ چیز پہلے سے ہی موجود ہے۔

کتاب کا نام (نشانِ منزل) کی جگہ بالِ جبریل تجویز ہوا ہے۔ جن صاحب نے اس کے لیے گفتگو کی ہے ان سے قطعی فیصلہ کیجیے کہ وہ کس قدر کاپیاں خریدیں گے اور کیا کمیشن چاہتے ہیں۔ جہاں تک میں اندازہ کر سکتا ہوں یہ کتاب جلد ختم ہو جائے گی۔ لوگ یہاں اس کی اشاعت کے لیے بہت منتظر ہیں۔

فی الحال مسافر (سیاحت چند روزہ افغانستان) کی کتابت شروع ہے جو غالباً کل یا پرسوں ختم ہو جائے۔ اس کے بعد بالِ جبریل کی کتابت شروع ہوگی۔ جن صاحب سے آپ نے گفتگو کی ہے اگر وہ آخری اور قطعی فیصلہ کر لیں تو کاغذ کے لیے آرڈر دیا جائے۔ والسلام

محمد اقبال

میرے ذمے کئی کام تھے۔ حکیم صاحب کی خدمت میں حاضری۔ دوائیں بھیجنا۔

ناشرین سے گفتگو۔ ترجمہ کی نظرِ ثانی اور حضرت علامہ کی خدمت میں باقاعدہ ہر بات کی اطلاع۔

چنانچہ میں نے ایک ایک کر کے سب باتوں کا جواب عرض کر دیا۔
بالِ جبریل کا نام جیسا کہ مرقوم ہے اوّل نشانِ منزل تجویز ہوا تھا اور حضرت علامہ مجموعۂ کلامِ اُردو کے سلسلے میں بار بار اسی کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔

۱۸ اگست کا مکتوب ہے :—

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ کے خطوط مل گئے ہیں اور میں ان کا جواب بھی لکھ چکا ہوں۔
حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کر دیں۔ چونکہ مدت سے کوئی زیادہ ترقی آواز میں محسوس نہیں ہوئی۔ اس واسطے اب ڈاکٹر صاحبان بجلی بتلاتے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ آواز درست نہ ہو گی۔ میں بھی کبھی کبھی مایوس ہو جاتا ہوں۔ مگر حکیم صاحب کی توجہ اور اُن کی روحانیت پر بھروسہ رکھتا ہوں۔ دوا اب تین چار روز کی باقی ہے۔ اس واسطے مزید دوا ارسال کروائیے۔ کوئی تبدیلی ضروری ہو تو حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کر دیں۔ لیمپ کی دوا پہلے سے زیادہ ارسال کریں۔ والسلام

محمد اقبال

لاہور۔ ۱۸ اگست ۳۴ء

آواز کی رفتار اب پھر ایک مرحلہ پہ پہنچ کر رُک گئی۔ لیکن ایلوپیتھی بمقابلہ طب کی جنگ میں ڈاکٹر صاحبان کا خوش ہونا بڑی بے جا بات تھی اور ان کے پاس

طرزِ عمل سے حکیم صاحب بھی بڑے متاثر ہوئے، بالخصوص اس لیے کہ ان کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر انصاری مرحوم و مغفور جیسا کہ سب کو معلوم ہے بڑے پایہ کے ڈاکٹر تھے۔ مگر ڈاکٹر صاحب موصوف نے کبھی یہ رویہ اختیار نہیں کیا اور سیاسیات کی طرح طب کی ترویج و ترقی میں بھی جناب مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم و مغفور کے معین و مددگار رہے۔ وہ طب کی خوبیوں کے قائل تھے اور حکیم صاحب مرحوم و مغفور کی بعض معجزانہ تشخیصات اور معالجات کا اعتراف بھی کرتے تھے۔

مسافر اور بالِ جبریل کے سلسلے میں پھر جامعہ کی طرف سے ایک کوشش کی گئی کہ مقابلے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ حضرتِ علامہ نے جواب میں فرمایا:۔

۲۲ اگست ۳۴

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ کا خط ابھی ملا ہے لیکن دواؤں کا پارسل نہیں ملا۔ شاید کل ملے۔ سب سے ضروری دریافت طلب بات یہ ہے کہ مجھے ابتدائے علالت میں بعض دفعہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آنکھ کے سامنے اندھیرا ہو جائے اور سر چکرائے۔ جوں جوں صحت ترقی کرتی گئی۔ یہ بات رفع ہوتی گئی چنانچہ اس سے تین چار روز پہلے تک اس کا نشان تک باقی نہ تھا۔ اب تین چار روز سے پھر ایسا ہوتا ہے حالانکہ میری صحت بہت اچھی ہے۔ مہربانی کر کے حکیم صاحب سے جہاں تک ہو سکے جلد اس کا تذکرہ کیجیے اور ان کے جواب سے مجھے مطلع فرمائیے کہ اس کا باعث کیا ہے۔

کتابوں کے متعلق میں آپ کو دو چار روز میں جواب دوں گا مگر پہلے خط سے یہ نہیں معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب مسافر کے متعلق کیا چاہتے ہیں۔ کمیشن پر رعایت مقصود ہے یا کچھ اور۔ یہ میں سمجھ نہیں سکا وضاحت کیجیے۔ باقی بالِ جبریل کی پہلی ایڈیشن پانچ ہزار کی ہوگی۔ قیمت غالباً ۶ یا زیادہ سے زیادہ ۸ر ہوگی۔ صفحات کی تعداد معلوم ہو جائے تو صحت کے ساتھ عرض کروں گا۔ عبدالمجید صاحب کاتب جس کو آپ جانتے ہیں لکھیں گے اور مطبع گیلانی لاہور میں چھپے گی۔

مسافر صرف ایک ہزار یا زیادہ سے زیادہ پندرہ سو کاپی چھاپنے کا ارادہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے پوچھ لیجیے اگر وہ زیادہ چاہیں تو زیادہ بھی چھپ سکتی ہیں۔ تقریباً ایک سو کاپی کابل جائیں گی۔ چند کاپیاں جن کی تعداد دس سے زیادہ نہ ہوگی خاص کاغذ پر چھپیں گی۔ مہربانی کر کے یہ بھی لکھیے کہ روپیہ کس قدر ادا ہوگا۔ کیونکہ اس پر باقی باتوں کا دار و مدار ہے۔ لیکچروں کے ترجمے کے متعلق آپ نے کچھ نہیں لکھا۔ شرائط کیا طے ہوئے؟ کتاب کے متعلق ڈاکٹر صاحب یا ان کے پریس کے مینیجر کی طرف سے باقاعدہ خط مجھے لکھوائیے جس میں شرائط تمام درج ہوں۔ پھر میں اس کا مسودہ دے دوں گا۔ علیٰ ہذا القیاس بالِ جبریل اور مسافر پہلی ایڈیشن کی خریداری کے متعلق بھی ان کا ایک خط اس قسم کا آنا چاہیے۔ والسلام۔

علی بخش سلام کہتا ہے۔

محمد اقبال

## موتیا بند

یہ غالباً موتیا بند کا آغاز تھا۔ حکیم صاحب نے ویسے ایک سُرمہ تجویز کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب سے معلومات کے بارے میں مفصّل گفتگو ہوئی اور اس کا ماحصل مَیں نے حضرتِ علامہ کی خدمت میں عرض کر دیا۔

یہ بات شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہو کہ منشی عبدالمجید مرحوم 'پروین رقم' پروین رقم بنے تو حضرتِ علامہ ہی کی بدولت۔ حضرتِ علامہ خطّاط تو نہیں تھے لیکن پروین رقم مرحوم کو بڑے قیمتی مشورے دیا کرتے تھے۔ مسافر کا یہ نُسخہ بڑی تھوڑی تعداد میں شائع ہُوا اور حضرتِ علامہ نے ازرہِ عنایت اسی کا ایک نُسخہ راقم الحروف کو بھی بھیجا جو میرے پاس محفوظ ہے۔

لیکن پھر انھیں دنوں حضرتِ علامہ ایک دوسری پریشانی میں مُبتلا ہو گئے۔ یہ بیگم صاحبہ (والدۂ محترمہ جاوید سلمہٗ [۲۵]) کی علالت تھی۔ چنانچہ اب جو والا نامہ صادر ہُوا اس میں صرف اسی کا ذکر تھا:۔

۲۸ اگست ۳۴

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلامُ علیکم

مَیں آپ کو اس سے پہلے لکھ چکا ہوں۔ اس کے بعد آپ کا خط بھی ملا۔ حکیم صاحب کی خدمت میں عرض مندرجہ ذیل ہے:۔

---

۲۵۔ اب ڈاکٹر شیخ جاوید اقبال' ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ بیرسٹر ایٹ لا۔

(۱) آواز میں کوئی نمایاں تبدیلی ابھی تک نہیں ہوئی۔ صورت بہت اچھی ہے اور جو کہ شکایت میں نے ایک دو روز ہوئے لکھی تھی یعنی یہ کہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا ہو جاتا ہے وہ خود بخود رفع ہو گئی ہے۔

(۲) لیمپ کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔

(۳) رات کے سوتے وقت جو دوا کھائی جاتی ہے اگر اس میں پوری مقدار کھائی جائے تو رات کے چار بجے ہی دست آجاتے ہیں اگر تھوڑی مقدار میں کھائی جائے تو بھی دست ہی آتا ہے گو جلاب نہیں ہوتا۔

ان ہر سہ امور کے متعلق جو ان کا ارشاد ہو اس سے آگاہ کیجیے۔

دیگر عرض یہ ہے کہ جاوید کی والدہ مدت سے علیل ہے۔ اس کا جگر اور تلی دونوں بڑھے ہوئے ہیں۔ حکیم صاحب قبلہ نے ایک دفعہ پہلے بھی ان کے لیے ایک دوا تجویز کی تھی جس کا استعمال کیا گیا مگر فائدہ نہ ہوا۔ اس پر حکیم صاحب نے فرمایا تھا کہ وہ ان کی نبض دیکھ لیں تو بہتر ہو۔ اس وقت دہلی جانے کے لیے حالات سازگار نہ تھے۔ اب انشاء اللہ تعالیٰ اکتوبر میں وہ دہلی آئیں گی اور نبض حکیم صاحب کو دکھائیں گی۔ فی الحال ان کے حالات یہ ہیں:۔

(۱) ہاتھوں اور بانہوں کے پٹھے کمزور ہیں۔ چیزوں کو اٹھانے میں دقت ہوتی ہے۔

(۲) شام کو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسا کہ خفیف سی حرارت ہو گئی ہے۔ نفس گرم آتا ہے۔

(۳) ذرا سی گرم شے مثلاً انڈا وغیرہ کھائیں تو زبان میں چھالا پڑ جاتا ہے۔

(۴) پاخانہ تندرستوں کی طرح آتا ہے مگر چار پانچ دفعہ آتا ہے۔

(۵) تلی اور جگر دونوں بڑھے ہوئے ہیں۔ ان کا علاج انجکشن کے ذریعے ایک مدت ہوئی کرایا گیا تھا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا اس کے بعد بعض پیٹنٹ انگریزی اور امریکن دوائیں استعمال کی گئیں ان سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوا۔ حکیم صاحب قبلہ کی خدمت میں عرض کریں کہ مذکورہ بالا حالت کو مدِنظر رکھتے ہوئے ان کے لیے فی الحال کوئی دوا تجویز فرمائیں جس کو وہ اس وقت تک استعمال کریں جب تک وہ خود دہلی حاضر ہو کر ان کو نبض نہ دکھالیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ آج یہاں بھی زور سے بارش ہوئی مگر آفتاب نکل آیا ہے جس کی تمازت بدستور ہے۔

والسلام

محمد اقبال

اس والانامے کا ایک حصہ تو حضرتِ علامہ اور دوسرا بیگم صاحبہ کی علالت سے متعلق ہے۔ ویسے حضرتِ علامہ کی اپنی صحت قابلِ اطمینان تھی اور وہ موسم کا لطف بھی اٹھا رہے تھے جیسا کہ والانامے کے آخری جملے سے ظاہر ہوتا ہے۔ البتہ دہلی تشریف آوری بوجوہ ممکن نہیں تھی۔

لیکن میں ابھی قبلہ حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر نہیں ہوا تھا کہ اسی تاریخ کا لکھا ہوا ایک دوسرا عنایت نامہ موصول ہوا:۔

ڈیر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ کا پوسٹ کارڈ کل مل گیا تھا۔ وہ آنکھوں میں جو اندھیرا سا ہو

جاتا تھا اس میں خود بخود کمی ہو گئی ہے۔ لیکن آواز کی حالت قریباً بدستور ہے۔ دوا کا استعمال جاری ہے۔ حکیم صاحب قبلہ کی خدمت میں یہ عرض کر دیں کہ آواز میں کیوں نمایاں کشائش نہیں ہوئی۔ کتابوں کے متعلق بھی جلد لکھیے یعنی بالِ جبریل، مسافر اور آپ کا اردو ترجمہ۔ ترجمہ الذکر کے متعلق آپ نے جامعہ سے کیا ٹرم طے کیے۔ مقدم الذکر کے متعلق بھی جلد فیصلہ ہونا چاہیے کیونکہ بعض یہاں کے لوگ بھی مثلاً تاج کمپنی استفسار کر رہی ہے۔ میں ذاتی طور پر جامعہ کو ترجیح دوں گا۔ بہتر یہ ہے کہ وہ اپنے طور پر ہر دو کے متعلق ٹرم لکھ بھیجیں تاکہ فیصلہ ہو سکے۔ زیادہ کیا لکھوں۔ امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔

علی بخش سلام کہتا ہے۔ والسلام۔

محمد اقبال۔ لاہور

۲۸ اگست ۳۴ء

میں چاہتا تھا ناشرین اور بالخصوص جامعہ سے کوئی فیصلہ کن گفتگو ہو جائے۔ حکیم صاحب کی خدمت میں بھی اگرچہ جملہ حالات عرض کر چکا تھا لیکن اس زمانے میں خود ان کا مزاج ناساز ہو گیا تھا۔ حضرتِ علامہ منتظر تھے کہ بیگم صاحبہ کے لیے کیا دوا تجویز ہوتی ہے۔ ادھر مجھے یہ پریشانی تھی کہ حکیم صاحب کب اچھے ہو جاتے ہیں تاکہ حضرتِ علامہ کے والا نامے کا جواب عرض کر سکوں۔ اس حیص بیص میں تین چار دن یونہی گزر گئے۔ حضرتِ علامہ نے چند دن تو انتظار فرمایا۔ دوائیں بھی ختم ہو رہی تھیں۔ چنانچہ ۳ ستمبر کا پوسٹ کارڈ ہے:-

۲؍ستمبر ۳۴ء

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم

آج بھی آپ کے خط کا انتظار تھا جو نہیں ملا۔

دوا اب پانچ روز کے لیے باقی ہے۔ مزید دوائی بھیجنے کا انتظام کرنا چاہیے۔ اس وقت شام ہے شاید یہ کارڈ آپ کو پرسوں ملے گا۔ آواز کی حالت بدستور ہے۔ خفیف سی تبدیلی جو کہ مدت ہوئی تھی رہی ہے۔ اس سے آگے نہیں بڑھی۔ باقی حالات پچھلے خطوط میں لکھ چکا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے میرا بدن نئے سرے سے تعمیر ہو رہا ہے مگر تعجب ہے کہ آواز میں نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی۔

باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ والسلام

محمد اقبال لاہور

بدن نئے سرے سے تعمیر ہو رہا ہے مگر تعجب ہے ... اور یہ امر فی الواقع تعجب انگیز تھا۔ مجھے خوب یاد ہے میں نے حکیم صاحب سے اس کا ذکر کیا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی خیال میں ڈوب گئے اور پھر کچھ سوچ کر دواؤں کی ان جلد دار گشتیوں میں جو ان کے دائیں بائیں رکھی رہتیں کبھی ایک دوا پر ہاتھ رکھتے کبھی دوسری پر۔ پھر نسخے میں کچھ ردو بدل کیا اور فرمایا کل پھر حاضر ہو جائیں میں گھر واپس آیا تو حضرتِ علامہ کا تار ملا جس میں دواؤں کے متعلق تاکید مزید کی گئی تھی اور اگلے روز ۴ ستمبر کا لکھا ہوا ایک اور گرامی نامہ۔ حضرتِ علامہ نے شکایتاً فرمایا :-

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

میں آپ کو کم از کم تین خط لکھ چکا ہوں مگر کسی کا جواب نہ ملا۔ کل انتظار کر کے آپ کو تار دیا۔ آج آپ کا ایک پوسٹ کارڈ ملا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو میرا کوئی خط نہیں ملا۔ ایک خط میں جاوید کی والدہ کے حالات حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کرنے کے لیے لکھے تھے۔ معلوم ہوتا ہے وہ خط آپ کو نہیں ملا۔ اگر نہیں ملا تو جلد مطلع کریں تاکہ دوبارہ لکھوں۔

میری صحت اچھی ہے مگر افسوس کہ آواز میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی۔ شاید حکیم صاحب کا علاج کرتے تین دن تو ہو گئے ہوں گے۔ بہرحال ان کی خدمت میں عرض کر دیں کہ آواز کی طرف توجہ دیں۔ صحت خدا کے فضل سے اچھی ہے۔ دوا اب تین چار روز کے لیے باقی ہے۔ والسلام

محمد اقبال

لاہور۔ ۴ ستمبر ۳۴ء

تار کا مضمون تو وہی دواؤں کے متعلق تھا۔ پوسٹ کارڈ میں نے احتیاطاً لکھ دیا تھا۔ حضرت علامہ کا کوئی مکتوب بھی ضائع نہیں ہوا تھا لیکن تین چار روز بڑی پریشانی رہی محض اس لیے کہ ڈاک کا سلسلہ بڑا بے ربط ہو گیا تھا۔ پھر حکیم صاحب کا مزاج بھی ہنوز ناساز تھا۔ اور حضرت علامہ مصر تھے کہ بیگم صاحبہ کے لیے مناسب دوائیں جلد ارسال کی جائیں۔ بہرحال حکیم صاحب قبلہ کی طبیعت دو تین دن میں ٹھیک ہو گئی۔ میں حسبِ معمول حاضرِ خدمت تھا، انھوں نے دوائیں تجویز فرمائیں اور پارسل حضرت علامہ کی خدمت میں بھیج دیا گیا۔

حضرت علامہ کی صحت کچھ بہتر ہوئی تو بیگم صاحبہ کی علالت سے انھیں جو پریشانی تھی اس کے باوجود وہ بعض ایسے اُمور کی طرف متوجہ ہو گئے جو مدت سے ٹل رہے تھے۔ چنانچہ ۹ ستمبر کا عنایت نامہ ہے :۔

لاہور ۹ ستمبر ۳۴ء

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

میں نے جو خط جاوید کی والدہ کے متعلق آپ کو لکھا تھا اس کا جواب مجھے نہیں ملا۔ آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ آپ نے جواب لکھا تھا مگر تعجب ہے مجھ تک نہیں پہنچا۔ آپ کا صرف ایک پوسٹ کارڈ مجھے ملا جس میں حکیم صاحب قبلہ کی علالت کا ذکر تھا اور بس۔

آج دوا کا پیکٹ اور اس خط کا جو اس میں تھا بل گیا ہے۔ اطمینان فرمائیے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا خط کسی چٹھی رساں کی غفلت کی نذر ہو گیا۔

کتابوں کے متعلق عرض یہ ہے کہ سفرنامہ افغانستان کی کتابت ختم ہو گئی ہے۔ دو چار روز میں طباعت شروع ہوگی۔ بالِ جبریل کی کتابت آج سے شروع ہے۔ مکان کی تعمیر چند روز میں شروع ہوگی۔ مجھ کو روپے کی ضرورت ہے۔ اگر یہاں زمین کا انتظام باطمینان ہو گیا تو بہتر ورنہ کچھ کتابیں جامعہ کمیشن پر خرید سکتا ہے آپ مطلع فرمائیں کہ لیکچروں کی کتابت شروع ہوئی یا نہیں؟ ہوئی تو کب ہوگی؟ اس کے متعلق کوئی خط جامعہ کی طرف سے نہیں آیا۔ میں نے اپنی تمام کتابوں کا حقِ تصنیف جاوید کے نام ہبہ کر کے دستاویز رجسٹری کرا دی ہے اور یہ سب مال اس کا ہے۔ چونکہ وہ ابھی نابالغ ہے اس واسطے مجھے اس کا

باقاعدہ حساب رکھنا ہے۔ آپ جامعہ کی طرف سے باقاعدہ خط لیکچروں کی
اشاعت کے متعلق بھجوا دیں اور اس پر جامعہ کے ٹرسٹ یہاں آکر اسے
فائل میں رکھ دیں۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ والسلام

محمد اقبال

مسافر اور بال جبریل کو بالآخر لاہور ہی سے شائع کرنا پڑا۔ خطبات کے سلسلے میں البتہ جامعہ سے گفت و شنید جاری تھی لیکن جامعہ کی مشکلات کے باعث یہ مسئلہ طے ہونے میں نہیں آتا تھا۔ اِدھر میں بھی پریشان تھا۔ حضرتِ علامہ کے ارشادات اور مقدمے کے سلسلے میں ان کی ہدایات کے بغیر ترجمہ شائع نہیں کر سکتا تھا اور یہ جب ہی ممکن تھا کہ لاہور پہنچ کر چند دن ان کی خدمت میں حاضر رہتا، مگر لاہور جانے کی کوئی صورت ہی نہیں تھی۔ حکیم صاحب کی خدمت میں کون حاضری دیتا، دواؤں اور علاج معالجے کا کیا ہوتا۔ بالآخر میں نے ڈاکٹر صاحب سے عرض کیا کہ وہ خود ہی ایک مفصل خط حضرتِ علامہ کی خدمت میں لکھ دیں۔

لیکن اس اثنا میں حضرتِ علامہ کو پھر بخار آگیا تھا۔ ۱۲ ستمبر کا گرامی نامہ یہ ہے:۔

ڈیئر نیازی صاحب۔

اس سے پہلے ایک خط لکھ چکا ہوں۔ جس میں دواؤں کے موصول ہو جانے کی اطلاع تھی۔ اُمید ہے یہ خط آپ کو پہنچ گیا ہوگا۔ کل شام خفیف سا بخار ہو گیا تھا اس واسطے آج صبح سے کونین شروع کی ہے۔ بخار طیریا ہے۔ دو چار روز تک کونین جاری رکھوں گا اور دوا حکیم صاحب قبلہ کی نہ کھاؤں گا۔ حکیم

صاحب سے یہ بھی دریافت کیجیے کہ ان کی رائے میں کب تک دوا کا استعمال جاری رہنا چاہیے۔ نیز کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ یہ دوا ایک ہفتہ دوا کا استعمال چھوڑ کر پھر نئے سے دوا کا استعمال کیا جائے۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ کل کابل سے سردا بھی آگیا ہے اُمید ہے اس سے آواز کو فائدہ ہوگا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی خدمت میں سلام کہیے۔ والسلام

محمد اقبال

لاہور۔ ۱۲ ستمبر ۳۴

میں نے جواباً ایک عریضہ لکھا اور خیریتِ مزاج دریافت کی تو ارشاد ہوا:-

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

ایک خط پہلے لکھ چکا ہوں۔ اس کے جواب میں آپ کا کارڈ بھی مل گیا ہے۔ ایک شخص جو خود اس بیماری کا مریض رہ چکا ہے عراق میں اسے ایک ترک طبیب نے تمباکو میں چرس رکھ کر پلائی تھی اور اس کے ساتھ لیٹن چائے جس میں شکر کی جگہ گڑ ڈالا جائے۔ اس نسخے سے اسے فائدہ ہوا۔ اور صرف تین چار روز کے عرصے میں اس کی آواز صاف ہوگئی۔ کہتا ہے کہ شرطیہ علاج کرتا ہوں۔ آپ حکیم صاحب سے اس کا ذکر کریں کہ آیا چرس کا استعمال آواز کے لیے مفید ہے۔ چرس گولی کی صورت میں ہے اور گولی کتی کے دانے سے بقدر نصف کم ہے۔ حکیم صاحب کی دوا کا استعمال جاری ہے چونکہ آواز پر کوئی نمایاں اثر نہیں ہوتا اس واسطے طبیعت پریشان رہتی ہے۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ آواز کشا گولیوں کا بھی اثر نہیں ہوا۔ سردہ کابل سے منگوایا تھا دو تین روز

یک سگو آواز پر اس نے اچھا اثر نہیں کیا۔ اس واسطے میں نے پرسوں سے اس
کا کھانا چھوڑ دیا ہے۔ لکچروں کے اردو ترجمے کی شرائط طباعت کے متعلق کوئی
خط ابھی تک مجھے جامعہ کی طرف سے نہیں آیا۔ علی گڑھ کے حالات اچھے
نہیں سُننے جاتے۔ خدا تعالیٰ مسلمانوں پر رحم کرے۔ والسلام :

اس خط کا جواب جلدی عنایت ہو۔

محمد اقبال

۱۸ ستمبر ۳۴ء لاہور

چرس اور گڑ اور لیٹن کی چائے' معاذاللہ ! حکیم صاحب نے فرمایا میں ہرگز
اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ کہنے لگے ڈاکٹر صاحب بڑے سادہ مزاج ہیں، ہر
ٹوٹکے پر اعتبار کر لیتے ہیں۔ پھر دفعتہً خاموش ہو گئے' جیسے کوئی خاص امر پریشانی کا
باعث ہو۔ وہ اٹھ میں کچھ رقعہ بدل گیا اور تاکید فرمائی کہ حضرتِ علامہ شنی سنائی باتوں
کو اہمیت نہ دیں۔ معلوم ہوتا ہے اب ان کی ساری توجہ آواز پر تھی۔

علی گڑھ میں اس وقت وطنیت اور اشتراکیت نے اسلامیت کے خلاف
ایک زبردست محاذ قائم کر رکھا تھا۔ حضرتِ علامہ کا اشارہ اسی جانب تھا۔

معلوم نہیں میرا عریضہ ان کی خدمت میں کیوں نہیں پہنچا۔ ۲۱ ستمبر کے
عنایت نامہ میں پھر یہی شکایت تھی :-

ڈیئر نیازی صاحب۔

السلام علیکم۔ اس سے پہلے ایک خط لکھ چکا ہوں۔ اُمید
ہے پہنچے ہوں۔ مجھ کو آپ کا ایک پوسٹ کارڈ اس وقت تک ملا ہے

یہ کارڈ اس اطلاع کے لیے لکھتا ہوں کہ آج کا دن چھوڑ کر چار روز کی دوا باقی ہے۔ حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کر دیں کہ آواز میں ابھی تک کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی جو خفیف سا فرق پہلے تھا وہی اب تک ہے۔ زیادہ کیا لکھوں اُمید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔ والسلام۔

ڈاکٹر ذاکر صاحب سلام قبول کریں۔ علی گڑھ کے حالات اچھے نہیں معلوم ہوتے۔

محمد اقبال

۲۱ ستمبر ۳۴

لاہور

"علی گڑھ کے حالات اچھے نہیں معلوم ہوتے" مَیں نے ذاکر صاحب سے گفتگو کی تو انھیں بھی بہت کچھ آزردہ خاطر پایا۔

اس اثنا میں میرا عریضہ حضرتِ علامہ کے ملاحظے سے گزر چکا تھا۔ ارشاد ہوا:

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلامُ علیکم۔

آپ کا مرسلہ پارسل دوا مع آپ کا خط مل گیا ہے جس سے تسلی ہوئی۔ حکیم صاحب قبلہ کی خدمت میں عرض کیجیے کہ مجھے ان پر کامل اعتماد ہے۔ اس واسطے جب کبھی کوئی شخص دوا بتاتا ہے تو مَیں آپ کی خدمت میں لکھ دیتا ہوں اور دوا بتانے والے سے یہی کہتا ہوں کہ اگر حکیم صاحب نے اجازت دی تو استعمال کروں گا۔ انشاء اللہ ان ہی کی ہدایت پر عمل ہوگا۔

(۱) کیا ان دواؤں میں جو آپ نے اِرسال کی ہیں قبض کا خیال رکھ لیا گیا ہے۔ اس کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔

(۲) حبوب آماز کشا جو آپ نے اِرسال کی تھی ختم ہو گئی ہیں۔ میں انھیں صرف ایک دفعہ دن میں اِستعمال کرتا تھا اور ایک ہی دفعہ تین چار گولیاں مُنہ میں ڈال لیتا تھا اور کچھ وقت تک چوستا رہتا تھا۔ مہربانی کر کے اَور گولیاں حکیم صاحب سے کہہ کر اِرسال کریں۔ آپ نے یہ نہیں لکھا کہ دسط ناشتہ یا غذا میں جو گولی کھانے کے لیے ہے اسے چوسنا چاہیے یا نگل لیا جائے۔ علیٰ ہٰذا القیاس جو رات کے وقت گولی کھائی جائے گی اس کے متعلق بھی کوئی ہدایت نہیں۔ چوسی جائے گی یا نگلی جائے گی نمبر ۱، ۲، ۳ کا جواب بہت جلد اِرسال کریں۔

علی گڑھ کے متعلق جو مَیں نے لکھا تھا اس سے میری مُراد بھی یہی Anti God. [۲۷] سوسائٹی تھی۔ میں نے کسی سے سُنا تھا جس کا مجھے اِس قدر رنج ہُوا کہ تمام رات بے خواب گزری اَور صُبح کی نماز گریہ وزاری کی کوئی حد نہ رہی۔

جامعہ کی طرف سے کوئی خط لکچروں کے متعلق مجھے نہیں ملا۔ مہربانی کر کے وُہ خط بھی بھجوا دیجیے۔ نہیں معلوم کہ آپ کے ترجمے کی کتابت شُروع ہُوئی یا نہیں۔ غرضیکہ اِس کے متعلق اِطلاع جلدی بھجوائیے۔ اَور نیز مطلوبہ خط بھی جامعہ کی طرف سے اِرسال کرائیے۔ باقی دواؤں کے متعلق یہی عرض ہے جو پہلے بھی کئی دفعہ لکھ چکا ہُوں۔ یعنی کہ صحت پر ان کا اثر بہت اچھا ہُوا ہے البتہ آواز پر کوئی

---

۲۷۔ خدا دشمن۔

نمایاں اثر ابھی تک نہیں تھا۔ والسلام۔

علی بخش سلام کہتا ہے۔

والسلام

محمد اقبال

خدا دشمن Anti-God سوسائٹی اگرچہ توڑ دی گئی اور اس کے منتظمین کا اخراج بھی عمل میں آ گیا لیکن یہ امر کہ یہ سب کچھ علی گڑھ ---- مدرسۃ العلوم مسلمانان ---- میں ہوا حضرتِ علامہ کے لیے بڑا تکلیف دہ تھا۔

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی!

بات یہ ہے کہ علی گڑھ کی حیثیت ایک درس گاہ یا مرکزِ تعلیم کی بجائے فی الحقیقت ایک تہذیبی (ثقافتی)۔ سیاسی ادارے کی تھی۔ تحریکِ علی گڑھ کا مزاج جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں ابتدا ہی سے سیاسی تھا اور علی گڑھ (ایم۔ اے۔ او) کالج کو بھی دراصل اسی کا ایک ضمیمہ تصوّر کرنا پڑے گا۔ مقصود یہ تھا کہ مسلمان تعلیم حاصل کریں اور پھر اعلیٰ سرکاری ملازمت ہو یا اور کوئی ذریعہ ہندوستان (قبلِ تقسیم) میں اپنی ملی اور آئینی حیثیت مضبوط کریں۔ لہٰذا بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ علی گڑھ نے مسلمانوں کی کوئی علمی خدمت تو سر انجام دی نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی نظر 'اسلام' 'اسلامی تاریخ' یا 'اسلامی تہذیب و تمدن' کے پیشِ نظر کسی خاص تحقیقی کام پر نہیں تھی۔ اس کی ساری کامیابی اور دوسری سرکاری یا غیر سرکاری درسگاہوں کے مقابلہ میں نمایاں حیثیت وہ مخصوص تہذیبی زندگی تھی جسے علی گڑھ سے منسوب کیا جاتا ہے مگر پھر جب اندرون اور

بیرونِ مُلک کے بدلتے ہوئے حالات نے نواب وقار الملک کو مجبور کر دیا کہ مسلم لیگ کا مرکز علی گڑھ میں نہ رہے تو اس سے علی گڑھ کی اس امتیازی حیثیت ہی کو ضعف نہیں پہنچا جس سے علی گڑھ علی گڑھ بنا، بلکہ اس درس گاہ کے سامنے اب کوئی مقصد ہی نہیں رہا تھا۔ لہٰذا اس کی حیثیت کم و بیش وہی ہوگئی جو دُوسری درسگاہوں کی تھی۔ پھر جب تحریکِ ترکِ موالات اور خلافت نے یہ طے کر دیا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اسلامی تعلیم اور اسلامی زندگی کا وہ نصب العین پُورا نہیں ہوتا جس کے لیے مسلمان سالہا سال سے جدو جُہد کر رہے ہیں تو اس طرح صُورتِ حالات یہاں تک بدل گئی کہ یونیورسٹی کا تعلق قوم اور قوم کا یونیورسٹی سے کٹ گیا۔ لہٰذا علی گڑھ میں بھی الحاد اور بے دینی کے وہ سب اثرات در آگئے جو اُس وقت نوجوانوں میں پھیل رہے تھے۔ بایں ہمہ علی گڑھ کے حق میں یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ بہت جلد ان تباہ کُن اثرات پر غالب آگیا جن سے مسلمانوں کا ملّی استحکام درہم برہم ہو رہا تھا۔ پھر جب ۱۹۳۰ کے خطبۂ صدارت سے ایک اسلامی ریاست اور اس کے بعد پاکستان کا تصوّر ان کے سامنے آیا تو انھیں گویا اپنی کھوئی ہوئی چیز ـــــ یعنی ایک ملّی نصب العین ـــــ واپس مل گئی۔

رہا نواب وقار الملک مرحوم کا یہ فعل کہ انھوں نے سیاست اور تعلیم کے اس جوڑ کو الگ کر دیا جس کا تا دیر قائم رہنا محال تھا۔ سو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ نواب صاحب مرحوم بڑے غیور۔ اور حرّیت پسند بزرگ تھے۔ جامعۂ اسلامیہ یعنی ایک خالص اسلامی یونیورسٹی کا قیام جو سرکاری اثرات سے بالکل آزاد ہو ان کی سب سے بڑی آرزو تھی۔ یہاں علی گڑھ یونیورسٹی کی اس تحریک کا مختصر سا ذکر بھی بڑا بے محل ہوگا جس کی حیثیت سر تا سر سیاسی تھی۔ بہر حال اس تحریک کا لحاظ رکھ لیا جائے

تو نواب صاحب مرحوم نے جو قدم بتقاضائے مصلحت اٹھایا اسے سراسر حق بجانب تسلیم کرنا پڑے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ مسلم یونیورسٹی یا جامعۂ اسلامیہ کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ آگے چل کر یہی خواب جامعۂ ملیۂ اسلامیہ نے دیکھا۔ وہ بھی پورا نہ ہو سکا۔

لہٰذا علی گڑھ میں یہ صورتِ حالات پیدا ہوئی تو انگریزی تعلیم کے مضر اور تباہ کن اثرات کی بدولت جس کی علما نے بجا طور پر مخالفت کی تھی۔ گو ان کا نقطۂ نظر سر تا سر سلبی اور معترضانہ تھا۔ لیکن ان کی اصابتِ رائے کی تائید نتائج سے بہر حال ہو گئی۔ بقول لسان العصر

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے!
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

کاش ہمارے ماہرین تعلیم گزشتہ نصف صدی کے ان نتائج پر غور کریں۔ یہ کہنا کہ یہ انگریزی تعلیم تھی جس کے بدولت مسلمان اس قابل ہوئے کہ غیر مسلمانوں کے دوش بدوش ملک کی سیاسی اور اجتماعی زندگی میں حصہ لیں اس کے جواز کی کوئی دلیل نہیں، نہ یہ کہ اسی تعلیم سے محمد علی اور اقبال ایسی ہستیاں پیدا ہوئیں۔ یہ ہستیاں اس تعلیم کے باوجود پیدا ہوئیں۔

اب کے میرا عریضہ پھر وقت پر نہیں پہنچا۔ لہٰذا ارشاد ہوا:۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

میں آج آپ کے خط کا منتظر تھا مگر غالباً معلوم ہوتا ہے کہ آپ

حکیم صاحب سے ابھی نہیں مل سکے۔ دوا کا استعمال شروع ہے۔ میں صبح کو تیتر اور شام کو بٹیر کھاتا ہوں۔ سبزی کا استعمال بہت کم کر دیا ہے مگر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پاخانہ سُدّہ بن کر گُٹھلیوں کی طرح آتا ہے۔ اس واسطے میں نے دریافت کیا تھا کہ آیا حکیم صاحب نے دوا میں قبض کا خیال رکھ لیا ہے یا نہیں۔ مہربانی کر کے جلد جواب دیں۔ باقی آوازکشا حبوب آپ نے اب تک ارسال نہیں کی۔ حکیم صاحب سے دریافت کر لیں کہ اس کا استعمال ضروری ہو تو ارسال کریں یا اس کی جگہ پان کی جڑ ہی استعمال کی جائے۔ والسلام۔

محمد اقبال ۲۹ ستمبر ۳۴

جامعۂ ملیہ کی طرف سے ابھی تک کوئی خط موصول نہیں ہوا۔ اگر کوئی صاحب جامعہ میں مسز سروجنی نائیڈو کا پتہ جانتے ہوں تو ان سے معلوم کر کے مجھے لکھیے۔

یہ شکایات بھی حکیم صاحب کی خدمت میں پہنچا دی گئیں۔ مسز سروجنی نائیڈو کا پتہ بھی ارسال کر دیا۔ مگر پھر اسی تاریخ کا ایک دوسرا مکرمت نامہ صادر ہوا جس میں صرف بیگم صاحبہ کی علالت کا ذکر تھا:۔

لاہور ۲۹ ستمبر ۳۴ء

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم

میں ابھی ایک پوسٹ کارڈ آپ کے نام ڈاک میں ڈال چکا ہوں۔ ایک ضروری بات لکھنا بھول گیا۔ اب اس خط میں لکھتا ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا آپ نے جاوید کی والدہ کے لیے ایک دوا حکیم صاحب قبلہ سے لے کر ارسال کی تھی۔ وہ دوا ختم ہو چکی

ہے نسخہ انھوں نے کوئی ساتھ نہیں بھیجا تھا کہ اسے ملفوف کر کے بھیجوں۔ حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کر دیں کہ اسے ایک مدت سے یہ شکایت ہے کہ تلی بڑھ گئی ہے اور ساتھ ہی اس کا جگر بھی بہت بڑھ گیا ہے۔ اس وقت زیادہ شکایت اس بات کی ہے کہ اس کے ہاتھ پاؤں کے اعصاب بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ یہاں تک کہ ہاتھ سے کوئی چیز اٹھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس طرح زینے پر چڑھنا بھی تکلیف دہ ہے وہ ان کو نبض دکھانے کے لیے دہلی آئے گی مگر اس وقت ان کے لیے کوئی دوا تجویز کر دیں جس میں اعصابی حالت کو خاص طور پر ملحوظ رکھا جائے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ قبض کی بھی کسی قدر شکایت رہتی ہے۔ والسلام

محمد اقبال

اسی روز شاید میرا عریضہ بھی حضرتِ علامہ کی خدمت میں پہنچ گیا تھا جس کا جواب آپ نے اگلے ہی روز رقم فرما دیا:

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔ آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ الحمدللہ کہ اب آپ کو آرام ہے۔ حکیم صاحب قبلہ کی خدمت میں عرض ہے کہ نئی دوا کے استعمال سے کوئی خاص اثر آواز پر نہیں ہوا۔ دو روز سے پان کی جڑ بھی رکھ رہا ہوں۔ میرے خیال میں اب تمام تر توجہ ان کو آواز کی طرف دینی چاہیے۔ صحت خدا کے فضل و کرم سے بہت اچھی ہو گئی ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ قبض نہ ہونے پائے۔ جاوید کی والدہ صاحبہ کے لیے بھی میں نے دوا کے لیے لکھا تھا۔ حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کر دیجیے۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ آٹھ ماہ کی

علالت (اور علالت بھی ایسی کہ حقیقت میں کوئی علالت نہیں) سے بہت تنگ آ
گیا ہوں۔ والسلام

محمد اِقبال۔ لاہور
۳۰ ستمبر ۳۴

گویا اب بجز جِس صوت حضرتِ علامہ کو کوئی شکایت نہیں تھی۔ پریشانی جو کچھ تھی بیگم صاحبہ کی علالت کی تھی۔ مگر پھر ۵ اکتوبر کے گرامی نامے سے کچھ یوں خیال ہُوا جیسے حضرتِ علامہ کی صحت میں فرق آگیا ہے۔ مَیں نے پریشان ہو کر خیریت مزاج دریافت کی تو ارشاد ہُوا:

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلامُ علیکم۔

دواؤں کا پیکٹ ابھی مِلا ہے۔ اس میں آپ کا خط بھی مِلا۔ الحمدللہ کہ خیریت ہے۔ بہت بہتر ہے جو حکیم صاحب کی رائے ہے اسی پر مَیں بھی قائم ہُوں۔ مگر علی بخش کی رائے ہے کہ جو دوا اس آخری دوا سے پہلے مَیں کھایا کرتا تھا وُہ صحت کے لیے بہت عُمدہ ہے۔ بالخصُوص وُہ جو صُبح کے وقت ذرا سی چاٹ لی جاتی تھی۔ بہرحال حکیم صاحب بہتر جانتے ہیں گزشتہ چند روز سے چہرہ پر جو سُرخی حکیم صاحب کی دوا کے استعمال سے آگئی تھی۔ اب علی بخش اور بعض دیگر آدمیوں کی رائے میں کم ہوگئی ہے۔ آپ حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کر دیں۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ اُمید ہے مزاج بخیر ہوگا۔ اگر حکیم صاحب دوا میں تبدیلی چاہتے ہیں تو بہتر ہے کہ مذکورہ بالا امر کو ملحوظ رکھ کر ابھی ہو جائے۔ والسلام

محمد اِقبال لاہور۔ ۵ اکتوبر ۳۴

اور پھر اس سے اگلے روز ایک دوسرے عنایت نامے میں یہ :-

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔ کل ایک پوسٹ کارڈ لکھ چکا ہوں۔ امید ہے پہنچا ہوگا۔ ایک بات لکھنا بھول گیا۔

پلاؤ کھچڑی اور خشک چاول کے متعلق حکیم صاحب سے مفصل ہدایات حاصل کر کے پھر جلد مطلع کریں۔ رات کو روٹی کا استعمال میری طبیعت اور عادت کے خلاف ہے اور چاول کے استعمال سے اندیشہ ہے کہ بلغم کی تولید نہ ہو۔

پھلوں میں سردہ کا اثر اچھا ثابت نہیں ہوا۔ علیٰ ہذا القیاس انگور کا اثر بھی آواز پر اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ کیا پھلوں کی مائیت کی وجہ سے ہے۔ اس کے متعلق بھی مفصل ہدایات حاصل کر کے مطلع کریں۔ پہلے لکھ چکا ہوں کہ اگر حکیم صاحب کا ارادہ دوا میں تبدیلی کرنے کا ہو تو جلد ہو جائے۔ آواز پر ابھی کوئی خاص اثر کسی دوا کا نہیں ہوا۔

آپ نے مجھے یہ نہیں لکھا کہ لیکچروں کی کتابت شروع ہوئی یا نہیں۔ مہربانی کر کے مطلع فرمائیں۔ جامعہ کی طرف سے کوئی خط ابھی تک نہیں ملا۔ اگر ان کا ارادہ نہ ہو تو کتاب کی طباعت کا انتظام اور جگہ کیا جائے۔ والسلام

محمد اقبال لاہور۔ ۶ اکتوبر ۳۴ء

حسبِ ارشاد میں نے مفصل ہدایات حاصل کر لیں اور حرف بحرف حضرت علامہ کی خدمت میں پہنچا دیں۔ اب آواز پھر ترقی کر رہی تھی۔

خطبات کی کتابت کیسے شروع ہو سکتی تھی۔ جامعہ کی طرف سے آخری فیصلے کا انتظار تھا۔ میں نے یہ امر حضرت علامہ کے گوش گزار کر دیا۔ ۱۱ اکتوبر کا مکرمت نامہ ہے:-

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم

آپ کا مرسلہ پارسل ادویہ ابھی ملا ہے۔ الحمد للہ آج شام سے دوا شروع کروں گا۔ دیگر عرض یہ ہے کہ اب بہ نسبت سابقہ خفیف سی مزید تبدیلی آواز میں معلوم ہوتی ہے۔ خدا کرے اس میں ترقی ہو۔

بادام ہر روز کھاتا ہوں۔ کوزہ کی مصری کے ساتھ کھانے کے بعد۔

پستہ و چلغوزہ چند روز کھایا۔ بعد ازاں خود بخود چھوٹ گیا۔ مجھے تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ بادام مع مصری کوزہ پستہ و چلغوزہ سے زیادہ مفید ہے۔ بہر حال اگر پستہ و چلغوزہ کا التزام بھی ضروری ہے تو کل سے پھر شروع کروں گا۔

پرندوں اور خرگوش کا مغز میں نے آج تک استعمال نہیں کیا۔ میں نے اس سے پہلے آپ کی خدمت میں لکھا تھا کہ مغز خرگوش کا کھانا میرے لیے ناممکنات سے ہے۔ علیٰ ہذا القیاس پرندوں کا مغز۔ مجھے مغز سے خواہ وہ کسی جانور کا ہو سخت کراہیت ہوتی ہے۔ بکرے کا مغز پکا ہوا دیکھوں تو طبیعت متلا جاتی ہے۔ خرگوش کا زندہ ملنا بھی مشکل ہے۔ بکرے کا مغز تو شاید دل کڑا کر کے کھا بھی لوں۔ خرگوش کا مغز یا چڑے کا مغز کھانا بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔ حکیم صاحب قبلہ کی خدمت میں عرض کیجیے کہ ان کی جگہ کوئی اور دوا تجویز فرمائیں تو نہایت مہربانی ہوگی۔ دوا نہیں تو کوئی اور خوراک تجویز کر دیں۔

جاوید کا ماموں دہلی اپنے کاروبار کے لیے آنے والا ہے۔ نئی دہلی میں ان کی دوکان کھلے گی۔ وہ دوکان کھل جائے تو وہ جاوید کی والدہ کے ساتھ

آئے گا۔ علی بخش بھی ہمراہ ہوگا۔ لیکن ابھی تاریخ ان کے آنے کی عرض نہیں کر سکتا۔ پھر اطلاع دُوں گا۔

جامعہ کی طرف سے کوئی خط ابھی تک نہیں مِلا۔ مزید تاکید ہے کہ لیکچروں کے ترجمہ کی اشاعت کی طرف توجہ کیجیے۔ اگر جامعہ تیار نہ ہو تو کتاب ارسال کیجیے۔ مَیں اس کی اشاعت کا یہاں انتظام کروں۔

والسلام۔

محمد اقبال ۔ ۱۱ اکتوبر ۳۴

حکیم صاحب حضرتِ علامہ کی نفاستِ مزاج کے قائل تھے۔ خط سُن کر خاموش ہو گئے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ خاص قسم کی غذا جو حکیم صاحب کے ذہن میں ہے اس کا بدل کیا ہو؟ حضرتِ علامہ کو تو حکیم صاحب کی تجویز کردہ غذاؤں کے استعمال سے قطعی انکار تھا۔ لیکن پھر ان دنوں مَیں بھی بیمار ہو گیا، اس لیے سلسلۂ خط و کتابت جاری نہ رہ سکا۔ مَیں نے معذرت کی تو ارشاد ہُوا:۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلامُ علیکم۔ آپ کا خط ابھی ملا۔ آپ کی علالت کا معلوم کر کے افسوس ہُوا۔ خُدا تعالیٰ صحت عطا کرے۔ حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کریں کہ آواز میں بہ نسبت سابق اب کچھ ترقی ہے۔ الحمدللہ۔ صُبح بلغم بہت نکلتی ہے جس سے تعجب ہوتا ہے کہ اس قدر بلغم کہاں سے آتی ہے۔ بہر حال اس کے نکلنے سے آواز میں اس وقت نسبتاً زیادہ صفائی ہوتی ہے۔ مجھے اُمید ہے یہی تجویز کارگر ہوگی۔ اس دوا کا عام صحت پر بھی اچھا اثر ہے۔ قبض بھی نہیں۔ بادام ہر روز کھاتا ہوں۔ باقی رہا خرگوش کا دماغ۔ سو

اس کے لیے دریافت کروں گا کہ کوئی طریقہ ایسا نکلے جس سے کراہت نہ ہو۔

لیکچروں کے متعلق عرض ہے کہ جو شرائط مکتبہ کے ساتھ طے ہوں وہ صرف پہلی ایڈیشن کے متعلق ہوں گے اور جو روپیہ میرے لیے اُنھوں نے تجویز کیا ہے اس میں اُجرت ترجمہ شامل ہے یا نہیں۔ بہتر ہو آپ چند روز کے لیے آجائیں۔ مزید دوا بھی لیتے آئیں۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوگی۔ رقم جو تجویز ہو یکمشت اور فوراً ادا ہو جائے تو بہتر ہے کیونکہ اب چند روز میں جاوید کے مکان کی تعمیر شروع ہونے والی ہے اور روپے کی ضرورت ہے۔ بالِ جبریل دس ہزار طبع ہوگی۔ اس کی فروخت کا انتظام بھی ہو گیا ہے۔ ایک لوکل کمپنی نے سب کی سب خرید لی ہے۔ مغزِ عصفور کا جوہر کس طرح تیار کرتے ہیں۔ اگر تیار شدہ ممکن ہو تو میں اسے استعمال ضرور کروں گا۔ حکیم صاحب سے یا کسی اور ڈاکٹر سے دریافت کر کے مطلع کریں۔ آپ کب تک لاہور آسکیں گے؟ والسلام۔

محمد اقبال لاہور۔ ۱۹ ستمبر ۳۴ء

اس عنایت نامے سے پھر اطمینان اور تسلی کا ایک پہلو نکل آیا۔ خیال یہ تھا کہ حضرتِ علامہ کی آواز میں بتدریج کشائش پیدا ہوتی چلی جائے گی۔ رہا مغزِ خرگوش کے استعمال کا کوئی ایسا طریق جس سے کراہت نہ ہو سو اس کی صورت یہ تھی کہ جس برتن میں پکے اُسے سربند کر دیا جائے اور پھر اس میں ایک پیالی بھی رکھ دی جائے تاکہ بھاپ کے وہ قطرے جو اس پیالی میں ٹپکیں محفوظ رہیں۔ پھر اس طریق پر بھی شاید عمل

نہیں ہٹایا یا عمل کرنے کا کوئی اِنتظام ہی نہیں تھا۔

میں لاہور جا رہا تھا۔ خیال تھا خطبات کے بارے میں مفصّل گفتگو ہو جائے گی۔ حضرتِ علامہ مُصِر تھے کہ جامعہ نے جو رقم تجویز کی ہے اس میں ترجمے کا معاوضہ بھی شامل ہونا چاہیے اور یہ اس کے باوجود کہ میں بار بار عرض کر چکا تھا میں نے بغرضِ معاوضہ ترجمہ نہیں کیا۔ لیکن ابھی اس والا نامہ کا جواب عرض کرنے نہیں پایا تھا کہ اگلے ہی روز ایک دُوسرا گرامی نامہ موصول ہُوا :۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السّلامُ علیکم۔

کل ایک کارڈ لکھ چکا ہُوں۔ آپ لاہور تشریف لائیں تو یہیں میرے ہاں ٹھہریں اور کتاب سُنائیں۔ اس طرح کام جلدی ختم ہوگا۔ مجھے اُمید نہیں کہ نظرِ ثانی میں میں آپ کی کُچھ زیادہ مدد کر سکُوں تاہم آپ مجھے کتاب سُنائیں۔ ممکن ہے کُچھ مشورہ دے سکُوں۔ کتاب کا دیباچہ لِکھنا بھی ضروری ہے اور یہ آپ خُود لکھیں۔ اس کے متعلق میں آپ کو ضروری مشورہ دُوں گا۔

جاوید کی والدہ بہُت کمزور ہو گئی ہے۔ حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کریں کہ اگر مناسب ہو تو اس کے لیے رُوح الذّہب تجویز کریں۔ اس دوا نے میری صحت پر نمایاں اثر کیا ہے۔ ممکن ہے اسے بھی مفید پڑے۔ اس کے اعصاب بہُت کمزور ہو گئے ہیں اور اگر زیادہ دیر تک بیٹھے تو اُٹھتے ہُوئے سر میں چکّر سا آ جاتا ہے۔ فی الحال جو دوا بھی اس کے لیے تجویز ہو اس میں مندرجہ ذیل باتیں ملحوظ رکھنی چاہئیں :۔

(۱) جگر اور تلی کا بڑھ جانا۔ یہ عارضہ بہُت دیر سے ہے۔

(۲) اعصاب کی کمزوری مثلاً بیٹھ کر اُٹھنے میں تکلیف۔ سو کر چارپائی سے اُٹھنے میں تکلیف۔ معمولی چیزوں کو ہاتھ سے اُٹھانے میں تکلیف۔

(۳) پاخانہ کا دو تین دفعہ آنا۔

(۴) عام صحت کی کمزوری۔

یہ مفصّل حالات حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کر دیں۔

اگر ان حالات کو سُننے کے بعد رُوح الذّہب مناسب ہو تو اس کا استعمال کیا جائے یا یہ دوا منجملہ اَور دواؤں کے۔

مکتبہ جامعہ کی طرف سے مجھے کوئی خط ابھی تک نہیں ملا۔

ہفتہ آیندہ میں اگر آپ آئیں تو میرے لیے اَور جاوید کی والدہ کے لیے دوا (اگر حکیم صاحب تجویز فرمائیں) تو لیتے آئیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیر تیت ہے۔ والسّلام۔

محمد اقبال ۲۰ اکتوبر ۳۴ء

حضرتِ علّامہ کی صحت اچھی تھی۔ مجھے لاہور طلب فرما رہے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ ترجمے کے بعض حصص سُن لیں اَور مقدّمے کے بارے میں بھی مفید مشورہ دے سکیں۔

بیگم صاحبہ کی علالت البتہ بڑی تشویش کا باعث ہو رہی تھی۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السّلامُ علیکم۔

یہ نہ معلوم ہُوا کہ آپ لاہور آئے یا نہیں۔ اگر آئیں تو میرے ہاں

ہی قیام کریں۔ نیز دوا ساتھ لیتے آئیں کیونکہ اب صرف دو تین روز کے لیے دوا باقی ہے۔ اگر آنا ممکن نہیں تو دوا بذریعہ ڈاک ارسال کر دیں۔

جامعہ کی طرف سے ابھی تک کوئی خط موصول نہیں ہوا۔ والسلام

محمد اقبال

لاہور۔ ۲۵ اکتوبر ۳۴ء

مَیں نے اپنی معذوری کا اظہار کیا کہ والدہ ماجدہ کی علالت نے مجھے سفر سے روک لیا تھا۔ جامعہ کی طرف سے خطبات کے بارے میں آخری تحریر پہنچ گئی۔ ارشاد ہوا:۔

لاہور

۲۸ اکتوبر ۳۴ء

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ کا خط مِل گیا ہے۔ آپ کی والدہ ماجدہ کی علالت کی خبر معلوم کر کے تردد ہوا۔ خدا تعالیٰ ان کو شفائے عاجل کرامت فرمائے۔ دوا ختم ہو گئی ہے اور دوا بھجوائیے۔

حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کیجیے کہ آواز میں گزشتہ ہفتہ تبدیلی ہوئی تھی مگر اس سے آگے مزید تبدیلی نہیں ہوئی۔ البتہ صحت بہت اچھی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نمایاں ترقی آواز میں ہو۔ بلغم صبح کے وقت بہت نکلتی ہے اور اس کے نکلنے سے آواز بھی قدرے ہو جاتی ہے۔ غرضیکہ اب آواز کی خاطر کسی ایسے اکسیر کی ضرورت ہے جو بہت جلد اور نمایاں

اثر کرے اور آج کل ایسا اکسیر سوائے حکیم صاحب کے اور کس کے پاس ہے۔ اگر پاس نہیں ہے تو ان کی خدمت میں عرض کریں کہ ایسا اکسیر ایجاد کریں اور اپنے طبّی ذوق کی گہرائیوں سے اسے پیدا کریں۔ مَیں نے آپ کو لکھا تھا کہ عرقِ نقرۂ زر کے ملاخ کا جوہر کسی کیمیاوی طریق سے تیار ہو سکتا ہے یا نہیں۔ مثلاً عرق وغیرہ یا جیسے ماء اللحم تیار کرتے ہیں۔ یہ بات بھی حکیم صاحب سے دریافت کرنے کی ہے۔ اگر انھوں نے عرق کی بلائے دی تو تیار کر دیا جائے گا یا اس کا ماء اللحم تیار کرایا جائے گا۔

حامد علی صاحب کا خط آیا تھا۔ وہ رستم کی ادائگی کے لیے کتاب کی اشاعت سے ایک سال کی میعاد مانگتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر پندرہ سولہ ماہ کے لیے۔ ان سے کہہ دیجیے کہ مَیں ان کے خط کا آخری جواب چند روز تک لکھوں گا۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ حکیم صاحب قبلہ کی خدمت میں آداب عرض کیجیے۔ والسلام۔

محمد اقبال۔ لاہور

آواز کے لیے اکسیر کی طلب تھی اور اصرار یہ تھا کہ حکیم صاحب اسے اپنے طبّی ذوق کی گہرائیوں سے پیدا کریں۔ یہ اس لیے کہ حضرتِ علّامہ کے نزدیک زندگی سرتاسر ایجاد ہے۔ اس میں خلّاقی ہے، طبّاعی ہے۔ یہ اس کا اپنا ذوق ہے جو اس کی رہنمائی کرتا اور اس کو منزلِ مقصود تک لے جاتا ہے۔ حضرتِ علّامہ کے نزدیک اس قسم کی اکسیر کی ایجاد ناممکن نہیں تھی۔ حکیم صاحب مسکرائے۔ فرمایا اللہ ڈاکٹر صاحب کو صحت دے۔ ہم تو اپنی دانست میں جو دوا بھیجتے ہیں اکسیر ہی سمجھ کر بھیجتے ہیں۔

اب کے پھر دواؤں میں تھوڑا بہت ردّو بدل کر دیا گیا۔ رہا دماغ خرگوش کا معاملہ سو اس سلسلے میں کسی کیمیاوی طریق پر عمل نہیں ہو سکا۔

حامد علی صاحب۔ مہتمم مکتبۂ جامعہ کو مَیں نے حضرتِ علامہ کا پیغام پہنچا دیا۔ بیگم صاحبہ کی علالت بڑی نازک صُورت اختیار کر رہی تھی۔ ۲۱ اکتوبر کا مکرمت نامہ یہ ہے:۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلامُ علیکم۔ اس سے پہلے ایک کارڈ لکھ چکا ہُوں۔ اُمّید ہے کہ آپ کے ملاحظہ سے گزرا ہوگا۔ آج دوا کا پیکیٹ مل گیا ہے جس کے لیے شکریہ ہے۔ افسوس کہ جاوید کی والدہ بہت کمزور ہو گئی ہے۔ سفر کے لائق نہیں رہی۔ کچھ اس کو میری بیماری نے بھی پریشان[۲۷] رکھا ہے۔ وُہ نہایت حساس ہے اور ذرا سا فکر اس کو بے چَین کر دیتا ہے میرا ارادہ اُسے دہلی بھیجنے کا تھا مگر اب کیا کیا جائے۔ اس کو صرف یہی شکایت ہے کہ کمزوری اعصاب کی بڑھتی جاتی ہے۔ ہاتھ سے پکڑ کر کوئی چیز مشکل سے اُٹھا سکتی ہے۔ پاخانہ میں پایہ بلند ہو تو اس پر پاؤں رکھنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ چہرہ زرد ہوتا جاتا ہے اور بدن میں لاغری ہے۔ باقی تلی اور جگر کی شکایت اس کی پُرانی ہے۔ فی الحال اس کمزوری نے اسے بہت تنگ کر رکھا ہے اور کوئی شکایت نہیں ہے۔ حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کریں کہ اس کے لیے فی الحال محض اعصاب کو قوی کرنے کی دوا کی

---

۲۷۔ "کو" سہواً رہ گیا ہے۔

ضرورت ہے۔ اگر یہ بات بغیر نبض دیکھے ممکن ہو تو تجویز کریں ورنہ خیر۔ آج تقریباً ایک ہفتہ سے انگریزی گولیاں کھا رہی ہے مگر ان کا کوئی اثر نہیں۔ ڈاکٹر کی تشخیص ہے کہ خون میں rud coupuscles نہیں رہے یا ان کی بہت کمی ہوگئی ہے۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ اُمید کہ آپ کی والدہ اب اچھی ہوں گی۔ شیخ محمد اسد لاہور میں نہیں ہیں۔ مجھے ان کا کوئی خط نہیں ملا۔

والسلام۔

محمد اقبال ۳۱ اکتوبر ۳۴ء

حکیم صاحب نے دوائیں تجویز فرمائیں۔ میں نے جملہ حالات عرض خدمت کیے تو ارشاد ہوا:—

ڈیئر نیازی صاحب۔ الحمد للہ خیریت ہے۔ اب آپ کی والدہ اچھی ہیں۔ حامد علی صاحب کا خط آیا تھا۔ میں نے آپ کو اس سے پہلے لکھ دیا ہے کہ آپ ان سے کہہ دیں کہ چند روز کے بعد ان کے خط کا آخری جواب دوں گا۔ وہ روپیہ کی ادائگی کے لیے بہت طویل مہلت مانگتے ہیں۔ بہر حال وہ میرے جواب کا انتظار کریں۔

حکیم صاحب قبلہ کے بڑے بیٹے اتفاق سے لاہور میں ہیں۔ میں نے ان کو پرسوں بلایا تھا۔ انھوں نے جاوید کی والدہ کی نبض دیکھ کر ایک نسخہ تجویز کیا ہے جو کل سے استعمال ہو رہا ہے۔ وہ چند روز تک دہلی واپس جائیں گے اور حکیم صاحب کی خدمت میں کل حالات عرض کریں گے اس کے بعد حکیم صاحب جو دوا مناسب ہو تجویز فرمائیں۔ اگر یہ خط آپ کو

دوا کی ترسیل سے پہلے مل جائے تو دوا ارسال نہ کریں۔ ورنہ خیر۔ میں یہ دوا حکیم صاحب کے بیٹے کو دکھاؤں گا۔ ہاں نسخہ ارسال کر دیجیے تاکہ یہاں حکیم صاحب کو معلوم ہو جائے کہ دہلی سے کیا دوا آئی ہے۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔

بھائی صاحب سیالکوٹ سے آئے ہوئے ہیں۔ مکان کی تعمیر چند روز میں شروع ہو گی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ خرید زمین اور تعمیر وغیرہ میں اتنی سردردی ہے۔

۵ نومبر ۳۴ محمد اقبال۔ لاہور

میں پھر حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرتِ علامہ کی پریشانی اور بیگم صاحبہ کی علالت کا حال بیان کیا۔

بھائی صاحب یعنی شیخ عطا محمد صاحب مرحوم۔

تعمیرِ مکان، یعنی جاوید منزل کی تعمیر کا سارا کام انھیں کے سپرد تھا۔ رہی یہ شکایت "مجھے معلوم نہ تھا خرید زمین اور تعمیر وغیرہ میں اتنی سردردی ہے"۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ سردردی شیخ صاحب مرحوم ہی نے کی۔ حضرتِ علامہ کو محض اس خیال سے کوفت ہو رہی تھی کہ انھیں اتنی سردردی کرنا پڑی۔ ورنہ تا اختتامِ تعمیر حضرتِ علامہ نے میکلوڈ روڈ والی کوٹھی سے قدم باہر نہیں رکھا۔

آپ کے جو گرامی نامہ موصول ہوا اس میں صرف بیگم صاحبہ کی علالت کا ذکر تھا مگر پھر اس سلسلے میں سب سے زیادہ پریشانی اس وجہ سے تھی کہ حضرتِ علامہ دواؤں کے منتظر تھے اور حکیم صاحب صاحبزادے تھے۔ لہٰذا کوئی دوا تجویز نہ ہو سکی:۔

لاہور - ۱۰ نومبر ۳۴

ڈیئر نیازی صاحب - السلامُ علیکم

(۱) اس سے پہلے مَیں لکھ چُکا ہُوں کہ جاوید کی والدہ کی نبض حکیم صاحب کے بڑے صاحبزادے [۲۸] دیکھ گئے تھے انھوں نے ان کی خدمت میں مفصل عرض کر دیا ہو گا - ان کے مشورہ کے مطابق جو دوا آپ نے ارسال کی تھی اس کا استعمال شروع ہے - ان کی اور شکایت یہی ہے کہ پنڈلیوں کے اعصاب میں کمزوری ہو گئی ہے - زینہ پر چڑھنا ناممکن ہو گیا ہے اور پاؤں کے بل پر بیٹھے تو بغیر دُوسرے کی مدد کے اُٹھنا مُحال ہو جاتا ہے - عام طور پر بھی صحت کمزور ہے - تلی اور جگر کی شکایت پُرانی ہے - ڈاکٹر کہتے ہیں کہ خُون کے سُرخ ذرّے کم ہو گئے ہیں - آپ مہربانی کر کے حکیم صاحب سے اس کا ذکر کریں کہ وُہ اپنے بڑے صاحبزادے سے پُوچھ کر کوئی دوا تجویز کریں - وُہ بیچاری اپنی موجُودہ حالت کی وجہ سے بہُت متفکّر اور پریشان رہتی ہے

(۲) باقی رہا مَیں - سو مَیں گزشتہ خط میں مفصل لکھ چکا ہُوں - جو حالت اس وقت ہے آپ کے پاس وُہ خط محفُوظ ہو گا - مہربانی کر کے یہ خط اور وُہ خط دونوں حکیم صاحب کو سُنائیں اور پُوچھیں کہ آیا یہی دوا جاری رہے گی یا تبدیلی ضروری ہے - ہاں دواؤں سے جواب تک

استعمال کی گئیں صحت پر بہت اچھا اثر پڑا ہے۔ مگر آواز میں بحیثیتِ مجموعی کوئی نمایاں
فرق نہیں ہوا۔ معلوم نہیں یہ بلغم اتنی کہاں سے آتی ہے اور کیونکر پیدا ہوتی رہتی ہے۔
میں کوئی ایسی چیز بھی نہیں کھاتا جس سے بلغم پیدا ہو۔ تاہم جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا
ہوں کھانا کھانے چائے پینے یا پانی پینے کے بعد بلغم نکلتی ہے اور نکلنے کے بعد
آواز نسبتاً صاف ہو جاتی ہے۔ تھوڑی مدت گزرنے کے بعد پھر اسی طرح ہو جاتی
ہے۔ یہ ساری باتیں ان کی خدمت میں عرض کریں۔ پہلا خط بھی ان کو سنائیں اور یہ
دوسرا خط بھی۔ اب شاید یہ ضروری ہو کہ اس بیماری کے لیے اگر کوئی خاص نسخہ )
ہو تو اسے استعمال کیا جائے۔ بجلی کے متعلق پہلے خط میں لکھ چکا ہوں۔ غذا
جو عام طور پر استعمال کرتا ہوں وہ بھی مفصل لکھ چکا ہوں۔ والسلام

محمد اقبال

گویا حضرتِ علامہ کی اپنی صحت فی الجملہ اچھی تھی۔ لیکن بیگم صاحبہ کی علالت نے بڑا متفکر کر رکھا تھا۔ میں نے اس گرامی نامے کے دونوں جز حکیم صاحب کے گوش گزار کر دیے۔ انھوں نے دوائیں تجویز کیں جو اسی روز ارسالِ خدمت کر دی گئیں۔ لیکن پھر اوائل ۱۲ نومبر کا لکھا ہوا ایک کارڈ موصول ہوا:-

۱۲؍ نومبر ۱۹۳۴ء

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

اس سے پہلے خط لکھ چکا ہوں۔ امید کہ پہنچا ہوگا۔ رمضان قریب الاختتام ہے۔ شاید
پرسوں ختم ہو جائے گی۔ اس سے پہلے میں آپ کو لکھ نہ سکا۔ حکیم صاحب کے
بڑے صاحبزادے جاوید کی والدہ کی نبض دیکھ گئے ہیں اور پھر وہ مفصل حالات

حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کریں گے۔ باقی رہا میں۔ سو میری حالت ابھی بدستور ہے۔ آواز میں کچھ ترقی ہوئی تھی مگر وہ ترقی عارضی ثابت ہوئی۔ میں کوئی بدپرہیزی بھی نہیں کرتا۔ البتہ صحت کی حالت ایسی ہے کہ کوئی شخص مجھے بیمار خیال نہیں کرتا۔ حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کیجیے کہ اب کیا صورت اختیار کی جائے۔ وہی دوا جاری رہے گی یا اور کوئی۔ زیادہ کیا لکھوں۔ والسلام

محمد اقبال۔ لاہور

اور پھر دوسری ڈاک میں ایک طویل ملفوف :۔

۱۲ نومبر ۳۴

ڈیر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

ابھی ایک پوسٹ کارڈ ڈاک میں ڈال چکا ہوں۔ چند باتیں بھول گیا اب لکھتا ہوں۔ حکیم صاحب قبلہ کی خدمت میں مندرجہ ذیل باتیں بھی عرض کیجیے :۔

(i) کھانا کھانے چائے پینے مرغ کا شوربا پینے یا پانی پینے [۲۸] بعد بلغم خاص طور پر نکلتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس صبح کے وقت بھی خاص طور پر نکلتی رہتی ہے۔ پہلے یہ بلغم پختہ اور ٹھوس بھی ہوتی تھی اب اس قدر ٹھوس نہیں البتہ لزوجت ہے۔

(ii) بلغم نکلنے کے بعد آواز نسبتاً صاف ہو جاتی ہے۔

(iii) کبھی کبھی دن میں ہچکی بھی ہوتی ہے۔ مگر صرف ایک دفعہ۔ ایسا

۲۸۔ "کے" سہواً رہ گیا۔

دن میں دن بھر میں[۲۹] دو تین دفعہ سے زیادہ نہیں ہوتا۔

(iii) رات کو بے چینی مطلق نہیں ہوتی اور نیند خوب آتی ہے۔

(iv) قبض رہتی ہے۔ پاخانہ کھُل کر نہیں آتا۔

(v) بھوک کسی قدر کم ہو گئی ہے۔ اس دوا سے پہلے جو دوا حکیم صاحب نے ارسال فرمائی تھی اس میں معلوم ہوتا ہے حکیم صاحب نے قبض کا خاص طور پر خیال رکھا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید قبض کو بھی آواز کی ترقی بتعجیل نہ ہونے میں دخل ہو۔ بہرحال اس کا فیصلہ حکیم صاحب کریں گے۔

(vi) غذا میری آج کل حسب ذیل ہے:—

صبح اُٹھتے ہی دوا کا استعمال آٹھ بجے کے قریب چائے مع اُبلے ہوئے انڈوں کے۔ قریباً ۱۲ بجے یا ساڑھے گیارہ بجے کھانا جس میں روٹی اور سبزی میں پکا ہوا گوشت ہوتا ہے۔ کبھی شامی کباب بھی ہوتے ہیں۔ اس کے بعد شہد خالص تین چار تولہ اور بادام رات کو بہت کم کھاتا ہوں۔ یہ میری پرانی عادت ہے۔ بھوک بھی کم ہوتی ہے۔ تاہم کبھی کبھی تھوڑا کھا لیتا ہوں۔ اور مرغ کا شوربا بالالتزام پیتا ہوں خواہ کچھ کھاؤں یا نہ کھاؤں۔ والسلام۔

محمد اقبال

حضرتِ علامہ کو کوئی شخص بیمار تصور نہیں کرتا تھا۔ اب ساری پریشانی بیگم صاحبہ کی علالت کی تھی۔ حکیم صاحب کو بھی اطمینان تھا کہ حضرتِ علامہ کی صحت ترقی

---

۲۹۔ 'دن میں' زیادہ ہے۔ بیماری کے باعث حضرتِ علامہ کے خطوں میں قدرے پریشان نگاری آگئی تھی۔

کر رہی ہے لیکن آواز کا عود نہ کرنا ان کے نزدیک کوئی اچھی علامت نہیں تھی۔ وہ جب دواؤں میں ردّ و بدل کرتے تو اس امر پر اظہارِ افسوس کیے بغیر نہ رہتے کہ حضرتِ علامہ دہلی سے اتنی دور ہیں۔ کاش وہ دہلی آسکتے، یا حکیم صاحب لاہور چلے جاتے، لیکن دونوں میں کوئی بات ممکن نہیں تھی۔

رہی حضرتِ علامہ کی تفصیل نگاری، یا کثرتِ سوالات اور استفسارات جس میں دوا اور پرہیز سے لے کر کھانے پینے کی ایک ایک چیز کے متعلق فرداً فرداً سی بات کی تشریح کی جاتی اس کی وجہ کچھ تو وہی تھی جو اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں، یعنی حکیم صاحب سے بُعدِ جسمانی۔ دوسری یہ کہ حکیم صاحب قبلہ خود بھی ہر امر کی ــــ دوا، پرہیز، دوا کے اثرات، ماکولات، مشروبات ــــ وضاحت چاہتے تھے۔ لہٰذا حضرتِ علامہ کو بھی اپنی طرف سے ہر بات کی تفصیل بیان کرنا پڑتی۔

کناٹ سرکس میں حکیم صاحب نے ایک وقف قائم کر رکھا تھا۔ انکم ٹیکس والوں نے اسے کاروباری ادارہ سمجھ کر ٹیکس لگا دیا۔ حکیم صاحب پریشان تھے مجھ سے فرمایا ڈاکٹر صاحب[۳۰] سے مشورہ طلب کروں۔ میں یہ سارا معاملہ اس سے پہلے عرض کر چکا تھا۔ ارشاد ہوا:

> ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔ آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ اس سے پہلے دو خط میں آپ کو لکھ چکا ہوں۔ حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کیجیے کہ چونکہ ٹیکس کا حکم ہو چکا ہے اس واسطے اس حکم کے خلاف دہلی میں کسی وکیل کی

---

۳۰۔ یعنی حضرتِ علامہ سے۔

معرفت اپیل کرنی ضروری ہے اور اس بنا پر کہ حکیم صاحب کی کل آمدنی وقف ہے کیا ان کا دواخانہ وقف ہے ؟ اگر وقف ہے تو اپیل اور بھی مضبوط ہے۔ اور اگر وقف نہیں مگر اس کی آمدنی وقف ہے تو پھر بھی یہ اچھی وجہ ہے۔ اس کا ثبوت دینا چاہیے۔ یہ بھی اپیل میں لکھنا چاہیے کہ اس سے پہلے بھی اسی بنا پر حکیم صاحب پر ٹیکس نہیں لگایا گیا۔ اس کے ثبوت میں حکیم صاحب کے دواخانے کے رجسٹر پیش ہو سکتے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ ٹیکس افسر وہاں دہلی میں کون ہے۔ بہر حال چونکہ حکم ٹیکس [۳۱] ہو چکا ہے اس واسطے اس کے خلاف اپیل قانونی طریق پر ضروری ہے۔ اپیل بہر حال ضروری ہے۔ باقی اگر کسی کو کچھ لکھنا ہو تو مطلع فرمائیے کہ کس کو لکھنا چاہیے۔ والسلام

محمد اقبال

لاہور۔ ۱۳ نومبر ۳۴

حضرتِ علامہ کا مشورہ حکیم صاحب کی خدمت میں پہنچا دیا۔ چند روز خاموشی رہی۔ بالآخر ۱۹ نومبر کو اول ایک کارڈ اور پھر دوسری ڈاک سے ایک مفصل ملفوف موصول ہوا:۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ اُمید کہ میرے خطوط آپ کو مل گئے ہوں گے میں دوا کا منتظر ہوں۔ حکیم صاحب قبلہ کی خدمت میں تمام حالات عرض کر دیجیے تاکہ وہ دوا تجویز کر سکیں۔ گزشتہ چار پانچ روز سے میں نے کوئی دوا

---

۳۱۔ 'کا' سہواً رہ گیا ہے۔

نہیں لکھائی۔ والسلام

محمد اقبال

۱۹ نومبر ۳۴ء لاہور

مَیں حیران تھا دوائیں کیوں نہیں پہنچیں دواؤں میں خاتمہ ہو رہا تھا۔ لیکن پھر دُوسرے ہی گرامی نامہ سے معلوم ہو گیا کہ اسی روز پہنچ گئیں :۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

مَیں نے آج صبح آپ کو خط لکھا تھا۔ الحمد للہ دوا مرسلہ پہنچ گئی۔ انشاء اللہ کل سے شروع کروں گا۔ حکیم صاحب کے بڑے صاحبزادے عبدالحی انصاری کئی دن ہوئے لاہور آئے تھے پھر وہ واپس بھی چلے گئے۔ مجھ سے وعدہ کر گئے تھے کہ جاوید کی والدہ کے کل حالات حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کر دوں گا۔ حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کیجیے کہ ان سے دریافت کریں۔ باقی رہا انکم ٹیکس کا معاملہ سو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ پادری صاحب کون ہیں۔ لیکن یہ معاملہ آمدنی کا ہے گورنمنٹ روپیہ چھوڑنا نہیں جانتی۔ جب تک انھیں دلائل سے قائل نہ کیا جائے۔ حکیم صاحب کی اپیل ضروری ہے اور حساب دکھا کر ان کو قائل کرنا ضروری ہے۔ حکیم [32] کے چھوٹے صاحبزادے یہاں لاہور میں ہیں مگر وہ شاید جموں چلے گئے ہیں۔ آپ ان کو لکھ دیجیے کہ وہ مجھے پادری صاحب کے نام سے آگاہ کریں۔ ممکن ہے مَیں ان کو جانتا ہوں۔

۳۲۔ صاحب' سہواً رہ گیا ہے۔

اگر ایسا ہوا تو کسی طریق سے ان تک بات پہنچا دوں گا۔ لیکن اپیل مقدم ہے اور حسابات کی جانچ پڑتال۔ انکم ٹیکس آفیسر جس کے سامنے اپیل ہوگی کون ہے؟

محمد اقبال۔ لاہور

۱۹ نومبر ۳۴

اگر آواز نارمل نہ ہوئی تو ویانا جانے کا قصد ہے۔

بالِ جبریل جنوری تک شائع ہوگی۔ والسلام

دوائیں پہنچ گئیں لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ حکیم صاحب کے صاحبزادے کب دہلی تشریف لائیں گے۔ حکیم صاحب کو ان کا انتظار تھا کہ وہ آئیں تو باقاعدہ دوا تجویز کردیں۔ اِدھر میں پریشان تھا کہ حضرتِ علامہ کی خدمت میں کیا عرض کروں۔

پادری صاحب کا نام معلوم نہیں ہوسکا۔ حکیم صاحب نے حضرتِ علامہ کی رائے سے اتفاق فرمایا۔

بیگم صاحبہ کی علالت بڑی تشویش انگیز تھی اور مزید تشویش یہ کہ اس کا اثر حضرتِ علامہ کی صحت پہ اچھا نہیں پڑ رہا تھا۔

افسوس ہے حضرتِ علامہ ویانا نہ جاسکے۔ ممکن ہے ویانا کا علاج کارگر ثابت ہوتا۔ بیگم صاحبہ کے لیے دوائیں نہیں پہنچیں تو حضرتِ علامہ نے دوسرے ہی روز پریشان ہو کر ایک طویل مکتوب رقم فرمایا:۔

۲۰ نومبر ۳۴ء

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلامُ علیکم۔ میں کل آپ کی خدمت میں لکھ چکا ہوں اور اطلاع دے چکا ہوں کہ دوا مل گئی ہے۔ جاوید کی والدہ کے

متعلق تعجب ہے کہ حکیم صاحب کے بڑے صاحبزادے نے ان کی خدمت میں اب تک مفصل حالات عرض نہیں کیے۔ حالانکہ وُہ مجھ سے وعدہ کر گئے تھے کہ جاتے ہی کُل حالات عرض کر دیے جائیں گے۔ بہر حال ان کے لیے نسخہ تجویز کرنے میں میرے خیال میں مندرجہ ذیل باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:۔

(۱) تلی اور جگر کا بڑھا ہُوا ہونا۔ یہ شکایت پُرانی ہے۔

(۲) ... ... ... ... ... ...

(۳) کبھی کبھی بخار کا ہونا۔ یہ ملیریا ہے۔ بخار سردی کے ساتھ ہوتا ہے کہ بعض دفعہ صرف ایک دو گھنٹے رہتا ہے۔ بعض دفعہ چار گھنٹے۔ عام طور پر رات کا کھانا کھانے کے بعد خفیف حرارت محسُوس ہوتی ہے۔ بخار نہیں ہوتا صرف ایسا محسُوس ہوتا ہے کہ گویا خفیف سا بخار ہے۔

(۴) چند روز ہوئے کھانسی بھی تھی مگر اب اس سے آرام ہے۔ تاہم نسخے میں اس کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

(۵) حال میں جو شکایت پیدا ہُوئی ہے وُہ یہ ہے کہ ہاتھوں اور ٹانگوں کے پٹھے کمزور ہو گئے ہیں۔ ہاتھ سے کسی چیز کا پکڑنا مشکل اور زینہ پر چڑھنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ اعصابی نظام بہت کمزور ہو گیا ہے۔ یہ شکایت قریباً پندرہ بیس روز سے پیدا ہُوئی ہے۔ پہلے نہ تھی۔ پاؤں پر جسم کا بوجھ ڈال کر (جیسا پاخانہ بیٹھتے وقت) تو دُوسرے کی مدد کے بغیر اُٹھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پاؤں لٹکا کر بیٹھیں اور دیر کے بعد اُٹھیں تو پھر اُٹھنے میں دقت نہیں ہوتی۔ اس وقت سب سے بڑی تکلیف یہی ہے۔

(۶) ڈاکٹر صاحب نے معائنہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں خون میں سُرخ ذرّوں کی بہت کمی ہو گئی ہے۔

(۷) خون میں خرابی ہے اس بنا پر مَیں نے یہ خیال کیا ہے کہ شاید رُوح الذّہب ان کے لیے مفید ہو۔ حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کر دیں ممکن ہے رُوحُ الذّہب بھی منجملہ ادویۂ دیگر کے تجویز کریں۔ یہ سب حالات ہیں۔ حکیم صاحب کو یہ خط سُنا دیجیے۔ افسوس ہے کہ وہ سفر کے لائق نہیں۔ ورنہ مَیں انھیں وہاں لاتا۔ والسّلام۔

محمد اقبال

اس خط کے جواب میں جلدی کیجیے۔ جلد حکیم صاحب کو دکھائیے اور ادویہ تجویز کرا کر ارسال کرائیے۔

مَیں نے یہ سارا مکتوب حرف بحرف حکیم صاحب کو پڑھ کر سُنا دیا اور اُن کی تجویز کردہ دوائیں بھی روانہ کر دیں۔ لیکن حضرتِ علّامہ منتظر رہے کہ حکیم صاحب اگر صاحبزادہ صاحب سے جملہ حالات سُن لیتے اور پھر بیگم صاحبہ کی علالت کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم کر لیتے تو دوائیں تجویز کرنے میں آسانی ہوتی۔ لیکن ایک ہفتہ گزر گیا اور حکیم عبدالحی صاحب تشریف نہ لائے۔ حضرتِ علّامہ نے پھر اِستفسار فرمایا:۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ مَیں آپ کو جاوید کی والدہ کی علالت کے متعلق خطوط مفصّل لکھ چکا ہوں۔ اُمید کہ آپ نے حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر وہ خطوط سُنا دیے ہوں گے اور حکیم صاحب نے اپنے صاحبزادے سے بھی جو والدۂ جاوید کی نبض بھی دیکھ گئے تھے حالات سُن لیے ہوں گے۔ اب

مجھے دوا کا انتظار ہے۔ یہ بھی ان کی خدمت میں عرض کر دیجیے گا کہ بخار اب
بالکل نہیں ہوتا۔ اعصاب کی شکایت ابھی بدستور ہے۔ دماغ کی کمزوری بھی ہے۔
چنانچہ جب کچھ دیر بیٹھ کر اٹھتے تو دماغ میں چکر سا محسوس ہوتا ہے۔ باقی شکایات
اس کی پرانی ہیں یعنی جگر تلی کا بڑھ جانا اور .. .. ... ... عمر ان کی قریباً
چالیس سال [۲۳] ۔ زیادہ کیا لکھوں۔ امید کہ آپ جلد ان کی خدمت میں حاضر ہو کر
عرضِ حال کریں گے۔ یہ بھی معلوم کیجیے کہ کسی شکل میں ان کے لیے کستوری یا عنبر یا
دونوں کا استعمال ان کے لیے مفید ہوگا یا نہیں۔ روح الذہب بھی ممکن ہے ان کو
فائدہ دے۔

محمد اقبال

۲۹ دسمبر ۳۴

میں پھر حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور پھر حضرتِ علامہ کی خدمت میں مفصل عریضہ تحریر کیا۔ میں ان دنوں کچھ بیمار تھا اور کچھ پریشان بھی۔ میرا ارادہ تھا چند دنوں کے لیے جامعہ سے قطعِ تعلق کر لوں۔ لہٰذا میں نے پھر حضرتِ علامہ سے مشورۃً دریافت کیا کہ کسی تجارتی کمپنی میں کوئی ایسی جگہ مل سکتی ہے جس سے مجھے کاروباری دنیا کا کچھ اندازہ ہو جائے۔ حضرتِ علامہ نے فرمایا:

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔ آپ کا خط ابھی ملا ہے جس سے آپ
کی علالت کی خبر معلوم ہوئی۔ خدا کرے آپ کو جلد صحت ہو۔ بہتر ہے میں

۲۳۔ "ہے" سہواً رہ گیا۔

انشورنس کمپنی سے اس بارے میں گفتگو کروں گا۔ چنانچہ ڈاکٹر دمشتی جو مینجنگ ڈائرکٹر ہیں میں نے ابھی خط لکھا ہے کہ وہ مجھ سے ملیں۔ گفتگو کا جو نتیجہ ہوگا اس سے آگاہ کروں گا۔ حکیم صاحب کی خدمت میں ان تمام خطوط کو جو میں نے والدہ جاوید کے متعلق لکھے ہیں پیش کریں۔ مجھے یقین ہے کہ روح الذہب اسے ضرور فائدہ کرے گی۔ علاوہ ازیں دواؤں کے جو وہ تجویز کریں گے۔ معلوم نہیں حکیم عبدالحی انصاری (صاحبزادے حکیم صاحب) نے حکیم صاحب کی خدمت میں حالات عرض کیے یا نہیں۔ آپ نے خط میں نہیں لکھا۔ باقی میری آواز کی حالت ابھی بدستور ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ پہلے کی نسبت اب کسی قدر ترقی ہے مگر وہ اس قدر کم ہے کہ آیندہ کے لیے توقعات قائم کرنے کی جرأت نہیں ہوگی۔ بہرحال چونکہ مجھے حکیم صاحب پر بھروسہ ہے اس واسطے علاج جاری رہے گا۔ شام کے وقت آواز کی حالت بہتر ہوتی ہے۔ پہلے شام کو اچھی نہ ہوتی تھی۔ شاید مجھے علی گڑھ جانا پڑے۔ اگر ایسا ہوا تو دہلی بھی حکیم صاحب سے ملنے کے لیے ٹھہروں گا۔ والسلام

محمد اقبال

۴ دسمبر ۳۴

حضرتِ علامہ پریشان تھے کہ حکیم عبدالحی صاحب آخر دہلی کیوں نہیں پہنچے۔ ان کی اپنی صحت البتہ اچھی تھی مگر یہ امر بڑا تکلیف دہ تھا کہ آواز کے متعلق آیندہ کے لیے توقعات کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔

حضرتِ علامہ علی گڑھ جا رہے تھے۔ علی گڑھ کے حالات ان کو علی گڑھ کھینچ رہے

تھے۔ مَیں خُوش تھا کہ اس طرح حضرتِ علامہ سے گفتگو اور حکیم صاحب سے ان کی مُلاقات کا ایک موقعہ پیدا ہو جائے گا۔

لیکن مَیں اس گرامی نامے کا جواب عرض کرنے نہیں پایا تھا کہ اگلے ہی روز حضرتِ علامہ کا والا نامہ صادر ہُوا :۔

ڈیئر نیازی صاحب۔

ڈاکٹر متقی مجھ سے آج صبح مِل گئے ہَیں۔ میں نے ان سے آپ کے متعلق گفتگو کی ہے۔ وُہ آج عصر[۳۴] جا رہے ہَیں کل لاہور واپس آجائیں گے اور آپ کو مفصل خط لکھیں گے۔ آپ کا ایڈریس مَیں نے ان کو دے دیا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ ۱۰ یا ۱۱ دسمبر کو ایک دو روز کے لیے لاہور آجائیں اور ان سے بالمشافہ گفتگو کر لیں۔ آمد و رفت کا کرایہ آپ کو کمپنی ادا کرے گی۔ کمپنی کا کاروبار جنوری ۳۵ سے شروع ہو گا چند ہفتوں کی ٹریننگ کے بعد آپ کو انسپکٹر یا آرگنائزر مقرر کر دیا جائے گا۔ اس ٹریننگ کے لیے آپ دسمبر کی تعطیلوں میں لاہور آ سکتے ہَیں۔ ڈاکٹر شریف متقی کے خط کا مضمون بھی یہی ہو گا۔ مگر اس خیال سے کہ وُہ مصروف آدمی ہَیں کہیں بھول نہ جائیں مَیں نے بھی آپ کو کارڈ لکھ دیا ہے۔ باقی خُدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ والسلام

محمد اقبال لاہور

۵ دسمبر ۳۴

---

۳۴۔ 'پر' سہواً رہ گیا ہے۔

اور پھر اس سے اگلے روز ایک اور:

ڈیئر نیازی صاحب۔ اس سے پہلے ایک کارڈ لکھ چکا ہوں اُمید کہ ملا ہوگا۔ کل مجھے دوا کا انتظار رہا اگر آپ نے ۱۰ یا ۱۱ ستمبر کو آنے کا ارادہ کر لیا ہے تو میرے لیے دوا اپنے ساتھ لیتے آئیں۔ البتہ جاوید کی والدہ کے لیے جو دوا ہو اسے بھیج دیجیے۔ باقی حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کر دیجیے کہ جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں جو نسخہ آپ نے سب سے پہلے دیا تھا (جس میں مفرح الذہب وغیرہ تھی) وہ مجھے مقابلۃً زیادہ مفید معلوم ہوتا ہے اب جو نسخہ میں استعمال کر رہا ہوں اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ بلغم بے شمار نکلتی ہے مگر یہ اخراج آواز پر زیادہ موثر نہیں ہوتا۔ کل سر تیج بہادر سپرو مجھ سے ملنے کے لیے آئے تھے وہ بھی حکیم صاحب کے کمالات کا ذکر کرتے تھے حکیم صاحب کی دوا سے ان کو بھی فائدہ ہوا ہے۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ میں بھی حکیم صاحب کے زیرِ علاج ہوں۔ باقی خیریت ہے۔

محمد اقبال لاہور

۶ دسمبر ۳۴

انشورنس کی تجویز کردہ شکل سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لہٰذا میں نے بتشکر اپنی معذوری کا اظہار کر دیا۔

حکیم صاحب سے ملا اور دوائیں ارسال کر دیں۔ میں ان دنوں لاہور کا قصد کر رہا تھا، لیکن حضرتِ علامہ علی گڑھ کا عزم کر چکے تھے ہفتہ عشرہ کی خاموشی کے بعد فرمایا:-

ڈیئر نیازی صاحب۔

کلکتہ میل میں تھرڈ کمپارٹمنٹ نہیں ہے۔ اکتوبر سے بند کر دیا گیا ہے۔ لہذا میں فرنٹیئر میل سے آؤں گا۔ جو سات بج کر پچپن منٹ صبح دہلی پہنچے گی۔ وہاں آدھ گھنٹہ قیام کر کے علی گڑھ روانہ ہو گی جہاں ساڑھے دس بجے پہنچ جائے گی۔

والسلام

محمد اقبال لاہور

۱۸ دسمبر ۳۴

علی الصبح اسٹیشن پہنچا تو حضرتِ علامہ کو خوش و خرم پا کر بڑا اطمینان ہوا۔ بظاہر وہ بالکل تندرست معلوم ہوتے تھے۔ بیگم صاحبہ کی علالت نے البتہ انھیں بڑا پریشان کر رکھا تھا۔ وقت کم تھا۔ علی گڑھ کے بارے میں سرسری طور پر کچھ باتیں ہوئیں لیکن زیادہ تر گفتگو بیگم صاحبہ کے عوارض اور شکایات کے متعلق ہوتی رہی۔

حضرتِ علامہ نے دو روز علی گڑھ میں قیام فرمایا۔ بعد پھر دہلی تشریف لائے۔ حکیم صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بیگم صاحبہ کی علالت کے بارے میں مشورہ ہوتا رہا اور پھر اسی شام کو لاہور روانہ ہو گئے۔ مگر لاہور پہنچ کر خیریت کا خط لکھا تو اس میں ایک نئی تکلیف کا ذکر تھا۔ میں شاید حکیم صاحب سے اس کو بیان کر چکا تھا، کیونکہ حکیم صاحب نے اس کے لیے ایک تیل بھی تجویز فرمایا تھا۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔ بل مع الخیر لاہور پہنچ گیا۔ دوائی شروع کر دی ہے۔ حکیم صاحب سے میں ذکر کرنا بھول گیا۔ شاید آپ نے ذکر

کر دیا تھا۔ اگر نہیں کیا تو اب کر دیجیے کہ میرے دونوں شانوں کے درمیان جو
درد تھی ۳۵ اس ۳۶ افاقہ نہیں ہوا۔ بعض دفعہ میں رات کو اس کی وجہ سے
سو نہیں سکتا۔ اٹھ کر بیٹھ جاتا ہوں تو قدرے ریلیف ۳۷ ہوتا ہے اگر علی بخش
دونوں ہاتھ سے ذرا مل دے تو پھر تھوڑی دیر کے لیے آرام ہو جاتا ہے۔ شاید
دوران خون کی وجہ سے ہو گیا۔ جاوید کی والدہ نے بھی دوا شروع کر دی ہے
تیل جو حکیم صاحب نے دیا تھا وہ بہت قلیل ہے دو چار دفعہ ملنے کے لیے
بھی کافی نہیں ہے اور تیل کی مالش سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔ اس واسطے وہ
کوئی ایسا ۳۸ تجویز کر دیں جو روز روز منگوانا نہ پڑے۔ یہیں سے خرید لیا
جائے باقی خیریت ہے۔ علی بخش سلام کہتا ہے۔ والسلام

محمد اقبال

۲۷ ستمبر ۳۴ء

دراصل احتباس صوت اور دردِ شانہ ہی وہ علامات تھیں جن کا تعلق اصل

---

۳۵۔ سہواً۔

۳۶۔ "سے" سہواً رہ گیا۔

۳۷۔ relief تسکین۔

۳۸۔ "تیل" سہواً رہ گیا۔

مرض سے تھا۔ باقی سب عوارض۔ عوارض اس لیے کہ شروع شروع میں توجہ صرف گلے پر رہی۔ یا پھر یہ خیال تھا کہ دل کے بالائی حصے میں کوئی رسولی tumor سی بن رہی ہے۔ پھر یہ رائے قائم ہوئی کہ شاہ رگ کا پھیلاؤ ہے۔ حبسِ صوت کی بھی متعدد تعبیریں ہوئیں اور گو ۱۹۳۴ء ہی میں حضرت علامہ سے کہہ دیا گیا تھا کہ ان کی حالت مخدوش ہے، انھیں چاہیے وصیت کر دیں لیکن یہ جو کچھ کہا گیا تھا شاید اس وقت کے حالات کے پیشِ نظر۔ یہ امر کہ ان کا مرض فی الحقیقت کیا تھا اس کا پتہ بہت بعد میں چلا اور پھر اس میں بھی خاصا اختلافِ رائے رہا۔ حکیم صاحب نے البتہ ابتدا ہی میں کہہ دیا تھا کہ حضرت علامہ کو ہلکا سا دمہ قلبی ہے۔ گویا حکیم صاحب کی توجہ شروع ہی سے قلب پر تھی۔ انھیں یقین تھا حبسِ صوت ہو یا کوئی دوسرا عارضہ ان سب کی حقیقی علت قلب کی خرابی ہے۔ لہٰذا انھوں نے دردِ شانہ کا سنا تو پریشان ہو گئے گو حتی الوسع اس کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن میں دیکھتا تھا کہ جب کبھی دردِ شانہ کا ذکر آیا ان کے چہرے پر غور و فکر کے آثار پیدا ہو گئے۔ اس حالت میں وہ بار بار دوائیں بدلتے۔ کبھی ایک شیشی پر ہاتھ پڑتا، کبھی دوسری پر۔ دردِ شانہ ہی گویا ان کے مرض کی حقیقی علامت تھی اور میرا خیال ہے حکیم صاحب مرحوم کو اس کا خوب احساس تھا۔

# ۱۹۳۵

خالدہ ادیب خانم

سفرِ بھوپال

بالِ جبریل

مشرق و مغرب

صورِ اسرافیل

بیانات

حادثۂ وفاتِ بیگم صاحبہ

وظیفۂ بھوپال

پھر بھوپال

طلوعِ اسلام

صد سالہ برسی خواجہ حالی مرحوم

ادارۂ معارفِ اسلامیہ

ویانا

فقرِ غیور

چند دنوں میں ۱۹۳۵ کا آغاز ہو گیا۔ حضرتِ علامہ کی صحت ترقی کر رہی تھی۔ آواز میں خفیف سی اصلاح تھی، مگر یہ اصلاح ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ البتہ درد کی تکلیف کچھ مستقل سی صورت اختیار کر چکی تھی اور یہ امر بڑا تشویش انگیز تھا لیکن اس وقت حضرتِ علامہ نے بھی اسے کچھ بہت زیادہ اہمیت نہیں دی۔ حکیم نابینا صاحب علی گڑھ کے سفر سے واپس آ کر گویا آرام کر رہے تھے۔

مگر پھر انہی دنوں مشہور ترکی ادیبہ اور صحافیہ محترمہ خالدہ ادیب خانم جو کسی زمانہ میں انجمنِ اتحاد و ترقی کی رکن اور اتاترک کی شریکِ کار تھیں، لیکن نفاذِ اصلاحات کے بعد اپنے شوہر ڈاکٹر عدنان بے کے ساتھ پیرس میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہی تھیں، ڈاکٹر انصاری کی دعوت پر دہلی تشریف لائیں۔ تقریب پھر وہی تھی، جامعہ میں توسیعی خطبات اور اس لیے ڈاکٹر انصاری مرحوم نے پھر حضرتِ علامہ سے فرمائش کی کہ دہلی آئیں اور موصوفہ کے کسی خطبہ کی صدارت فرمائیں۔ حضرتِ علامہ نے جواباً معذوری کا اظہار کیا اور مجھ سے فرمایا میں ان کی علالت کا حال ڈاکٹر صاحب مرحوم اور ذاکر صاحب پر واضح کر دوں:۔

ڈیر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ کا خط مل گیا۔ الحمد للہ ہر طرح سے خیریت ہے۔ میری آواز کی حالت یہ ہے کہ کسی وقت بہت اچھی ہوتی ہے اور کسی وقت اچھی نہیں رہتی۔ بالعموم میں نے یہ نوٹس کیا ہے کہ دس بجے جو دوا پان میں کھائی جاتی ہے اس کے بعد آواز کسی قدر بیٹھ جاتی ہے۔ اس دوا کا اثر بھی اچھا نہ ہوتا تھا۔ حکیم صاحب سے دریافت فرمائیے انھوں نے کہا تھا یہ خاص الخاص دوا ہے۔ بہر حال جہاں تک

میں اندازہ کر سکا ہوں اس کا اثر مجھ کو خاص طور پر اچھا نہیں بلکہ اس کا اثر بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ پہلی دوا کا تھا۔

دو فل شانوں کے درمیان جو بھی درد ہوتا ہے اس کے متعلق آپ کے خط میں کچھ نہیں ہے۔ معلوم نہیں آپ نے حکیم صاحب قبلہ سے اس کا ذکر کیا یا نہیں۔ یہ درد کبھی کبھی رات کو ہوتا ہے کبھی دن کو بھی ہوتا ہے مگر زیادہ تر رات کو نیند بھی مجھ کو پہلے سے نہایت کم آتی ہے اور بھوک بھی کم لگتی ہے۔ نہ معلوم درد دورانِ خون کی سستی [1] کی وجہ سے ہے۔ ریح کا اخراج پہلے کی نسبت کم ہوتا ہے۔ ممکن ہے اخراجِ ریح نہ ہونے کی وجہ سے یہ درد ہے۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ ڈاکٹر انصاری کا خط آیا تھا وہ خالدہ ادیب خانم کے ایک لیکچر میں صدارت کے لیے بلاتے ہیں افسوس ہے کہ میں اپنی آواز کی وجہ سے لاچار ہوں ورنہ حاضر ہوتا اور خالدہ خانم کے متعلق کوئی مختصر تقریر بھی کرتا۔ والسلام۔

محمد اقبال۔ لاہور

۲ جنوری ۱۹۳۵

ذاکر صاحب کو تو حضرتِ علامہ کی علالت کا بخوبی علم تھا اور ڈاکٹر انصاری بھی اس سے بے خبر نہیں تھے، پھر بھی ان کی خواہش تھی کہ اگر کوئی خاص امر مانع ہو تو حضرتِ علامہ صدارت ہی فرمادیں تقریر نہ کریں۔

درد کا معاملہ بڑا تکلیف دہ تھا۔ میں نے حکیم صاحب سے اس کا ذکر کیا تو بہت

---

۱۔ شاید سستی لکھنا چاہتے تھے۔

متردد ہوئے۔ وہ اگرچہ زیادہ گفتگو نہیں فرماتے تھے ـــــ اور مرض یا اس کے عوارض کے بارے میں گفتگو بھی بھی لاحاصل ـــــ مگر اُنھوں نے بھی یہ رائے قائم نہیں کی کہ اس درد کا سبب احتباسِ ریح ہی ہو سکتا ہے۔ اب کی مرتبہ اُنھوں نے پھر دواؤں میں کچھ تبدیلیاں کیں۔

ہنوز میرا عریضہ لاہور نہیں پہنچا تھا کہ حضرتِ علامہ نے فرمایا :۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلامُ علیکم

اس سے پہلے خط لکھ چکا ہوں۔ یہ کارڈ اس امر کی اطلاع کے لیے لکھتا ہوں کہ آج سات روز کی دوا باقی ہے۔ حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کر دیں کہ حالت میں کوئی خاص فرق نہیں ہوا۔ آواز بدستور ہے۔ شانوں کے درمیان رات کو درد ہوتا ہے جس سے نیند میں خلل واقع ہوتا ہے۔ اگر ریح کا اخراج ہوتا ہے تو درد سے افاقہ رہتا ہے۔ دن میں درد بالعموم نہیں ہوتا۔ آپ نے لکھا تھا کہ جاوید کی والدہ کے لیے تیل بھیجا جائے گا وہ تیل اب تک نہیں ملا۔ میں یہاں سے اس ماہ کے آخیر میں بھوپال جاؤں گا۔ آپ کو پہلے سے مطلع کروں گا تاکہ آپ دوا لے کر مجھے اسٹیشن پر مل جائیں۔ فی الحال جو دوا مطلوب ہے اسے یہاں ارسال کر دیں۔ جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں ابھی سات روز کی دوا باقی ہے۔ پان میں رکھ کر کھانے کی دوا کا اثر بدستور سابقہ اچھا نہیں پڑتا۔ اس واسطے میں نے پرسوں سے اسے استعمال نہیں کیا۔ والسلام

محمد اقبال

لاہور۔ ۵ جنوری ۱۹۳۵

درد شانہ میں کوئی فرق نہیں آیا تھا اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے حکیم صاحب اس سے بڑے متردد تھے۔ بیگم صاحبہ کو بھی بہت کم افاقہ تھا۔ تیل میں روانہ کر چکا تھا اور اس اثنا میں میرا عریضہ بھی حضرت علامہ کی خدمت میں پہنچ گیا تھا۔ پھر کچھ حضرت علامہ کی اس تکلیف اور کچھ اس لیے کہ وہ علی گڑھ سے واپس آ گئے تو میں نے انھیں قدرے مضمحل سا پایا خاص طور پر ان کی خیریت دریافت کی۔ فرمایا:۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ الحمد للہ خیریت ہے۔ میرے کل کے خط سے آپ کو امپریشن[2] ہوا ہے کہ میں بہت مضمحل ہوں۔ میری صحت خدا کے فضل سے ویسی ہی ہے جیسی پہلے تھی۔ صرف شانہ کے درد کی وجہ سے ایک دو رات نیند نہیں آئی۔ درد بھی شدید نہ تھا مگر چونکہ آہستہ آہستہ ہوتی رہتی تھی۔ اس واسطے پوری نیند نہ لے سکا۔ آواز کی حالت بدستور ہے۔ بہرحال انشاء اللہ جنوری کے اخیر تک جاؤں گا۔ اس بارے میں آپ کو پھر خط لکھوں گا۔ اور کچھ کل کے خط میں لکھ چکا ہوں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ والسلام

محمد اقبال

۶ جنوری ۱۹۳۵ء

میں خوش تھا کہ صحت کے متعلق میرا اندیشہ غلط ثابت ہوا مگر یہ درد شانہ! اس سے خیال کہیں کا کہیں پہنچ جاتا تھا۔ طرح طرح کے اوہام پیدا ہوتے، اور بالآخر ایک

۲۔ Impression گمان۔

تشویش انگیز صورت اختیار کر لیتے۔ بھوپال کا قصد بغرض علاج تھا ـــــ علاج بالبرق کے لیے ـــــ چنانچہ ۹ جنوری کا مکرمت نامہ ہے :۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

بالِ جبریل چھپ کر شائع ہو گئی ہے۔ میری کاپیاں ابھی نہیں آئیں۔ اس واسطے آپ تک ابھی کتاب نہیں پہنچی۔ اُمید ہے عنقریب آپ تک پہنچ جائے گی۔

جاوید کی والدہ کے لیے تیل ابھی تک نہیں آیا۔ معاف بھی اس کی تین چار روز کے لیے باقی ہے۔ حکیم صاحب کی خدمت میں مندرجہ ذیل عرض ہے :۔

(۱) چلنے پھرنے کی قوت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ عام صحت کسی قدر بہتر ہو گئی ہے۔

(۲) پاؤں پر کسی قدر ورم معلوم ہوتا ہے۔

(۳) کسی قدر خشک بواسیر بھی ہے۔ ممکن ہے یہ اس تبدیلیِ دوا سے ہو جو حکیم صاحب قبلہ نے دوا میں کی تھی۔

(۴) اجابت تین چار دفعہ دن میں آتی ہے۔

(۵) بھوک کم ہے۔

باقی رہا میں سو شانوں کے درمیان جو درد ہوا تھا وہ embrocation سے جاتا رہا۔ آواز کی حالت بدستور ہے۔ بھوک بھی کم ہے۔ باقی خدا کے فضل سے

---

۳۔ دوائے مالش۔

خیریت ہے۔ اگر قبلہ حکیم صاحب کا ارادہ دوا تبدیل کرنے کا ہے تو آپ وہ تبدیل شدہ دوا بھی ارسال کریں۔ میں غالباً ۲۹ جنوری کو بھوپال جاؤں گا۔ معلوم ہوتا ہے میرے بعض خطوط آپ تک نہیں پہنچے۔ امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

والسلام

محمد اقبال

لاہور۔ ۹ جنوری ۱۹۳۵

"باقی رہا ہیں"۔ یہ الفاظ بڑے پریشان کن تھے۔ معلوم ہوتا تھا حضرتِ علامہ بڑے آزردہ خاطر ہیں۔ مگر رضائے الٰہی پر صابر و شاکر۔ حکیم صاحب بھی ان الفاظ سے بے حد متاثر ہوئے اور دعا فرمائی۔

بیگم صاحبہ کے لیے دوائیں تجویز کر دی گئیں۔ خطوں کا معاملہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں یہ صرف خیال ہی خیال تھا۔ بہرحال اسی تاریخ کا لکھا ہوا ایک دوسرا عنایت نامہ ہے:۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔ میں نے ابھی آپ کو خط لکھا ہے ڈاک میں ڈال چکنے کے بعد دوا کا پیکٹ موصول ہوا۔ اس پیکٹ میں دو شیشیاں ہیں مگر ان کے اوپر کچھ لکھا ہوا نہیں ہے۔ نہیں معلوم یہ دوا میرے لیے ہے یا جاوید کی والدہ کے لیے۔ غالباً میرے لیے ہیں۔ مگر کوئی ہدایت ان شیشیوں پر درج نہیں ہے۔ گو چٹیں ۲ دونوں پر لگی ہوئی ہیں۔ آپ نے لکھا تھا کہ جاوید کی والدہ کے

علیحدہ تیل ارسال کیا جائے گا۔ مگر اس پیکٹ میں کوئی تیل کی شیشی نہیں ہے مہربانی کر کے بواپسی ڈاک مفصل خط لکھیں۔ پیکٹ میں آپ کا خط کوئی نہیں ہے۔ شاید آپ اس میں لکھنا بھول گئے۔ غرضیکہ مفصل ہدایات کی ضرورت ہے۔ کیا یہ دوائیں دونوں میرے لیے ہیں یا جاوید کی والدہ کے لیے۔ اگر میرے لیے ہیں تو کھانے کے متعلق ہدایات کیا ہیں؟ جاوید کی والدہ کے متعلق میں خط لکھ چکا ہوں۔

والسلام۔ محمد اقبال لاہور

۹ جنوری ۱۹۳۵

اس گرامی نامہ سے یہ شبہ پیدا ہو گیا کہ حضرتِ علامہ کے بعض مکتوب یا میرے عریضے ڈاک کی بے ربطی کی نذر ہو گئے۔ بہرحال میں پھر حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مزید ہدایات لیں اور دوائیں بھیج دیں۔ یہ بھی عرض کیا کہ تیل کا پارسل آپ کی خدمت میں بھیج چکا ہوں۔ امید و فرمائیں مل جائے گا۔ حضرتِ علامہ کی خدمت میں دوائیں پہنچیں تو فرمایا:۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ کا پوسٹ کارڈ مل گیا تھا۔ اس سے پہلے میں آپ کو خط لکھ چکا تھا۔ دو شیشیاں تیل کی جو آپ نے بھیجی تھیں وہ بھی مل گئی ہیں۔ اور ان کا استعمال بھی والدۂ جاوید نے شروع کر دیا ہے۔ دوائی اس کی ختم ہو گئی ہے۔ اور میری دوائی بھی ایک دو روز میں ختم ہو جائے گی۔ میں نے جو خط جاوید کی والدہ کے متعلق اور اپنے متعلق لکھا تھا وہ حکیم صاحب کو سنا دیجیے۔

جاوید کی والدہ کے پاؤں پر کسی قدر ورم ہے جس کا اسے بڑا فکر ہو رہا

ہے۔ اس ورم کی طرف حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کیجیے کہ خاص طور پر توجہ کریں۔ بالِ جبریل دو چار روز تک آپ کی خدمت میں ارسال ہوگی۔

بہرحال جاتے ہوئے لکھنؤ ٹھہرا تو ایک آدھ روز ٹھہر جاؤں گا۔ سرہند واپسی پر انشاء اللہ ضرور ٹھہروں گا۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ میری حالت بدستور ہے یعنی صحت اچھی مگر آواز کی حالت بدستور۔ والسلام۔

محمد اقبال لاہور

۱۲ جنوری ۱۹۳۵

بالِ جبریل دوسرے تیسرے روز پہنچ گئی۔ میں نہیں کہہ سکتا مولانا اسلم نے پیکٹ دیکھا تو کس اشتیاق سے کہا اس پر پہلا حق میرا ہے۔ میں نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ مولانا دوسرے روز کتاب واپس لائے تو فرمایا ڈاکٹر صاحب کی شاعری معراجِ کمال کو پہنچ گئی ہے اور پھر اس کے ساتھ اپنا وہ قطعہ بھی سنایا جس کا آخری مصرع یوں تھا:

اوراق میں بکھرے ہوئے جبریل کے پر دیکھ*

جو آگے چل کر طلوعِ اسلام میں شائع ہوا۔ یہاں یہ عرض کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ وطنی اور اشتراکی تصورات نے اس وقت مسلمانوں کے ذہن کو اس حد تک ماؤف کر رکھا تھا کہ بالِ جبریل شائع ہوئی تو جو حضرات اپنے آپ کو شعر و سخن کے نقاد تصور کرتے تھے انھوں نے اس کا مطالعہ کیے بغیر یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اس میں شاعری تو کیا، کچھ بھی نہیں

---

* یہ قطعہ کسی صاحب کے پاس محفوظ ہو تو راقم الحروف کو مرحمت فرمائیں۔

ہوگا۔ لیکن پھر جب بالِ جبریل کا مطالعہ کیا گیا تو اعتراض ہُوا کہ شاعری تو خُوب ہے، لیکن یہ کوہِ اضم اور ریگِ فراج کاظمہ ان اشاروں کو کون سمجھے۔ مَیں نے ایسے ہی ایک بزرگ سے جو خیر سے خُود بھی شاعر تھے اور نسباً کاظمی اور ہاشمی بھی عرض کیا کہ آپ جس تہذیب کی پیداوار ہیں اس کا تو یہی تقاضا تھا کہ کاظمہ اور کوہِ اضم کا نام سُنتے ہی آپ کا دل تڑپ اُٹھتا۔ کیا آپ نے قصیدۂ بردہ نہیں پڑھا ہے۔ شاعر کہتا ہے :

امر هبت الريح من تلقاء كاظمة

واومض البرق فى الظلمات من اضم

اقبال تو مجبور ہے ان روایات کو تازہ رکھنے جو ہماری زندگی کی تار و پود ہیں۔ مَیں بھی تحفظِ اُمّت حفظِ روایات (ملّیہ) ہی سے وابستہ ہے۔ فرمایئے اس میں اقبال کا کیا قصور ہے۔ میں یہ عرض کر چکا تو وہ صاحب کچھ محجُوب سے ہو گئے۔

اہلِ جامعہ کے دل میں پھر یہ اُمّید تازہ ہو گئی کہ حضرتِ علّامہ شاید عابدہ خانم صاحبہ کے کسی خطبے کی صدارت کر سکیں گے۔

حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ حسبِ ہدایت حضرتِ علّامہ کے خطوط حرف بحرف سنا دیے۔ یہ امر قابلِ اطمینان تھا کہ حضرتِ علّامہ کی صحت اچھی ہے۔ آواز کا احتباس البتہ بڑا تکلیف دہ تھا۔

۱۷ جنوری کا مکتوب ہے :—

ڈیئر نیازی صاحب۔ السّلام علیکم۔

آپ کا مرسلہ پیکٹ ابھی ملا ہے۔ الحمدللہ۔ مجھ کو چند روز سے

نقرس کی شکایت سے کل سے افاقہ ہوا ہے۔ ابھی خفیف سا ورم پاؤں پر موجود ہے۔ اُمید ہے دو چار روز تک دُور ہو جائے گا۔ نقرس کی وجہ سے مَیں نے حکیم صاحب کی دوا کا استعمال ترک کر دیا تھا۔ آپ ان سے دریافت کر کے مطلع فرمائیں اور جلد کہ آیا اس خفیف سے ورم کی موجودگی جو نقرس کی وجہ سے ہے مَیں اس نئی دوائی کا استعمال شروع کر سکتا ہوں۔ درد نہیں صرف ورم ہے۔ البتہ زور سے چلوں تو کسی قدر درد بھی محسوس ہوتا ہے۔

خالدہ ادیبہ[۶] خانم کے لیکچر سُننے کا مَیں خود مشتاق تھا مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ بہر حال مَیں ان سے انشاءاللہ ضرور مِلوں گا یا بھوپال جاتے ہوئے یا وہاں سے واپس آتے ہوئے۔ آج صبح سول کا نمائندہ مجھ سے ان کے پہلے لیکچر پر تبصرہ مختصر چاہتا تھا مگر مَیں نہ لکھ سکا۔ شاید کل یا پرسوں بعض باتوں پر جو اُنھوں نے کہی ہیں کچھ لکھ سکوں۔ ایسٹرن ٹائمز نے بھی ان کے خیالات پر تبصرہ لکھا ہے۔

ہاں والدۂ جاوید کے متعلق مَیں یہ لکھنا بھول گیا کہ اس وقت ان کو خونی بواسیر ہے شاید مَیں نے پہلے خط میں بھی لکھا تھا کل بھی خون آیا تھا۔ اور آج کل سے کسی قدر زیادہ۔ حکیم صاحب سے دریافت کر کے مطلع کریں کہ آیا وہ اس حالت میں دوا کا استعمال شروع کر دیں یا خون بند ہونے تک انتظار کریں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔

---

۶۔ حضرت علامہ ادیب کی بجائے ہمیشہ ادیبہ ہی لکھتے۔

جواب دونوں باتوں کا فوراً لکھیے۔ والسلام

محمد اقبال

لاہور۔ ۱۷ جنوری ۱۹۳۵

نقرس کی تکلیف حضرتِ علامہ کو پرانی تھی لیکن اس کا بار بار عود کرنا پریشانی کا باعث ہو رہا تھا کیونکہ حضرتِ علامہ بعض اوقات اس لیے بھی دوا کا استعمال ترک کر دیتے کہ ممکن ہے اس سے تکلیف بڑھ جائے۔ مَیں نے اس کا ذکر حکیم صاحب سے کیا تو اُنھوں نے فرمایا آیندہ ہر دوا میں اس کا لحاظ رکھ لیا جائے گا۔

افسوس ہے سول کے نمایندے کی درخواست پر حضرتِ علامہ محترمہ خالدہ خانم کے خیالات پر تبصرہ نہ کر سکے۔ حالانکہ ان کی تقریروں سے اسلامی تصوّرات کو بڑا ضُعف پہنچ رہا تھا۔ پھر اس وقت کی سیاسی فضا چونکہ سرتاسر قومی اور وطنی سیاست سے مُتاثّر تھی، لہٰذا خانم موصوفہ کے خطبات کا چرچا قومی اخبارات میں بڑے زور شور سے ہو رہا تھا۔ یہ موصوفہ کا نقطۂ نظر سرتاسر "دُنیاوی"[۸] تھا اور مقصد یہ کہ جس طرح بھی بن پڑے کمالیت کی حمایت کی جائے۔ چنانچہ دورانِ تقاریر میں وہ جب "مذہب" (یعنی کلیسا) اور "سیاست" کی اصطلاحیں دو الگ الگ متضاد اور متخالف اداروں کے معنوں میں استعمال کرتیں تو بڑا دُکھ ہوتا۔ شاید ان کے یہی خیالات تھے جن کو دیکھتے ہوئے حضرتِ علامہ کے دل میں بھی ان سے ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا۔

۲۱ جنوری کا مکتوب ہے:-

---

۸- Secular

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ مَیں انشاء اللہ آج شام سے دوا شُروع کروں گا۔ والدہ جاوید کو بھی اب بواسیر کی شکایت رفع ہو گئی ہے۔ وہ پھر آج سے دوا جو آپ نے ارسال کی ہے شُروع کر دے گی۔ تاہم بواسیر کی خاص دعا بھی ارسال کر دیجیے جو حکیم صاحب نے عطا فرمائی ہے پھر کسی وقت کام آ جائے گی۔

خالدہ ادیبہ خانم کے خیالات پر مَیں نے تبصرہ خود نہیں کیا۔ سول کے نمایندے نے کچھ سوالات کیے تھے غالباً کل شائع ہو گا اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو ان کو ناگوار ہو۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔

آپ خالدہ خانم سے ملیں تو میری طرف سے سلام کہیے۔

مجھ کو اب نقرس کی شکایت نہیں رہی۔ والسلام۔

محمد اقبال لاہور

۲۱ جنوری ۱۹۳۵

مَیں نے حضرتِ علّامہ کا سلام موصُوفہ کو پہنچا دیا سول کے نمایندے سے اُنھوں نے جو گفتگو فرمائی وُہ بھی نظر سے گزری۔ لیکن مَیں اس سے پہلے چند باتیں حضرتِ علّامہ کی خدمت میں عرض کر چکا تھا، کیونکہ مجھے بھی موصُوفہ محترمہ کے خیالات سے شدید اختلاف تھا۔ حضرتِ علّامہ کی خدمت میں میرا عریضہ پہنچا تو کم و بیش ان سب خیالات کی تصدیق ہو گئی جو میرے ذہن میں ان کی تقاریر سُن کر پیدا ہُوئے تھے (گو وطن پرست حضرات بہُت خوش ہوئے تھے)۔ ارشاد ہُوا:—

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلامُ علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ الحمد للہ خیریت ہے۔ یہاں بھی خدا کا فضل ہے۔ دوا کا استعمال شروع کر دیا ہے۔ جاوید کی والدہ کے لیے جو دوا ارسال کی گئی ہے ابھی نہیں ملی۔ شاید آج مل جائے۔

بھوپال کے متعلق مفصّل اطلاع دُوں گا مگر ایک دو روز میں جو اطلاع وہاں سے آئے گی۔ اگر اس کی رُو سے لیکچر کی صدارت ممکن ہُوئی تو اس سے بھی مجھے انکار نہیں بشرطیکہ اس امر کا لحاظ رکھا جائے کہ مَیں بولنے سے قاصر ہُوں۔ یہی بات مَیں نے ڈاکٹر انصاری صاحب کو بھی لکھی تھی اور کوئی امر مانع نہ تھا۔ دہلی ٹھہر سکا تو افغان کونسل خانہ[9] میں ہی ٹھہروں گا۔

خالدہ خانم کے متعلق آپ کی رائے دُرست ہے۔ مشرق کی رُوحانیت اور مغرب کی مادّیت کے متعلق جو خیالات اُنھوں نے ظاہر کیے اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظر بہت محدود ہے۔ اُنھوں نے اُنھیں خیالات کا اعادہ کیا جن کو یورپ کے سطحی نظر رکھنے والے مفکّرین دہرایا کرتے ہیں۔ اگر ان کو معلوم ہوتا کہ مشرق و مغرب کے تصادم میں (کلچرل) اُمّیِ عرب کی نبوّت اور قرآن نے کیا کام کیا ہے مگر یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے کیونکہ مسلمانوں کی فتوحات نے اسلام کے کلچرل اثرات کو دبائے رکھا۔ نیز خود مسلمان دو ڈھائی سو سال تک یونانی فلسفے کا شکار رہ

---

۹۔ قنصل خانہ۔

گئے۔ والسلام

محمد اقبال لاہور

۳۰ جنوری ۱۹۳۸

میں نے حضرتِ علامہ کا مکرمت نامہ پڑھا تو اس خیال سے بڑا اطمینان اور مسرت ہوئی کہ میں نے اُن کی خدمت میں جو باتیں عرض کی تھیں غلط نہیں تھیں۔ پھر بعد میں ان کے تبصرے اور اس مکرمت نامے سے اس کی مزید تائید ہو گئی ہے۔

خالدہ ادیب خانم کا مجموعہ خطبات انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں اصل خطبات انگریزی زبان میں ہیں اور مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی طرف سے شائع ہو چکے ہیں۔ خانم موصوفہ بڑی کامیاب صحافیہ تھیں اور عملی سیاست میں بھی خاصا اثر رکھتی تھیں۔ اس سلسلے میں امریکہ کا سفر بھی کر چکی تھیں۔ ترکی کے متعدد انقلاب اُنھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور ان میں حصہ بھی لیا۔ بایں ہمہ ان کے خطبات میں اسلام، اسلامی تاریخ، اسلامی سیاسیات اور بالخصوص دورِ حاضرہ کے احوال اور ان کے پیشِ نظر بلادِ اسلامیہ کے متعلق جو کچھ کہا گیا اسی نقطۂ نظر سے جو ذہنی جغرافی قومیت کے حامی کہہ سکتے تھے۔ پھر چونکہ ان خیالات کا بظاہر ایک تاریخی، مذہبی، فلسفیانہ اور ثقافتی پس منظر بھی تھا جس میں پھر اُنھوں نے مغرب کے سطحی خیال ارباب قلم کی پیروی کی اور جس سے ایک طرح اسلام، اسلام ریاست، اسلامی تہذیب و تمدن کے بارے میں بعض بڑے بنیادی سوالات پیدا ہو جاتے تھے۔ مگر پھر سب سے بڑا سوال جس سے اربابِ صحافت اور سیاست کو دلچسپی تھی یہ تھا کہ اگر خانم موصوفہ کے خیالات درست ہیں تو پھر ہندوستان کی

سیاست اور قومی زندگی کے بارے میں وہ نقطۂ نظر کہاں تک حق بجانب ہے جسے "اسلامی" کہا جاتا ہے اور جس کی حمایت اقبال سے بڑھ کر کسی نے نہیں کی تھی۔ یوں بھی اقبال کے علاوہ اور کون تھا جو ان گوناگوں مسائل کی تشریح کرتا۔ غالباً یہی خیال تھا جو ہیرلڈ کے نمایندے کو حضرتِ علامہ کے پاس لے گیا۔

ہیرلڈ کے نمایندے سے حضرتِ علامہ کی یہ گفتگو شاید ان کے مجموعۂ تقاریر و بیانات میں کہیں محفوظ ہے۔ بہرحال اس مکالمے میں ان کے ارشادات، سوالات کی تفصیل اس مجموعۂ مکتوبات میں نہیں سما سکے گی۔ مشرق کی روحانیت اور مغرب کی مادیت کے بارے میں یہ عام خیال تو سب کو معلوم ہے کہ یورپ کے سطحی بیں مستشرقین کی رائے میں مشرق روحانیت کا گھر ہے۔ جتنے بھی مذاہب تھے یہاں پیدا ہوئے۔ مغرب میں ہمیشہ مادیت پرستی کا زور رہا۔ یعنی زندگی اور حرکت کے لیے ہمیں یورپ کا رُخ کرنا چاہیے۔ باقی وہ ارشادات کا تعلق اسلام ہی نہیں تاریخِ عالم سے بھی ہے۔ حضرتِ علامہ کا کہنا یہ تھا کہ ایک تو اسلام کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کرنا چاہیے کہ عالمِ انسانی میں جو نزاع و جدال ابتدائے تہذیب سے اس لیے رونما ہوا کہ فرد ہو یا جماعت اس کی زندگی کو جس لحاظ سے دیکھیے نہ اس کے گوناگوں تقاضوں ہی میں کوئی ربط و ارتباط موجود تھا، نہ دوسرے افراد اور جماعتوں سے۔ لہٰذا عالمِ انسانی میں مذہب ہو یا اخلاق، سیاست ہو یا اجتماع ہر پہلو اور ہر حیثیت سے جو تصادم جاری تھا اس کو دور کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی، بجز اس کے کہ اجزائے حیات کی شیرازہ بندی کسی نئی اساس پر ہو۔ یہ اساس اسلام نے بہم پہنچائی۔ ان کا مزید ارشاد یہ تھا کہ اسلام کا مطالعہ اس

لحاظ سے بھی دیکھا جائے کہ وہ ایک ثقافتی تحریک ہے جس کا انکشاف زمانِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں ہوا۔ لیکن جس کے اثرات پھر بعد کی سیاسی تبدیلیوں سے دب گئے۔

بہرحال حضرت علامہ جامعہ تشریف لا رہے تھے لیکن کب؟ بالآخر ۲۹ جنوری کے والا نامے سے اطلاع پہنچی :۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

میں ۲۹ جنوری شام کو یہاں سے روانہ ہو کر ۳۰ کی صبح کو دہلی پہنچوں گا۔ فرنٹیر میل [10] سے سفر کروں گا۔ جیسے کہ پہلے لکھ چکا ہوں کونسل خانہ میں قیام کروں گا۔ افسوس کہ خالدہ خانم کے کسی لیکچر کی صدارت کرنا ناممکن ہوگا۔ کیونکہ دہلی صرف ایک روز ٹھہرنے کا موقع ہوگا۔ باقی خیریت ہے دوا ابھی میرے پاس ہے مزید دوا کے لیے اسٹیشن پر گفتگو ہوگی۔ پھر آپ اسے بھوپال (معرفت سر راس مسعود ریاض منزل) ارسال کر دیں۔ والسلام۔

محمد اقبال لاہور

۲۶ جنوری ۱۹۳۵

یہ مکتوب بڑا مایوس کن تھا لیکن پھر اسی روز دوسرا عنایت نامہ موصول ہوا :۔

---

۱۰۔ Frontier Mail وہ ڈاک گاڑی جو اس زمانے میں پشاور سے لاہور اور دہلی ہوتے ہوئے براستہ راجپوتانہ بمبئی جاتی تھی۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السّلامُ علیکم۔

اس سے پہلے خط لکھ چکا ہُوں۔ ۲۹ کی شام کو چلُوں گا اور ۳۰ کی صُبح کو دہلی پہنچُوں گا۔ اگر اس تاریخ کو نہ چل سکا تو آپ کو بذریعہ تار مطلع کرُوں گا۔

۳۰ کی صُبح کو آپ حکیم صاحب سے وقت مقرر کر دیں تو بہتر ہوگا کیونکہ میرا قصد ہے کہ اسٹیشن سے اُتر کر پہلے اُنھیں کی خدمت میں حاضر ہوُں اور جاوید کی والدہ کے حالات بیان کرُوں۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر کوئی اور وقت دیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے کل میری آواز تمام روز نسبتاً بہتر رہی۔

والسّلام۔

محمد اقبال

لاہور۔ ۲۷ جنوری ۱۹۳۵

لہٰذا پھر توقّع پیدا ہوگئی کہ حضرتِ علّامہ دہلی آئے تو جامعہ بھی تشریف لا سکیں گے، حتّٰی کہ دُوسری ڈاک سے یہ توقّع یقین سے بدل گئی۔ حضرتِ علّامہ نے فرمایا :—

ڈیئر نیازی صاحب۔ السّلامُ علیکم۔

ابھی ایک خط لکھ چکا ہُوں۔ وُہ ڈاک میں ڈال چکنے کے بعد یہ معلُوم ہُوا کہ بلاسیر کے لیے جو دوا حکیم صاحب نے بھیجنے کا وعدہ فرمایا تھا اور جس کا ذکر آپ کے ۲۱ جنوری کے پوسٹ کارڈ میں ہے وُہ اس

وقت نہیں پہنچی ۔ مہربانی کر کے ان کی خدمت میں عرض کیجیے کہ وہ دوا جلد ارسال فرمائیں ۔ ان میں ایک تو خارجی استعمال کے لیے مرہم تھی اور دوسری گولیاں ۔ یہ دوا جلد آنی چاہیے ایسا نہ ہو کہ میری روانگی کے بعد ان کی ضرورت پڑ جائے ۔ والسلام

محمد اقبال

۲۷ جنوری ۱۹۳۵

میرے دونوں پوسٹ کارڈ یہ اور جو پہلے صبح لکھ چکا ہوں ایک ہی وقت میں آپ کو ملیں گے ۔

محمد اقبال

میں حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضرتِ علامہ کی تشریف آوری کی اطلاع کر دی ۔ دوا بھیج دی ۔

جامعہ کی طرف سے بھی اعلان ہو گیا کہ حضرتِ علامہ ایک خطبے کی صدارت فرمائیں گے ۔

۳۰ کی صبح کو حضرتِ علامہ دہلی تشریف لائے ۔ قیام زیادہ تر قنصل خانے میں سردار صلاح الدین سلجوقی کے یہاں رہا ۔ گو دار السلام بھی تشریف لے گئے ۔ سردار صاحب موصوف کو حضرتِ علامہ سے بڑی گہری عقیدت تھی ۔ ہمیشہ باپ اور مرشد کے الفاظ استعمال کرتے ۔ فارسی کے سینکڑوں دیوان ان کو ازبر تھے ۔ قنصل خانے کی یہ صحبتیں بڑی پر لطف ہوتیں اور پھر افغانی پلاؤ کا تو ذکر ہی کیا ہے ۔ یہ بجائے خود ایک نعمت تھی ۔

اسی شام کو حضرتِ علامہ نے خانم کے ایک خطبہ کی صدارت فرمائی۔ گو دقتباسِ صوت کے باعث تقریر نہ کر سکے لیکن سرسری طور پر موصوفہ سے کچھ گفتگو ہوتی رہی مگر حضرتِ علامہ نے کوئی بحث نہیں چھیڑی، نہ موصوفہ کو ان کے غلط خیالات پر متنبہ کیا۔ حضرتِ علامہ کا رویّہ یہ تھا کہ محترمہ ہماری مہمان ہیں۔ ان کا احترام اور خاطر و مدارات ہم پر فرض ہے۔ ان سے گفتگو میں کوئی بات ایسی نہیں ہونی چاہیے جو باعثِ کدورت ہو۔

حضرتِ علامہ بھوپال پہنچے میں نے خیریتِ مزاج دریافت کی تو فرمایا:—

بھوپال - ریاض منزل

۵ فروری ۱۹۳۵

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ کا خط کل ملا۔ الحمد للہ خیریت ہے۔ کھانسی کی شکایت اب باقی نہیں رہی۔ بھوپال کا موسم نہایت عمدہ ہے امید ہے اس کا اثر صحت پر بہت اچھا پڑے گا طبی معائنہ کل ختم ہوا۔ یہاں کے ڈاکٹر نہایت ہوشیار ہیں۔ اور ہسپتال بھی نہایت عمدہ ہے۔ طبی معائنہ سے جو نہایت مکمل تھا حکیم صاحب کی بہت سی باتوں کی تائید ہوئی۔ بہرحال آج گیارہ بجے سے "ultra violet rays" کا غسل شروع ہو گا۔ جو ابتدا میں صرف ۷ منٹ روزانہ ہو گا۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔

---

۱۱۔ مادرا بنفشی شعاعوں۔

والسلام۔

محمد اقبال

۵ فروری ۳۵

بھوپال کی آب و ہوا حضرت علامہ کو خوب راس آئی۔ پھر یہ امر بڑا اطمینان بخش تھا کہ ڈاکٹر صاحبان کو حکیم صاحب کی تشخیص سے اتفاق ہے۔ بھوپال کا موسم بھی خوب تھا۔ ماورا بنفشی شعاعوں کا علاج شروع ہوا تو فرمایا:۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

اس سے پہلے ایک خط لکھ چکا ہوں۔ دوائی جو آپ نے ارسال کی تھی مل گئی ہے امید ہے آواز والی دوائیں بھی لاہور پہنچ گئی ہوں گی۔ بجلی اور ultra violant ray سے علاج شروع ہے۔ ایک آدھ ہفتے کے بعد معلوم ہو گا کہ اس سے فائدہ ہوتا ہے یا نہیں۔ ڈاکٹر صاحبان یقین دلاتے ہیں کہ ضرور ہو گا۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے ہر طرح خیریت ہے۔ بھوپال میں موسم نہایت عمدہ ہے۔ فروری کے اخیر تک بلکہ مارچ تک ویسا ہی رہے گا۔ اعلیحضرت نواب صاحب اس وقت دہلی [12] میں۔ ۱۷ فروری کو واپس آئیں گے۔ والسلام

محمد اقبال بھوپال

۹ فروری ۱۹۳۵

۱۲۔ 'میں' سہواً رہ گیا۔

میں خوش تھا کہ بھوپال کی آب و ہوا حضرتِ علامہ کی طبیعت کے عین مطابق ہے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ بھوپال کا علاج کہاں تک کامیاب ہوتا ہے۔ بیگم صاحبہ کے لیے دوائیں برابر بھیجی جارہی تھیں لیکن کسی وجہ سے ایک پارسل وقت پر نہیں پہنچا جس کی اطلاع حضرتِ علامہ کو ہوئی تو فرمایا :۔

بھوپال۔ ریاض منزل

۱۱ فروری ۳۵

ڈیر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

اس سے پہلے ایک اور خط لکھ چکا ہوں۔ امید ہے پہنچا ہوگا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ آپ نے جاوید کی والدہ کے لیے دوائے کر دہلی سے اسی روز روانہ کر دی تھی جس روز میں دہلی سے بھوپال روانہ ہوا مگر بھائی صاحب ،، کا ایک خط ۹ فروری کا لکھا ہوا آج مجھے بھوپال میں ملا جس سے معلوم ہوا کہ دوا آج تک نہیں پہنچی۔ مہربانی کرکے فوراً ڈاکخانہ سے دریافت کریں کہ کیا معاملہ ہے اور اگر ممکن ہو تو اور دوائے کر جلد ارسال کر دیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ یہاں [۱۳] موسم بہت اچھا ہے۔ بجلی کا علاج شروع ہے۔ میں انشاءاللہ آخیر فروری تک واپس ہوں گا۔ والسلام

محمد اقبال

اس خط کا جواب جلد دیں۔

۱۳۔ "کا" شاید سہواً رہ گیا۔

دوائی کے پارسل کا وقت پر مریض تک نہ پہنچنا بڑا سنگین[۱۴] معاملہ ہے جس کا ڈاک خانہ کو سختی سے نوٹس لینا چاہیے۔ آپ کے علاوہ حکیم صاحب کو بھی چاہیے کہ ڈاک خانہ سے باز پرس کریں۔

لیکن پھر شاید اسی روز اطلاع پہنچ گئی کہ دواؤں کا پارسل مل گیا۔ لہٰذا دوسرے ہی عنایت نامے میں ارشاد فرمایا:۔

بھوپال ۔ ۱۱ فروری ۳۵

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

میں نے آپ کو ابھی ایک خط دوا کے متعلق لکھا ہے۔ بھائی صاحب کا خط لاہور سے آیا تھا کہ دوا مرسلہ نیازی صاحب ابھی نہیں پہنچی۔ مجھے اس سے بہت تعجب ہوا کیونکہ آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ دوا ارسال کر دی ہے۔ مگر اب معلوم ہوا کہ آپ کی مرسلہ دوا کا پارسل لاہور پہنچ گیا تھا مگر وہاں سے ڈاکخانہ لاہور نے اسے بھوپال بھیج دیا کیونکہ میں آتی دفعہ ڈاکخانہ کو ہدایت دے آیا تھا کہ میرے خطوط اور پارسل بھوپال بھیج دیے جائیں۔ چونکہ آپ نے یہ پارسل میرے پتے پر بھیجا تھا اس لیے ڈاکخانہ والوں نے وہیں سے اس کو بھوپال redirect[۱۵] کر دیا۔ لہٰذا آپ متردد نہ ہوں۔ میں یہ پارسل یہاں سے لاہور بھیج رہا ہوں۔ والسلام

محمد اقبال

۱۴۔ سنگین۔
۱۵۔ روانہ۔

میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں دواؤں کا پارسل ہمیشہ رجسٹرڈ ارسال کیا جاتا تھا اس لیے مجھے اپنی جگہ پر اطمینان تھا کہ ضرور مل جائے گا۔

پھر انھیں دنوں میں میرے ایک عزیز کو اینڈرسن صاحب سے ایک ضرورت پیش آئی۔ ان کے معاملات کا آخری فیصلہ انھیں کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے حضرتِ علامہ کی خدمت میں لکھا تو ارشاد ہوا:۔

بھوپال ۱۳ فروری ۱۹۳۵ء

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم

آپ کو میں نے کل دو خط لکھے ہیں۔ اُمید کہ پہنچے ہوں گے۔ دوا کا پارسل جو جاوید کی والدہ کے لیے تھا لاہور سے واپس ہو کر یہاں آگیا تھا اب میں نے اسے کو وہاں بھیج دیا ہے۔ بجلی کا علاج ابھی صرف چار دفعہ ہوا ہے۔ کچھ خفیف سا فرق آواز میں ہے مگر زیادہ وضاحت سے آٹھ دس دفعہ کے علاج کے بعد معلوم ہوگا۔ اس واسطے آپ ابھی حکیم صاحب والی دوا ارسال نہ کریں۔

موسم بہت اچھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب صبح و شام دیکھتے ہیں۔ اور بہت پُر اُمید ہیں کہ مہینے کے اختتام تک نمایاں فرق ہوگا۔ نبض کی حالت دورِ دل اور پھیپھڑوں کی حالت بہت عمدہ ہے۔ میں انشاء اللہ اس ماہ کے آخر تک واپس ہوں گا۔ بشرطیکہ کوئی خاص امر مانع نہ ہوا۔ آپ نے لکھا ہے اینڈرسن سے کوئی کام نکل سکتا ہے یا نہیں۔ مجھے معلوم نہیں اینڈرسن کون ہیں اگر آپ کی مراد اس اینڈرسن صاحب سے ہے جو پنجاب

میں محکمۂ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے تو وہ آشنا ہیں۔ اس نام کے کسی اور صاحب کو میں نہیں جانتا۔ مفصل لکھیں کہ یہ کون صاحب ہیں اور آپ کو ان سے کیا کام ہے۔ یہ ٹکٹ آپ کے خط میں کیسا ہے۔ شاید غلطی سے رہ گیا ہوگا۔ والسلام۔

محمد اقبال

میں نے عرض کیا آپ کا قیاس درست ہے یہ اینڈرسن صاحب وہی ہیں جو محکمۂ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے۔ لیکن اب ان سے توسّل کی ضرورت نہیں۔ ٹکٹ (ڈاک) واقعی غلطی سے لفافے میں رہ گئے تھے۔ بھوپال میں مزید قیام کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا ۲۷ فروری تک۔ مجھے انتظار تھا حضرتِ علامہ کب واپس تشریف لاتے ہیں۔ بالآخر ۲۸ فروری کو ایک پوسٹ کارڈ پہنچا جس میں لکھا تھا:-

بھوپال

۲۷ فروری ۳۵ء

ڈیئر نیازی صاحب۔ میں ۷ یا ۸ مارچ کی شام کو یہاں سے چلوں گا اور ۸ یا ۹ کو ساڑھے نو بجے دہلی پہنچوں گا وہاں ایک دو روز قیام کروں گا آپ سردار صلاح الدین سلجوقی صاحب کو بھی مطلع کر دیں۔ بعد میں پھر میں آپ کو اور ان کو بذریعہ تار یا خط مطلع کروں گا۔ باقی بوقتِ ملاقات۔ والسلام

محمد اقبال

لیکن حضرتِ علامہ چند روز اور رُک گئے۔ میں سردار صاحب کو اطلاع کر ہی چکا تھا ۲۸ کی صبح احتیاطاً اسٹیشن بھی چلا گیا، لیکن حضرتِ علامہ تشریف نہیں لائے۔ میں نے چند روز انتظار کیا۔ بالآخر اطلاع پہنچی :۔

بھوپال۔ ۴ مارچ ۳۵

ڈیئر نیازی صاحب۔ السّلامُ علیکم۔

میں ۷ کی شام کو یہاں سے چلوں گا۔ ۸ کی صبح دہلی پہنچ جاؤں گا۔ یہ گاڑی ۹ بجے یا ساڑھے نو بجے دہلی پہنچتی ہے۔ ۸ کا دن دہلی ٹھہروں گا اور ۹ کی شام لاہور روانہ ہو جاؤں گا۔ آپ سردار صلاح الدین سلجوقی صاحب کو بھی مطلع کر دیں۔ میں نے ان کو علیحدہ خط بھی لکھ دیا ہے۔ اس کے علاوہ حکیم صاحب سے بھی ۹ کی صبح کا وقت (۸ یا ساڑھے آٹھ) مقرر کر دیں۔ ان سے ملے بغیر لاہور جانا ٹھیک نہیں۔ ہاں راغب احسن صاحب کو مطلع کر دیں۔ اُن کا پتہ یہ ہے :

[15] 2 Canning Lane

New Delhi

باقی انشاءاللہ وقتِ [16] ملاقات۔ والسلام

محمد اقبال

۱۵۔ ۲ کیننگ لین نئی دہلی۔

۱۶۔ بوقت۔

حسبِ قرار داد حضرت علامہؒ کی صبح کو دہلی تشریف لائے۔ صحت نہایت اچھی تھی۔ معالجینِ بھوپال کو یقین تھا ان کے علاج سے حضرتِ علامہ کا مرض جاتا رہے گا۔ حضرتِ علامہ نے فضل خانہ ہی میں قیام فرمایا۔ اگلے روز حکیم صاحب سے ملے، نبض دکھائی، بیگم صاحبہ کی علالت اور دواؤں کے بارے میں گفتگو فرماتے رہے۔ شام کو واپس لاہور تشریف لے گئے۔ دس کی صبح کو لاہور پہنچے اور اگلے ہی روز ارشاد فرمایا:۔

لاہور۔ ۱۱ مارچ ۳۵

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

میں بخیریت لاہور پہنچ گیا۔ جاوید کی والدہ نے دوا آج سے شروع کر دی ہے۔ وہ اب چل پھر سکتی ہے اور بواسیر کی شکایت بھی نہیں ہے مگر اور شکایتیں بہت ہیں۔ ان کی طرف حکیم صاحب کی توجہ دلائیے اور مجھے جلد مطلع کیجیے۔

(۱) جگر بہت بڑھ گیا ہے۔ اس پہلو پر لیٹنا بھی مشکل ہے۔

(۲) رات کو کھانسی بہت آتی ہے۔

اُمید کہ آپ مع الخیر ہوں گے جواب جلدی۔ والسلام

محمد اقبال

یہ والا نامہ بڑا مختصر تھا اور بیگم صاحبہ کی علالت سے متعلق۔ بہر حال یہ امر باعثِ اطمینان تھا کہ انھیں حکیم صاحب کی دواؤں سے فائدہ ہو رہا ہے۔ لیکن پھر دوسری ہی ڈاک سے اسی تاریخ کا لکھا ہوا ایک اور والا نامہ صادر ہوا جس میں بیگم

صاحب کے عوارض زیادہ تفصیل سے بیان کیے گئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا حضرت علامہ بڑے پریشان ہیں :-

لاہور۔ ١١ مارچ ٣٥ء

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم

میں آج صبح آپ کو خط لکھ چکا ہوں۔ اس میں ایک دو باتیں رہ گئی ہیں جو بعد میں معلوم ہوئیں۔ یہ بھی حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کریں۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں :-

(i) جگر بہت بڑھ گیا ہے جس کی وجہ سے اس پہلو پر جس کی طرف جگر ہے لیٹنا اور سونا ناممکن ہو گیا ہے۔

(ii) کھانسی بہت ہوتی ہے بالخصوص رات کے وقت بڑے تکیہ پر سہارا لے کر بیٹھوں یا لیٹوں تو کھانسی کم ہوتی ہے لیکن معمولی تکیہ پر سیدھا لیٹنے سے بہت ہوتی ہے۔

ان دو باتوں کے علاوہ مندرجہ ذیل باتیں حکیم صاحب کی توجہ کے قابل ہیں :-

(iii) پاؤں پر ورم ہے۔ اس کے لیے بھی کوئی دوا تجویز ہونی چاہیے۔

(iv) جگر کے لیے کوئی لیپ تجویز ہونا چاہیے جو مؤثر ہو۔ سختی اور فربہی کو کم کرے۔

(v) جسم دبلا ہو گیا ہے کوئی ایسی دوا تجویز ہو جس سے جسم میں فربہی پیدا ہو۔

والسّلام

محمد اقبال

حسبِ ارشاد حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جُملہ حالات عرض کیے اور ان کی ہدایت کے مطابق ایک مفصّل عریضہ حضرتِ علّامہ کی خدمت میں تحریر کر دیا۔ کوئی ہفتہ بھر خاموشی رہی۔ معلوم ہوتا تھا حضرتِ علّامہ کی ساری توجّہ اب بیگم صاحبہ کے علاج پر ہے۔ چُنانچہ ۲۰ مارچ کا عنایت نامہ ہے :۔

ڈیئر نیازی صاحب ۔ السّلامُ علیکم ۔

آپ نے لکھا تھا کہ دوائی کھانسی کے لیے جاوید کی والدہ کے لیے ارسال کی جائے گی۔ میں مُنتظر ہُوں۔ ابھی تک دوا نہیں پہنچی۔ بہرحال اب کھانسی کا قدرے آرام ہے۔ گو ابھی کلیتہً رفع نہیں ہُوئی۔ خاص شکایت جگر اور تلی کی ہے جس سے وہ دِن بدن لاغر اور کمزور ہو رہی ہے۔ ذرا اس میں طاقت آ جائے تو میں اسے ایک روز کے لیے دہلی بھیج دُوں گا تاکہ حکیم صاحب نبض دیکھ لیں۔ باقی خیریّت ہے۔ میری حالت بہتر ہے۔ والسّلام۔

محمد اقبال لاہور

۲۰ مارچ ۳۵

لیکن بیگم صاحبہ تشریف نہیں لائیں۔ حکیم صاحب حتی المقدور علاج تدبیر کر رہے تھے۔ ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ میں پریشان تھا کہ حضرتِ علّامہ نے اپنی علالت کے بارے میں کچھ لکھا نہ بیگم صاحبہ کے۔ مگر پھر افسوس ہے اس اثنا

ہیں ان کی حالت زیادہ تشویشناک ہوگئی تھی۔ حضرت علامہ نے گھبرا کر لکھا کہ ممکن ہو تو حکیم صاحب ہی لاہور تشریف لے آئیں :-

لاہور - ۲۷ - دسمبر ۱۹۳۵ء

ڈیئر نیازی صاحب - السلام علیکم -

میری حالت تو بہتر ہے مگر جاوید کی والدہ دن بدن کمزور اور لاغر ہوتی جاتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ سفر کے قابل ہو جائے تو ایک روز کے لیے دہلی جا کر حکیم صاحب قبلہ کو نبض دکھا آئے مگر افسوس ہے کہ وہ اس قابل نہیں بلکہ اندیشہ ہے کہ سفر سے اس کی تکلیف میں اضافہ نہ ہو جائے۔ سوال یہ ہے کہ اب کیا صورت کی جائے۔ یہاں کے اطبا پر مجھے اعتبار نہیں۔ انگریزی علاج سے مزمن امراض میں فائدہ نہیں ہوتا۔ علاوہ اس کے یہ طریقِ علاج پہلے آزمایا بھی جا چکا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ایک روز کے لیے حکیم صاحب قبلہ لاہور تشریف لے آئیں۔ مجھے معلوم نہیں ان کی فیس کیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ خود ضعیف ہیں۔ معلوم نہیں کہ باہر تشریف لے جایا کرتے ہیں یا نہیں۔ یہ سب حال معلوم کر کے اطلاع دیں اگر وہ کچھ کم فیس قبول کر لیں تو میں ان کی عنایت کا بہت شکر گزار ہوں گا۔ ایک سال سے زیادہ مدت ہوئی ہے کہ میں اپنی علالت کی وجہ سے کچھ کام نہیں کر سکا۔ آمدنی کے ذرائع مسدود ہو گئے ہیں۔ تاہم یہاں تک ممکن ہو گا میں حکیم صاحب کے سفر کا بار اٹھانے کو حاضر ہوں۔ وہ رات کو وہاں سے سفر کریں اور صبح یہاں پہنچیں۔ پھر اسی شام کو رخصت ہو سکتے ہیں۔ زیادہ

کیا عرض کروں سوائے اس کے کہ میں پریشان خاطر ہوں۔

والسلام

محمد اقبال

حضرتِ علامہ واقعی بڑے پریشان تھے۔ ان کا خود یہ لکھنا کہ میں پریشان خاطر ہوں کوئی معمولی بات نہیں تھی، اس لیے کہ بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی پریشانی ان کے پاس نہیں پھٹکتی۔ ایلوپیتھک علاج ناکام ثابت ہو رہا تھا۔ بد قسمتی سے حکیم صاحب کا لاہور جانا بھی ممکن نہ تھا۔ ان کی پیرانہ سالی اور بعض دوسرے موانع اس میں حائل تھے۔ مجبوراً مجھے ان کی معذوری کی اطلاع کرنا پڑی۔ ہفتہ عشرہ خاموشی میں گزر گیا۔ دو ایک مرتبہ خیریتِ مزاج دریافت کی جب بھی کوئی جواب نہ ملا۔ میں پریشان تھا کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ شاید بیگم صاحبہ کی طبیعت اور زیادہ خراب ہوگئی ہے، شاید حضرت علامہ کو کوئی تکلیف ہے۔ اتفاقاً انھیں دنوں مجھے لاہور جانا پڑا۔ اسٹیشن سے سیدھا حضرتِ علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان کی اپنی صحت تو خوب تھی، حتیٰ کہ اردو اشعار بھی ہو رہے تھے۔ لیکن بڑی پریشانی بیگم صاحبہ کی علالت کی تھی۔ باوجود مالی پریشانیوں کے وہ حکیم صاحب کا سفر خرچ برداشت کرنے کے لیے تیار تھے، بلکہ حسبِ مقدرت ان کے مشورے کا معاوضہ بھی پیش کر رہے تھے۔ لیکن حکیم صاحب تشریف نہ لے جاسکے تو مجبوراً علاج بدلنا پڑا۔ بہر حال میں لاہور پہنچا۔ حضرتِ علامہ کو بیگم صاحبہ کی علالت نے بڑا پریشان کر رکھا تھا۔ ان کی آزردگیِ خاطر کو دیکھ کر بڑا دکھ ہوا۔ بظاہر ان کی صحت اچھی تھی لیکن آواز کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ یوں کبھی کبھی ذرا سی کشائش ہو جاتی

اور وہ شاید آپ سے آپ۔ میں گیا تو بہت سے ارادوں کے ساتھ تھا لیکن حضرتِ علامہ کی پریشانی کو دیکھ کر کوئی فیصلہ کُن گفتگو نہ کر سکا۔ صرف اتنا عرض کیا کہ جامعہ سے بڑا بددِل ہوں، بلکہ قریباً قریباً طے کر چکا ہوں کہ اس سے قطعِ تعلق کر لوں۔ ایک ماہوار رسالے کی اشاعت کا خیال ہے۔ حضرتِ علامہ کو یہ تجویز پسند آئی اور باتوں باتوں میں نام بھی (رسالے کا) طے ہو گیا۔ ہفتہ عشرہ کے بعد دہلی واپس آیا تو حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر حضرتِ علامہ اور بیگم صاحبہ کی علالت کی ساری کیفیت بیان کی۔ حضرتِ علامہ کا ارشاد تھا کہ نئے مجموعۂ کلام (اُردو) اور پہلے مجموعوں کی اشاعت کے بارے میں بھی ناشرینِ دہلی سے گفتگو کر دوں۔ میں نے دو چار روز کے بعد مفصل عریضہ تحریرِ خدمت کیا لیکن حضرتِ علامہ خاموش رہے۔ میں سمجھ گیا بیگم صاحبہ کی علالت نے کوئی اور تشویش انگیز صورت اختیار کر لی ہے۔ چنانچہ ۲ مئی کا والانامہ ہے:۔

لاہور۔ ۲ مئی ۳۵

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ کا خط مل گیا تھا۔ جواب نہ لکھ سکا کیونکہ جاوید کی والدہ کی حالت تشویش انگیز ہو گئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے ہمارا تمام علاج اندھیرے میں تھا۔ قریباً آٹھ دس روز ہوئے اس کی ران پہ ایک خوفناک پھوڑا نکلا۔ کل اس کا اپریشن کرایا گیا۔ اگرچہ نہایت کمزور ہو گئی ہے اور اندیشہ تھا کہ شاید نشتر کو برداشت نہ کر سکے گی تاہم اپریشن ضروری تھا۔ الحمدللہ کہ اپریشن کامیاب ہوا اور بے حد پیپ اور خون اس

پھوڑے سے برآمد ہوئے"[16]۔ دوسرے ہی روز اس کا بخار بھی کم ہو گیا چنانچہ آج صبح نارمل تھا۔ اب کسی قدر تشویش کم ہوئی ہے اور اُمید ہے کہ اس کی زندگی ابھی کچھ باقی ہے۔ فدا وہ اچھی ہو گئی تو میں حکیم صاحب کی خدمت میں مفصل لکھوں گا۔

آپ نے کتاب کے متعلق شرائط دریافت کیے ہیں میں کیا لکھوں آپ کو سب کچھ معلوم ہے۔ اب تک یہی دستور رہا ہے کہ کتاب میں خود چھپواتا ہوں۔ ہر شخص سول ایجنٹ بن سکتا ہے بشرطیکہ کتاب[17] فوراً ادا کر دے۔ کمیشن دیا جاتا ہے۔ تاج کمپنی کو ۳ آنے فی روپیہ دیا گیا تھا یعنی ۱۲/ روپے کی کتاب میں نے ان کو ۹ عہ ۱/ کو دی تھی۔ اگر آپ کے دوست چاہیں تو کتاب اپنے مطبع میں چھاپ سکتے ہیں۔ تمام اخراجات طباعت وغیرہ کا بل میں ادا کروں گا مگر مسودۂ کتاب تفویض کرتے وقت قیمت تمام ادا کرنی ہوگی وہ اگر چاہیں تو کتاب مجلد بھی بیچ سکتے ہیں۔ مجلد کی قیمت میں جو ان کا منافہ[18] ہوگا اس سے مجھے سروکار نہ ہوگا۔ ہاں یہ ضروری ہے غیر مجلد کتاب کی قیمت کا اشتہار دینا ہوگا کہ جو چاہے مجلد خریدے جو چاہے غیر مجلد خریدے۔ زبورِ عجم اور اسرار و رموز کی

۱۶۔ "ہُوا"۔

۱۷۔ "کی قیمت" کے الفاظ جلدی میں رہ گئے۔

۱۸۔ "منافع"۔

طباعت کا انتظام فوراً ہو سکتا ہے مگر میرا ارادہ ہے کہ زبورِ عجم اب کہ مع اُردو ترجمہ شائع ہو۔ صورِ اسرافیل (اردو) کی تکمیل ابھی چند ماہ اور لے گی۔ اگر آپ کے دوست اردو کتاب چھاپنا چاہیں تو صورِ اسرافیل کی تکمیل تک انتظار کریں۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ والسلام۔

محمد اقبال

میرا اندیشہ صحیح نکلا۔ حکیم صاحب بھی بیگم صاحبہ کی علالت سے بڑے فکر مند تھے۔ انھیں ڈر تھا حضرتِ علامہ کی صحت پر ان پریشانیوں کا اثر کچھ اچھا نہیں پڑے گا۔ بہر حال اب انتظار یہ تھا کہ حضرتِ علامہ کا مفصل خط آئے تو بیگم صاحبہ کے لیے دوائیں تجویز کر دی جائیں۔

صورِ اسرافیل وہی مجموعۂ کلام ہے جو ۱۹۳۶ میں ضربِ کلیم کے نام سے شائع ہوا۔ زبورِ عجم کا نیا نسخہ (اُردو ترجمے کے ساتھ) البتہ شائع نہیں ہو سکا۔ یہ ترجمہ حواشی کی شکل میں تھا۔

مطبع جامعہ سے اب جامعہ کا کچھ یونہی سا تعلق رہ گیا تھا اور یہ نئی پیش کش خانصاحب عبداللطیف خاں مہتمم مطبع جامعہ کی طرف سے تھی۔ دو ہفتے گزر گئے۔ میں بڑے بیرے چو تھے روز خیریت مزاج دریافت کرتا۔ ہر روز خط کا انتظار کرتا لیکن روز ڈاک خالی جاتی۔ اب صاف ظاہر تھا کہ اس خاموشی کی وجہ بیگم صاحبہ کی علالت ہے۔

لہٰذا گھبرا کر میں نے پھر ایک عریضہ تحریرِ خدمت کیا تو فرمایا:۔

۱۷ مئی ۱۹۳۵ء

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم

میں نے آپ کو جاوید کی والدہ کے متعلق لکھا تھا۔ اس کی اصل شکایت جو کئی سالوں سے چلی آتی تھی۔ جگر اور تلی کا بڑھ جانا تھا۔ پیٹ اب تک غیر معمولی طور پر بڑھا ہوا ہے اور ڈاکٹروں نے اب تشخیص کیا ہے کہ اس کے ابڈومن[19] میں پانی بھر گیا ہے۔ اس غرض کے لیے ڈاکٹر اپریشن کیا کرتے ہیں۔ مگر ڈاکٹر جمیعت سنگھ جن کے زیرِ علاج وہ اس وقت ہے ان کی رائے ہے کہ اپریشن کی ضرورت نہیں۔ دوا سے اور انجکشن سے پانی خود بخود خارج ہوگا۔ اب اس کی حالت یہ ہے کہ پھوڑا جو اس کی ران پر نکل آیا تھا اس کا اپریشن ہوئے آج پندرہ روز ہو گئے ہیں اور زخم رو بصحت ہے۔ بخار ایک سو اور ایک سو ایک کے درمیان ہمیشہ رہتا ہے۔ ... ... عمر ۳۷ سال کی ہوگی۔ آپ اب حکیم صاحب کی خدمت میں فوراً حاضر ہو کر یہ حالات عرض کریں کہ ان کا مشورہ کیا ہے۔ اس وقت سب سے بڑی تکلیف یہ ہے:۔

(۱) ابڈومن میں پانی ہے۔

(۲) بخار ۱۰۰ اور ۱۰۱ کے درمیان ہمیشہ رہتا ہے۔ اترتا نہیں۔

---

abdomen — 19

زیادہ کیا عرض کروں۔ اس خط کا جواب جلدی دیں۔ والسلام۔

محمد اقبال

میری طرف سے اور والدہ جاوید کی طرف سے اپنی والدہ کی خدمت میں شکریہ ادا کریں۔

حسب الحکم حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور حکیم صاحب نے مناسب دوائیں تجویز کر دیں۔ لیکن اب یہ بات صاف نظر آ رہی تھی کہ علاج کا یہ سلسلہ کچھ بہت زیادہ مفید نہیں ہوگا جب تک حکیم صاحب بیگم صاحبہ کو نہیں دیکھ لیتے ان کی تشخیص و تدبیر کیسے کارگر ہو سکتی تھی۔

اسی تاریخ کا ایک دوسرا عنایت نامہ ہے :-

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

میں صبح آپ کو خط لکھ کر ڈاک میں ڈال چکا تو دوسرے پہر آپ کا خط ملا۔ وہ مضمون جو آپ نے دکن ٹائمز میں دیکھا ہے قریباً تمام انگریزی اخباروں میں شائع ہوا ہے۔ (ایسٹرن ٹائمز، ٹریبیون[20]، سٹیٹسمین[21]، سٹار آف انڈیا کلکتہ۔ علاوہ اس کے اردو اخباروں میں اس کا ترجمہ بھی شائع ہوا ہے۔ ۱۴ مئی کے سٹیٹسمین نے اسے شائع کیا ہے اور

---

۲۰۔ ایسٹرن ٹائمز لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ ٹریبیون Tribune زمانہ قبل تقسیم میں لاہور کا مشہور ہندو اخبار۔

۲۱۔ Statesman دہلی اور کلکتہ۔

ساتھ ہی اس کے اس پر لیڈنگ آرٹیکل بھی نکلا ہے۔ اب یہاں کے چند نوجوان اسے پمفلٹ کی صورت میں شائع کر رہے ہیں۔ پمفلٹ کی صورت میں اس میں تھوڑا سا اضافہ بھی ہو جائے گا۔

جاوید کی والدہ کے متعلق پہلے خط میں لکھ چکا ہوں۔ آپ حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر صورتِ حالات بیان کریں۔ گرمی بہت ہے۔ میں ان کی خدمت میں یہ عرض کرتے شرماتا ہوں کہ وہ تشریف لائیں۔ اس سے پہلے بھی ان کے احسانات مجھ پر بہت زیادہ ہیں مگر والدۂ جاوید کا اطمینان ان کو نبض دکھانے سے ہی ہوگا۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ ڈاکٹروں نے جو کچھ بتایا ہے وہ پہلے خط میں لکھ چکا ہوں۔ والسلام

محمد اقبال

لاہور۔ ۷ امئی ۱۹۳۵ء

مضمون سے مراد ہے وہ بیان جو احراری قادیانی نزاع کے بارے میں حضرتِ علامہ نے اخبارات کو دیا۔ اور جو شاید ایک پمفلٹ کی شکل میں شائع نہیں ہو سکا۔ سب سے بڑی بات جو اس مضمون میں حضرتِ علامہ نے فرمائی یہ تھی کہ برطانوی حکومت میں ہم مسلمانوں کو اتنی آزادی حاصل نہیں جتنی یہود کو رومی سلطنت میں حاصل تھی۔ رومی اس بات کے پابند تھے کہ یہود کی مجلس (سِنڈ synod) اُمورِ مذہبی میں جو فیصلہ کرے وہ دیکھیں گے کہ اس کی تعمیل قطعی طور پر ہو جاتی ہے۔

اس اثنا میں حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہو چکا تھا۔ انھوں نے فرمایا

مجھے لاہور جانے میں کوئی عذر نہیں۔ میں خوش تھا اور اس امر کی اطلاع فوراً حضرتِ علامہ کی خدمت میں کر دی۔ ارشاد ہوا:۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ حکیم صاحب کی خدمت میں بہت بہت شکریہ ادا کیجیے۔ جاوید کی والدہ کی حالت بدستور تشویش انگیز ہے۔ اللہ پر بھروسہ ہے۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ حکیم صاحب کی خدمت میں خط لکھوں گا۔

محمد اقبال

لاہور۔ ۲۱ مئی ۳۵ء

بیگم صاحبہ کی حالت اب اور زیادہ تشویش ناک ہو گئی تھی۔ حکیم صاحب منتظر تھے کہ حضرتِ علامہ انھیں کب بلاتے ہیں مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ۲ مئی کو یہ المناک خبر پہنچی:۔

لاہور۔ ۲۴ مئی ۳۵

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

کل شام چھ بجے والدۂ جاوید اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئیں۔ ان کے آلام و مصائب کا خاتمہ ہوا اور میرے اطمینانِ قلب کا اللہ فضل کرے۔

ہرچہ از دوست می رسد نیکو است

باقی رہا میں سو میری حالت وہی ہے جو بھوپال سے آتے وقت تھی۔ شربتِ صدر کی ایک شیشی جو آپ نے مجھے بھیجی تھی آپ کو معلوم ہو گا وہ

مَیں نے باتفاقیہ پی تو اُس سے فائدہ محسوس ہوا۔ اس سے بلغم پک کر آسانی سے نکل جاتی ہے۔ حکیم صاحب قبلہ سے دریافت کیجیے کہ آیا اس کا استعمال جاری رہے۔ اس کے ساتھ کوئی اَور دوا بھی ان سے لے کر ارسال فرمائیے۔ یا تو وہی پہلی دوائیں یا کوئی اَور کہ صحتِ عامہ کے لیے مُفید ہو اَور آواز پر بھی مؤثر ہو۔ جگر و معدہ کے لیے بھی مُفید ہو اَور ان سب باتوں کے علاوہ اس بات کا بھی خیال رہے کہ مجھے گاہے بگاہے دردِ نقرس بھی ہو جاتا ہے۔ اس کی روک بھی ہوتی رہے۔ انگوٹھے پر لگانے کی دوا بھی ہو تو اَور بھی بہتر ہو۔ بھوپال نہ جاسکوں گا جب تک بچوں کے لیے کوئی معقول انتظام نہ ہو جائے۔

زیادہ کیا عرض کروں۔ حکیم صاحب سے جلد لیجیے۔
ہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ دواؤں کی تعداد زیادہ نہ ہو۔

والسلام۔

محمد اقبال

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ جاوید منزل میں منتقل ہوئے ابھی تین دِن گزرے تھے کہ یہ حادثۂ المیہ پیش آیا اَور ٹھیک اس وقت جب حضرتِ علامہ کو بیگم صاحبہ کی رفاقت اَور معیّت کی شدید ضرورت تھی۔ لیکن عمر بھر کا یہ ساتھ اسی وقت ہمیشہ کے لیے چھوٹ گیا۔ مشیّتِ ایزدی یُونہی تھی۔ مَیں نے تعزیّت کا تار بھیجا۔ جامعہ نے بھی تعزیّت کی۔

بچوں کی پرورش اَور نگہداشت اب ایک دُوسرا مسئلہ تھا جس نے حضرت

علامہ کے لیے مستقل پریشانی کی صُورت اختیار کر لی۔ یہ صُورتِ حالات بڑی یاس انگیز تھی۔

"باقی رہا نہیں" ان الفاظ کو پڑھ کر بڑی تکلیف ہُوئی۔

بھوپال جانا بھی رہ گیا۔ حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ بیگم صاحبہ کی وفات کے المناک حادثے کا ذکر کیا۔ اُنھوں نے دُعائے مغفرت کے لیے ہاتھ اُٹھائے۔ حضرتِ علامہ کی صحت کے لیے دُعا کی اور تعزیت کا تار بھیجا۔ پھر دوائیں تجویز کیں۔ شربتِ صدر بھی بھیج دیا گیا۔

اب بڑی پریشانی یہ تھی کہ حضرتِ علامہ کی صحت پر کوئی ناگوار اثر نہ پڑے۔ مَیں نے مفصّل عریضہ تحریرِ خدمت کیا تو جواب میں ایک ایسی تحریر مِلی جس سے مسرّت بھی ہُوئی اور تعجّب بھی: ۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ کا خط ابھی مِلا ہے۔ الحمد للہ کہ آپ کی والدہ کو اب آرام ہے۔ حکیم صاحب قبلہ کی خدمت میں یہ بھی عرض کریں کہ مجھے کبھی کبھی ٹیریا بھی ہو جاتا ہے۔ چند روز کونین کھاؤں تو رُکا رہتا ہے چھوڑ دُوں تو پھر ہو جاتا ہے۔ گزشتہ ماہ میں دو تین دفعہ ایسا ہُوا ہے شربتِ صدر کے متعلق بھی ان سے دریافت کریں کہ اس کا استعمال جاری رہے یا ترک کر دیا جائے۔

اعلیحضرت نواب صاحب نے میری ٹائٹ پنشن پانچ[۲۲] روپیہ

---

۲۲ - سو، ہونا رہ گیا۔

ماہوار کی مقرر کر دی ہے۔ خدا تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔ اُنھوں نے
میرے ساتھ عین وقت پر سلوک کیا۔ اب اگر صحت اچھی رہی تو بقیہ ایام
قرآنِ شریف پر نوٹ لکھنے میں صرف کروں گا۔ والسلام۔

محمد اقبال

لاہور۔ یکم جون ۳۵

عجلت میں حضرتِ علامہ، پانچ کے بعد سو کا اضافہ کرنا بھول گئے۔ یہ امر کہ
حضرتِ علامہ کو مالی پریشانیوں سے نجات ملی بڑا اطمینان بخش تھا۔ پھر مسرتِ
بالائے مسرت یہ کہ حضرتِ علامہ تعلیماتِ قرآنی کی تشریح اور ترجمانی کا عزم
رکھتے ہیں۔

حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عرض کیا حضرتِ علامہ کو ملیریا بخار
آجاتا ہے۔ دواؤں کے بارے میں کیا حکم ہے۔ فرمایا استعمال جاری رکھا جائے۔
صرف بخار کی حالت میں یا اگر معالجین کی رائے ہو تو ان کا استعمال نہ کریں۔ مگر
یہ صورتِ حالات پھر بڑی غیر مناسب تھی۔ اس طرح علاج معالجہ کیا ہوتا۔ رہ رہ
کے پھر یہی خیال آتا کہ یا حکیم صاحب کا قیام لاہور میں ہوتا یا حضرتِ علامہ دہلی
چلے آتے۔ لیکن دونوں میں کوئی بات ممکن نہیں تھی۔

جون کا مہینہ ذاتی پریشانیوں میں گزر گیا۔ حضرتِ علامہ کو ملیریا کی شکایت
کی دواؤں کی عدمِ ضرورت کے باعث خاموش رہے۔ سب سے بڑی پریشانی
ان کو بچوں کی تھی۔ ان کی تربیت اور نگہداشت کا انتظام کیا ہو۔

میں جامعہ سے مستقلاً الگ ہونا چاہتا تھا۔ حضرتِ علامہ سے مشورہ

لینا ضروری تھا۔ ترسیلِ ادویہ اور اطلاعِ احوال کا سلسلہ البتہ باقاعدگی سے جاری تھا لیکن اس زمانے کا کوئی مکتوب مجھے نہیں ملتا۔ شاید ضائع ہو گیا۔ بہرکیف آخر جون میں مَیں نے حضرتِ علامہ سے اپنے ارادہ کا اظہار کیا تو فرمایا:۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ کا ۳ جولائی کا لکھا ہوا خط مجھے ابھی ملا۔ اس سے پہلے کوئی خط نہیں ملا۔ بہرحال آپ سوموار کو لاہور پہنچ رہے ہیں۔ دوا ختم ہو گئی ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں یہ دوا جو مَیں نے اب استعمال کی ہے حکیم صاحب کی تمام پہلی دواؤں سے بہتر ہے۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ میری صحت بہت اچھی ہے۔ گلے پر کوئی خاص اثر نہیں ہے۔ اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔ آج جمعہ ہے ممکن ہے یہ خط آپ کو کل صبح یعنی ہفتہ کو مل جائے۔ ورنہ اتوار کو تو ضرور ملے گا۔ خدا کرے ایسے وقت ملے کہ حکیم صاحب کے ہاں جانے کا وقت ہو۔ والسلام۔

محمد اقبال

۵ جولائی ۳۵

ظاہر ہے یہ والا نامہ بڑا اطمینان بخش تھا۔ حکیم صاحب قبلہ بھی خوش تھے۔ دوائیں بھجوا دی گئیں۔

لیکن مَیں لاہور نہیں جا سکا۔ ایک کے بعد دوسری پریشانی سدِّراہ ہو جاتی۔ حضرتِ علامہ نے ہفتہ عشرہ انتظار فرمایا۔ ادھر مَیں بھی اپنی پریشانیوں میں کوئی عریضہ تحریر نہ کر سکا۔ ارشاد ہوا:۔

ڈیئر نیازی صاحب۔

کئی دن سے آپ کا انتظار ہے۔

مَیں دو چار روز تک بھوپال جاؤں گا۔ اَور قریباً ڈیڑھ ماہ وہاں ٹھہروں گا۔ شاید اب تک چلا جاتا مگر بارش نہیں ہوئی۔ برسات شروع ہو جائے تو جاؤں۔ بہتر ہے کہ آپ ابھی لاہور میں [۲۳] نہ آئیں اَور مجھے دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر ملیں۔ ہاں اگر آپ کو کوئی ضروری کام ہو تو مضائقہ نہیں ہے۔ مَیں غالباً ۱۵ جولائی تک یہاں سے چلوں گا۔ بشرطیکہ بارش ہو گئی۔

والسلام

محمد اقبال

لاہور۔ ۱۱ جولائی ۳۵ء

حسبِ ارشاد مَیں نے ارادۂ سفر ملتوی کر دیا۔ اب انتظار تھا کہ حضرتِ علامہ کب تشریف لاتے ہیں۔ ۱۴ جولائی کو اطلاع موصول ہوئی :۔

لاہور۔ ۱۳ جولائی ۳۵ء

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلامُ علیکم۔

اس سے پہلے ایک کارڈ لکھ چکا ہُوں۔ اُمید کہ آپ کو مل گیا ہوگا۔ مَیں یہاں سے پندرہ جولائی کی شام (فرانٹیر میل) بروز سوموار روانہ ہو کر ۱۶ کی صبح دہلی پہنچوں گا۔ وہاں تمام دن قیام رہے گا تاکہ جاوید دہلی دیکھ سکے۔ آپ

---

۲۳۔ 'میں' زائد ہے۔

مجھ سے ریلوے اسٹیشن پر ملیں اور بھوپال کی گاڑی میں جو وہاں سے شام کو چلے گی میرے لیے دو سیٹ سیکنڈ کلاس (لوئر برتھ) ریزرو کرا دیں۔ باقی بروقتِ ملاقات۔

والسلام۔

محمد اقبال

۱۶ کی صبح کو حضرتِ علامہ دہلی تشریف لائے۔ مَیں اسٹیشن پر موجود تھا۔ حکیم صاحب قبلہ کی خدمت میں حاضری دی گئی۔ وہ حضرتِ علامہ کو ہشاش بشاش پا کر بڑے خوش ہوئے۔ باتوں باتوں میں بیگم صاحبہ مرحومہ کی تعزیت بھی کی۔ اس اثنا میں دوائیں بن کر آگئیں۔ حضرتِ علامہ نے رخصت چاہی۔

جاوید سلمہٗ نے دہلی دیکھی۔ حضرتِ علامہ نے اسٹیشن ہی پر "آرام کمرہ" میں آرام فرمایا۔ شام کو بھوپال روانہ ہو گئے۔

مَیں نے تیسرے چوتھے روز خیریتِ مزاج دریافت کی تو ہفتہ عشرہ کی خاموشی کے بعد ارشاد ہوا:۔

یکم اگست ۳۵ء

شیش محل بھوپال

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم

میری صحت ترقی کر رہی ہے۔ الحمد للہ۔ اگر آپ لاہور سے واپس آ گئے ہوں تو اطلاع دیں۔ والسلام۔

محمد اقبال

میں آخرِ جولائی میں لاہور آگیا تھا۔ چنانچہ حضرتِ علامہ کا گرامی نامہ مجھے لاہور ہی میں ملا جو میرے مرحوم بھائی منیر احمد نے مجھے بھیج دیا تھا۔ لاہور کی فضا ان دنوں بڑی خراب تھی۔ مسجد شہید گنج کے انہدام اور بعد کے پیدا شدہ واقعات کو دیکھتے ہوئے حکومت نے مارشل لاء نافذ کر رکھا تھا۔ میں نے یہ سب حالات اور مسلمانوں کی آزردگی کا ذکر کیا تو حضرتِ علامہ کو بھی رنج ہوا۔ فرمایا:۔

بھوپال ۶ اگست ۳۵ء

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ الحمدللہ خیریت ہے۔ میں بھی خدا کے فضل سے اچھا ہوں۔ جاوید بھی ماشاءاللہ خوش ہے۔ لاہور کے حالات افسوسناک ہیں۔ خدا تعالیٰ رحم کرے مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ طلوعِ اسلام کے لیے فضا سازگار ہے۔ آپ جب دہلی واپس آئیں تو مجھے اطلاع دے دیں۔ میں ۲۸ اگست تک اپنے علاج کا کورس ختم کروں گا۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ سیادت اللہ شاہ صاحب سے سلام کہہ دیں۔ علی بخش بھی آداب لکھواتا ہے۔

والسلام۔

محمد اقبال۔ بھوپال

حضرتِ علامہ مطمئن تھے۔ ان کی صحت بھی ترقی کر رہی تھی مگر لاہور کے حالات بالخصوص مسجد کی شہادت سے انہیں بڑا دکھ ہو رہا تھا۔ اس سفر میں جاوید سلمہٗ اور علی بخش ان کے ساتھ تھے۔

سلامت اللہ شاہ کو سلام پہنچا دیا گیا۔ گرامی نامہ بھی انھیں کی معرفت سے مجھے پہنچا تھا۔

طلوعِ اسلام کا معاملہ یہ ہے کہ ۱۶ اپریل کو جب میں نے بوجوہ جامعہ سے علیحدگی کا فیصلہ کیا تو وہ پرانا خیال کہ ایک ملّی اسلامی مجلّے کی اشاعت از حد ضروری ہے از سرِ نو تازہ ہو گیا۔ قیامِ علی گڑھ (۲۵-۱۹۲۰) ہی میں ایک ماہنامے کا تصوّر میرے ذہن میں تھا اور قرآنِ پاک کی اس آیت کے ماتحت "وعلی اللہ قصد السبیل ومنہا جائر ولوشآء لھدٰکم اجمعین" میرا جی چاہتا تھا کہ الرشاد اور الھلال کی طرح ایک پرچہ السبیل یا قصد السبیل کے نام سے جاری کیا جائے۔ چنانچہ شروع اپریل میں جب مولانا اسلم مرحوم و مغفور سے گفتگو ہوئی تو اُنھوں نے بھی السبیل یا قصد السبیل کا نام پسند فرمایا لیکن اُردو زبان کے خیال سے السبیل کو ترجیح دی۔ اس کے کچھ دنوں کے بعد حضرتِ علامہ سے مشورہ ہوا اور احباب نے ناموں کی فہرست پیش کی تو بالآخر طے پایا کہ قصد السبیل کی بجائے کوئی اُردو نام زیادہ موزوں رہے گا۔ ایک روز - ۱۱ اپریل ۱۹۳۵ - جاوید منزل میں پھر یہی گفتگو ہو رہی تھی اور راقم الحروف کے علاوہ راجہ حسن اختر، چوہدری محمد حسین مرحوم اور سید سلامت اللہ مرحوم بھی اس میں شریک تھے۔ کئی نام تجویز ہوئے۔ بالآخر حضرتِ علامہ کی نظم 'طلوعِ اسلام' کے پیشِ نظر قرار پایا کہ رسالے کا نام طلوعِ اسلام رکھا جائے، بشرطیکہ حضرتِ علامہ اسے منظور فرمالیں۔ حضرتِ علامہ نے بکمالِ مہربانی اس کی اجازت دے دی۔ میں نے مفصل جواب عرض کیا تو ارشاد ہوا:-

بھوپال ۱۰ اگست ۳۵ء

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ کا خط مل گیا ہے۔ الحمدللہ خیریت ہے۔

صحت خوب ترقی کر گئی ہے۔ آواز میں بھی فرق ہے۔ اُمید ہے اب کے علاج سے فائدہ ہوگا۔ شاید ایک دفعہ اور بھوپال آنا پڑے گا یعنی اس ہفتے کے بعد آپ دہلی پہنچ جائیں تو وہاں پہنچتے ہی مجھے خط لکھ دیں۔ میں غالباً ۲۶ یا ۲۸ اگست کو یہاں سے روانہ ہوں گا۔ طلوعِ اسلام کے متعلق جو کچھ آپ نے مجھے لکھا اس سے بڑی خوشی ہوئی۔ صورِ اسرافیل کا ایک ٹکڑا بھیج دوں گا یا دہلی پہنچ کر خود لکھ دوں گا۔ میرے خیال میں ایک نئی بنیچر جو طلوعِ اسلام کے لیے ضروری ہے یہ ہے کہ سکھوں کے دور سے پہلے کی تاریخِ پنجاب پر مفصل مضمون لکھے جائیں۔ چوہدری محمد حسین صاحب سے اس بارے میں مشورہ کریں۔ انھوں نے حال ہی[24] مسلمانوں کی تاریخ کے اس حصے کا مطالعہ کیا ہے اور وہ لکھتے ہیں کہ میں اسے پڑھ کر دنگ رہ گیا ہوں۔ پنجاب کے مسلمانوں کی بیداری کے لیے اسی حصۂ تاریخ پر لکھنا ضروری ہے۔ باقی خیریت ہے۔ طلوعِ اسلام کے پہلے نمبر میں ہی ایک مضمون تاریخی ضروری ہے۔ والسلام

محمد اقبال

---

۲۴۔ 'میں' سہواً رہ گیا۔

نصیر کے لیے کس کو کہا جائے۔ آپ متعلق معلوم کر کے لکھیں تو میں خود سفارشی لکھوں۔

یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ حضرتِ علامہ کی آواز ترقی پر ہے اور میں نے اس کا ذکر حکیم صاحب قبلہ سے بھی کر دیا۔

صورِ اسرافیل یا آگے چل کر ضربِ کلیم کا وہ ٹکڑا جس کا عنوان ہے مسلمان کی زندگی:

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے

حضرتِ علامہ نے اردو نوازش اشاعت کے لیے بھیج دیا مگر لاہور پہنچ کر۔

نصیر۔ یعنی نصیر احمد میرے چھوٹے بھائی۔ وہ بی۔اے کر چکے تھے اور میں ان کی ملازمت کی تلاش میں تھا۔

۱۷۰۷ تا ۱۸۵۷ کا دور بڑا تحقیق طلب ہے اور افسوس یہ کہ اسلامی ہند کے اس زمانے کا مطالعہ ابھی تک نہیں کیا گیا۔ حالانکہ یہ مطالعہ قیامِ پاکستان کے نقطۂ نظر سے بھی بڑا اہم ہے۔ میں نے چودھری صاحب —— محمد حسین مرحوم —— سے گفتگو کی تو معلوم ہوا کہ زمین کے حقوقِ مالکانہ —— موروثی اور غیر موروثی وغیرہ —— کے امتیازات علیٰ ہذا زمینداری کے متعلق بڑے اہم حقائق ابھی تک لوگوں کی نظر سے پوشیدہ ہیں۔ یہ سب تبدیلیاں سکھوں کے عہد میں ہوئیں اور برطانوی حکومت نے محض اپنے مفاد کی خاطر ان کو برقرار رکھا۔ پنجاب میں مسلمانوں کی تباہی کا ایک بہت بڑا سبب یہ بھی تھا اور پھر برطانوی حکومت نے بھی اس معاملے میں بڑی

ناانصافی کی ۔ افسوس ہے چودھری صاحب یہ مضمون نہ لکھ سکے ۔ کیا اچھا ہو اگر اس دورِ تاریخ کو ایک الگ موضوع قرار دے کر اس میں تفتیش و تحقیق کی ابتدا کر دی جائے ۔ یہ کام علمی درسگاہوں کے کرنے کا ہے ۔

مَیں نے پھر ایک تفصیلی عریضہ لکھا تو حضرتِ علامہ نے جواب میں فرمایا:

بھوپال ۔ ۲۱ اگست ۳۵

ڈیئر نیازی صاحب ۔ السلامُ علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے ۔ اس سے پہلے ہی ایک خط آپ کو دہلی کے پتہ پر لکھ چکا ہوں ۔ شاید یہ خط اسی کا جواب ہے ۔

سفارش تحریر ملفوف ہے ۔ اس کو ٹائپ کرالیں یا ایسے ہی ساتھ ٹانک دیں ۔ عبدالغنی [۲۵] صاحب کو میں نہیں جانتا ۔ مسعود [۲۶] سے دریافت کروں گا اگر وہ جانتے ہوئے تو ان سے لکھوا دوں گا ۔

طلوعِ اسلام کا پہلا نمبر سید راس مسعود کے نام بھی ارسال فرمائیے ۔ مولانا حالی کی سینٹنری [۲۷] اکتوبر کے آخر میں ہوگی ۔ ان پہ ایک مضمون آپ کے پہلے نمبر میں ہو جائے تو بہت اچھا ہے یا دوسرے نمبر میں بشرطیکہ یہ دوسرا نمبر اکتوبر کے وسط سے پہلے نکل جائے تاکہ آپ کا

---

۲۵ ۔ عبدالغنی خاں ۔ کسی زمانے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نائب مہتمم ۔ اس وقت بھوپال میں تھے ۔

۲۶ ۔ سر راس مسعود مرحوم و مغفور ۔

۲۷ ۔ centenary صد سالہ برسی ۔

رسالہ سینٹنری کے موقع پر تقسیم ہو سکے۔ سینٹنری پانی پت میں ہوگی۔ اعلیٰحضرت نواب صاحب بھوپال صدر ہوں گے۔ مَیں بھی پانی پت اس موقع پر پہنچ جاؤں گا بلکہ اعلیٰحضرت کے متعلق بھی اس رسالے میں کچھ ہو جائے تو اور بھی اچھا ہو۔ مولانا حالی پر جو مضمون ہو کسی اچھے مُبصّر کے قلم سے ہونا چاہیے۔ میرے خیال میں بہتر ہو کہ آپ کا پہلا نمبر ہی وسطِ اکتوبر میں نکلے۔ مَیں انشاءاللہ ۲۸ اگست کی شام کو یہاں سے روانہ ہو کر ۲۹ کی صُبح کو دہلی پہنچوں گا۔ روانگی سے پہلے اِطّلاع دُوں گا۔

محمد اقبال

آپ دہلی پہنچ کر مجھے کارڈ لکھ دیں جس سے مجھے معلوم ہو جائے کہ آپ دہلی پہنچ گئے۔

مَیں نے جواباً عرض کیا کہ جُملہ اِرشادات کی تعمیل ہو جائے گی۔ پھر رختِ سفر باندھا اور دہلی روانہ ہو گیا۔ دہلی پہنچتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ اپنی واپسی کی اِطّلاع حضرتِ علاّمہ کی خدمت میں کی۔ ارشاد ہُوا:۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السّلامُ علیکم۔

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ الحمدللہ کہ خیریت ہے۔ مَیں ۲۸ اگست کی شام کو سات بجے یہاں سے روانہ ہو کر ۲۹ کی صُبح آٹھ بجے دہلی پہنچوں گا۔ دن بھر دہلی سے اسٹیشن پر قیام رہے گا۔ سات کی گاڑی میں وہاں سے روانہ ہو کر ۳۰ کی صُبح انشاءاللہ لاہور۔ دہلی سے میرے لیے دو سیٹ سیکنڈ کلاس لوڈ برتھ ریزرو کرا چھوڑیں۔ ہمارے وُہ ہندو دوست جنھوں نے

دہلی سے پانچ بجے شام چلنے کا مشورہ دیا تھا ان سے مدد لیجیے۔

باقی بروقتِ ملاقات۔ والسلام۔

محمد اقبال۔ بھوپال

۲۴ اگست ۳۵ء

ہندو دوست۔ دہلی ریلوے اسٹیشن کے ایک ملازم۔ ان کا نام معلوم نہیں ہو سکا لیکن میں جب کبھی اسٹیشن جاتا وہ حضرتِ علامہ کے لیے سفر میں زیادہ سے زیادہ سہولتیں بہم پہنچاتے۔ معلوم ہوتا ہے انھیں حضرتِ علامہ سے بڑی عقیدت تھی، مگر اس کا انھوں نے کبھی اظہار نہیں کیا۔ ایک مرتبہ سلام ہی کیا تو دور سے۔

۲۹ اگست کی صبح کو حضرتِ علامہ دہلی پہنچے۔ حسبِ معمول پھر اسٹیشن ہی پر قیام رہا۔ اتفاقاً ڈاکٹر سید محمود [۲۶] بھی موجود تھے۔ انھیں جب یہ معلوم ہوا کہ حضرتِ علامہ اسٹیشن ہی کے آرام کمروں میں آرام فرما رہے ہیں تو ملاقات کے لیے تشریف لے آئے۔ بڑی محبت اور تپاک سے ملے۔ مزاج پرسی کی۔ رفتہ رفتہ سیاسی احوال پر گفتگو ہونے لگی۔ ہندو مسلم مفاہمت، گول میز کانفرنس اور اس کا مابعد، مسجد شہید گنج کا انہدام، مارشل لا سب ہی کچھ زیرِ بحث آگئے۔ حضرتِ علامہ نے بڑی ملاطفت سے ڈاکٹر صاحب کو سمجھایا کہ متحدہ ہندی قومیت ایک سراب ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا۔ اس کی کوئی صورت ہے تو یہ کہ مسلمانوں کی جداگانہ قومی حیثیت تسلیم کی جائے۔ انگریز بڑے ہوشیار ہیں۔ وہ اگر ہندو مسلم مفاہمت

---

۲۶۔ صوبۂ بہار کے مشہور کانگریسی مسلمان۔ وزارت کے عہدے پر سرفراز ہوئے۔

پر زور دیتے ہیں تو اس لیے کہ ایک تو مسلمانوں کا دل رکھ لیا جائے' ثانیاً ہندو اکثریت ان کو اپنا ہم خیال پا کر اس بات پر اور مضبوطی کے ساتھ جم جائے تاکہ ملک میں فتنہ و فساد برپا رہے اور انگریز اس سے فائدہ اٹھائیں۔ فرمایا یہ کیا قومیت اور کیا اتحاد ہے کہ ہر روز کہیں نہ کہیں بلوہ ہو جاتا ہے۔ یہ خانہ جنگی نہیں تو اور کیا ہے۔ یعنی اس حد تک خانہ جنگی جس تک حکومت اس کی متحمل ہو سکتی ہے۔

شہید گنج کا ذکر آیا تو حضرتِ علامہ نے فرمایا آپ مسلمانوں سے مایوس کیوں ہیں۔ آپ نہیں جانتے حکومت اور حکومت کے طرفداروں نے انھیں کس طرح دبا رکھا ہے' ورنہ شاید اس ایک مسجد کے بدلے میں کیا کچھ ہو جاتا۔ مسلمانوں میں قربانی کا بڑا مادہ ہے۔ مشکل صرف یہ ہے کہ ان کی صفیں منظم نہیں' نہ کوئی ایسا صاحبِ نظر اور اولوالعزم انسان ہے جو ان کی رہنمائی کرے۔ حضرتِ علامہ یہ فرما رہے تھے اور میرا ذہن شہید گنج سے مسجد کانپور اور کانپور سے کلکتے کی طرف منتقل ہو رہا تھا۔ وہ کلکتہ جس کی تعریف میں محمد علی نے کہا تھا:

اللہ نے بڑھائی ہے کیا شانِ کلکتہ

اور پھر خیال آیا کہ کلکتہ ہو یا کانپور جو قوم ایسے حالات میں جان دے سکتی ہے۔ جب کامیابی کے امکانات صفر تھے اور پھر قربانی بھی ایسی کہ کانپور میں تو معصوم بچوں تک نے جامِ شہادت پیا۔ شبلی کی وہ نظم کسے یاد نہیں جس کا خاتمہ اس مصرعے پر ہوتا ہے

ہم کشتگانِ معرکۂ کانپور ہیں

پھر سکھر اور کراچی اور معلوم نہیں کہاں کہاں کے واقعات ہیں کہ مسلمانوں نے بلا خوفِ نتائج اپنا خون بہایا۔ لہٰذا حضرتِ علامہ کیا غلط کہہ رہے تھے کہ جس قوم کا یہ جذبۂ ایثار ہو حالات اگر ذرا سی مساعدت کریں تو اس کی کامیابی یقینی ہے۔ انھوں نے فرمایا ڈاکٹر شد صاحب آپ مایوس نہ ہوں، مسلمان زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ بالآخر ڈاکٹر صاحب جن کے پاس حضرتِ علامہ کی منطق کا کوئی جواب نہیں تھا کہنے لگے ہمیں تو مسلمانوں سے بڑی ناامیدی ہے۔ آپ کا دم غنیمت ہے کہ امید کی جھلک پیدا ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر سید محمود گئے تو حضرتِ علامہ نے فرمایا یہ مایوسی ہی مسلمانوں کا سب سے بڑا مرض ہے اور مایوسی نتیجہ ہے ضعفِ ایمان کا۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے حال پر رحم کرے۔

حکیم صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ انھوں نے نبض دیکھی اور اطمینان کا اظہار کیا۔ شام کو حضرتِ علامہ لاہور روانہ ہو گئے۔ میں نے خیریتِ مزاج دریافت کی تو ۹ ستمبر کو ایک کارڈ موصول ہوا :-

لاہور ۵ ستمبر ۳۵ء

ڈیئر نیازی صاحب۔ اس سے پہلے خط لکھ چکا ہوں۔ حکیم صاحب قبلہ آئیں تو ان سے مطلوبہ دوا لے کر جلد ارسال کر دیں۔ ان کی خدمت میں یہ بھی عرض کر دیں کہ لاہور پہنچتے ہی مجھے زکام ہو گیا تھا جو تین دن رہا۔ بیمانہ اور شربت پینے سے بلغم پک گئی ہے مگر بڑی دقت سے نکلتی ہے۔ اس بات کا وہ دوا تجویز کرنے میں خیال رکھیں۔ بعض دفعہ بلغم نکالنے کی کوشش میں وہ حالت یا اس کا خفیف سا پرتو پیدا ہو جاتا ہے جس کو حکیم صاحب نے ہلکا سا دمہ بتایا تھا۔ یہ بھی ان سے عرض کریں کہ کسی شخص نے کہا ہے کہ چاندی

کا گشتہ جو لیمن میں تیار کیا جائے چالیس روز تک کھایا جائے تو آواز عود کر آئے گی۔ یہ دونوں باتیں ان کو اچھی طرح ذہن نشین کرا دیں۔

میری کوٹھی کے سامنے جو زمین خالی ہے اس کے مالک کو بلا کر میں نے آج بلا کر دریافت کیا تھا معلوم ہوا کہ زمین بک رہی ہے اور وہ آپ کو خاص رعایت بھی کر دے گا۔ خواجہ وحید کے مکان کے پاس آٹھ مرلہ کا ایک ٹکڑا ہے کچھ عجب نہیں کہ ایک ہزار روپیہ میں مل جائے اس وقت موقع ہے پھر نہ ملے گی۔ والسلام

محمد اقبال

میں اس امر کی اطلاع کر چکا تھا کہ حکیم صاحب چند دنوں کے لیے دہلی سے باہر تشریف لے گئے ہیں۔ زکام شاید سفر کی کلفت اور موسم کی تبدیلی کے باعث ہوا۔ "وہ حالت یا اس کا خفیف سا پرتو" یہ اشارہ تھا دم کشی کی طرف جس کا دورہ بڑا خفیف اور شاذ ہی ہوتا تھا۔ اب کے کسی عقیدتمند نے چاندی کا کشتہ تجویز کیا اور جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں حضرتِ علامہ خود جو دوا بھی تجویز کی جاتی اس کا ذکر اپنے خطوں میں کر دیتے۔

خرید زمین کی تجویز بڑی مناسب تھی لیکن میری استطاعت سے باہر۔ میں نے معذوری کا اظہار کیا تو اس پر حضرتِ علامہ کو بجا طور پر افسوس ہوا بلکہ آگے چل کر مجھے ہلکی سی تنبیہ بھی فرمائی کہ میں اپنے مستقبل کے بارے میں بالکل بے پروا ہوں۔

حکیم صاحب دو ایک روز کے لیے دہلی سے باہر تشریف لے گئے تھے۔ میں ان کی بازآمد کا منتظر تھا اور حضرتِ علامہ ان کے مشورے کے۔ لہٰذا دوسرے تیسرے روز

پھر ارشاد ہوا :-

ڈئیر نیازی صاحب۔ السّلامُ علیکم۔

کل خط لکھ چکا ہوں اُمید ہے حکیم صاحب قبلہ تشریف لے آئے ہوں گے۔ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر دوائی ارسال کریں۔ مجھے لاہور آتے ہی زکام ہو گیا تھا۔ جس کے لیے مجھے متواتر چھ روز سے بہیدانہ اور شربت بنفشہ ملا کر پی رہا ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بلغم جم گئی ہے اور کسی قدر زائل ہو گئی ہے مگر صبح کے وقت کھانسی ہوتی ہے اور بلغم کسی قدر دقت سے نکلتی ہے۔ دن میں بھی کبھی کبھی کھانسی ہوتی ہے، بالخصوص کھانا کھانے کے بعد اور بلغم بھی نکلتی ہے۔ اس بات کی طرف حکیم صاحب کی توجہ مبذول کریں کہ بلغم کا پیدا ہو جانا بند ہو جائے یا جس طرح وہ مناسب تصوّر کریں۔ اس وقت جو کیفیت ہے وہ میں نے عرض کر دی ہے۔ بھوپال میں بھی یہی کیفیت تھی مگر وہاں بلغم پختہ نہ تھی یہ بات صرف بہیدانہ اور شربت بنفشہ پینے کے بعد ہوئی ہے۔ میرا خیال تھا کہ ایک آدھ ہفتہ بہیدانہ پینے سے بلغم تمام خارج ہو جائے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ زکام اب نہیں ہے تین روز پانی ناک سے بہتا رہا۔ اب نہیں بہتا۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ صحت میری اچھی ہے اور آواز بھی پہلے سے بہتر ہے۔ چودھری صاحب سے میں نے آپ کے مضمون کے متعلق کہہ دیا تھا وہ لکھنے کی فکر میں ہیں۔ والسّلام۔

محمد اقبال۔ لاہور

۸ ستمبر

مَیں نے جواباً عرض کیا حکیم صاحب حیدرآباد تشریف لے گئے ہیں۔ ان کا انتظار ہے۔ حضرتِ علامہ کو مجبوراً پھر الیکٹرک علاج سے رجوع کرنا پڑا۔

چودھری صاحب یعنی چودھری محمد حسین مرحوم، مگر انھوں نے مضمون نہیں رکھا وجہ یہی تھی عدیم الفرصتی۔

الیکٹرک علاج شروع کیا گیا تو پھر سینے کا معائنہ ہوا۔ لیکن اب اس سلسلے میں جو اطلاع آئی خاصی پریشان کن تھی :۔

ڈیئر نیازی صاحب۔

اُمید کہ حکیم صاحب آگئے ہوں گے۔

مَیں نے کل سے انگریزی دوا کا استعمال شروع کیا جس سے کھانسی کم ہو گئی ہے مگر بلغم ابھی تک نکلتی ہے۔ گو کسی قدر کم وقت کے ساتھ ہسپتال میں دو دفعہ پھیپھڑوں کا امتحان کرایا تھا معلوم ہوا کہ پھیپھڑے بالکل صاف ہیں۔ کل پھر معائنہ کرایا تو یہاں کے ڈاکٹر کا[۲۹] نتیجہ بھی یہی تھا کہ پھیپھڑے بالکل صاف ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بلغم کا سرچشمہ کوئی غدہ ہے۔ حکیم صاحب سے عرض کیجیے کہ بلغم کی طرف خاص توجہ دیں کہ اس کا پیدا ہونا بند ہو۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ جاوید خوش ہے اور سلام کہتا ہے۔ علی بخش بھی سلام کہتا ہے۔ والسلام۔

محمد اقبال۔ لاہور

۱۰ ستمبر ۳۵ء

---

۲۹۔ "ڈاکٹری معائنے کا"۔

اب سب سے بڑا سوال یہی تھا کہ بلغم کا سرچشمہ کیا ہے۔ حکیم صاحب کی شروع ہی سے رائے تھی کہ جگر میں حدت ہے' اعصاب میں برودت اور قلب متاثر۔ وہ حیدرآباد سے واپس تشریف لے آئے تو میں نے جُملہ مکتوبات حرف بحرف پڑھ کر سُنائے' لیکن ابھی دوائیں ارسال نہیں کرنے پایا تھا کہ ۱۲ ستمبر کو ایک اور گرامی نامہ صادر ہُوا:—

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلامُ علیکم۔

آپ کا خط مِل گیا ہے۔ کھانسی بہت کم ہو گئی ہے بلکہ جاتی رہی ہے۔ انگریزی دوا سے بہت فائدہ ہُوا۔ زرد رنگ کی جمی ہوئی[۳۰] جو پہلے آتی تھی اب نہیں آتی۔ البتہ وہ معمولی بلغم جو زکام سے پہلے آتی تھی ابھی آتی ہے۔ مختصراً یہ کہ جیسا میں بھوپال سے آتے وقت تھا اب وہی حالت عود کر آئی ہے۔ حکیم صاحب سے اب یہ عرض کرنا ہے کہ جو دوا وہ تجویز کریں اس میں تین باتوں کا لحاظ رکھیں:—

(۱) قوّتِ جسمانی۔

(۲) آواز۔

(۳) بلغم کا سدِباب کہ اس کا پیدا ہونا بند ہو۔

کل دوبارہ معائنہ کرایا تھا۔ خون کا دباؤ نارمل ہے اور پھیپھڑوں کی حالت بالکل دُرست ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بلغم اس نالی میں پیدا ہوتی ہے

---

۳۰۔ بلغم' سہو رہ گیا۔

جس کا مقام بقول ڈاکٹروں کے پھیل گیا ہے۔ واللہ اعلم۔

مولانا حالی کی سالگرہ کی تاریخ ۲۶، ۲۷ اکتوبر مقرر ہوئی ہے۔ میں غالباً ۲۵ تا ۲۶ اکتوبر کو وہاں پہنچ جاؤں گا۔ آپ کے رسالے کے[۳۱] یہ بہتر ہوگا کہ اگر ممکن ہو تو آپ خود وہاں پہنچ جائیں اور اگر فوٹوگراف[۳۲] کا بھی انتظام کر سکیں تو اور بھی بہتر ہو۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ وہاں میں آپ کو سید راس مسعود سے بھی انٹروڈیوس کراؤں گا۔ غالباً چودھری محمد حسین اور جاوید بھی ساتھ ہوں گے۔ والسلام۔

محمد اقبال

۱۲ ستمبر ۳۵ء

بلغم کا سرچشمہ کم از کم ڈاکٹروں کے نزدیک معلوم ہو گیا تھا اور ظاہر ہے یہ امر بڑا خطرناک تھا۔ حکیم صاحب کی شروع ہی سے رائے تھی کہ حضرت علامہ کو ہلکا سا دمۂ قلبی ہے۔ اس کی گویا تصدیق ہو گئی۔ لیکن سوال یہ تھا کہ حضرت علامہ کا مرض کیسے دور ہو۔ ایلوپیتھک علاج 'عارضی' تھا یعنی اصطلاحاً SYMPTOMATIC کہ علامات کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ یا پھر ڈاکٹر یہ مشورہ دے رہے تھے کہ حضرت علامہ ویانا تشریف لے جائیں۔ شاید وہاں علاج ہو سکے' یا پھر عملِ جراحی سے وہ حصہ ہی خارج کر دیا جائے جس میں نقص واقع ہو گیا ہے۔ حکیم صاحب

---

۳۱۔ لیے سہواً رہ گیا۔

۳۲۔ مطلب ہے فوٹوگرافر۔

کے طریقِ علاج کے بارے میں مَیں کچھ نہیں کہہ سکتا بجز اس کے کہ اُن کا سارا زور اس پر تھا کہ حضرتِ علّامہ کا بدن مضبوط ہو اور اُن کی صحت اَور طاقت روز بروز ترقّی کرتی جائے۔ شاید یہ بھی مرض کے ازالے کی ایک صُورت تھی۔

رسالے کے متعلق حضرتِ علّامہ کے ارشادات نہایت ٹھیک تھے، لیکن مَیں اپنی جگہ پر معذور تھا۔ میرے پاس وسائل نہیں تھے۔ بہرحال مَیں حکیم صاحب سے ملا اور اُن کی تجویز کردہ دوائیں بھیج دیں لیکن ہفتہ عشرہ خاموشی رہی۔ بالآخر ۲۷ ستمبر کا لکھا ہُوا ایک طویل والانامہ موصُول ہُوا:۔

لاہور۔ ۲۷ ستمبر ۳۵ء

ڈیئر نیازی صاحب۔ السّلامُ علیکم۔

آپ کا خط مل گیا ہے۔ حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کیجیے کہ اس دوا سے اس وقت تک کوئی خاص فائدہ نہیں ہُوا۔ حالت وُہی ہے جو پہلے تھی۔ میرے خیال میں جو دوا اس سے پہلے مَیں نے کھائی تھی وُہ نسبتاً اس سے زیادہ مفید تھی جیسا کہ مَیں نے پہلے عرض کیا تھا۔ دوا میں تین چیزوں کا لحاظ ضروری ہے:۔

(۱) بلغم کا استیصال کرے۔

(۲) قوّتِ جسمانی میں ترقّی ہو۔

(۳) آواز

اگر صرف قوّتِ جسمانی کے لیے کوئی جوہر حکیم صاحب تیار کریں تو شاید باقی دونوں کے لیے بھی مفید ہوگا مگر جو دوا پھر وُہ تجویز کریں اس کا

ایک نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ ہر صبح فراغت مکمل ہو جایا کرے۔

چھوٹی بچی منیرہ[۲۳] کے لیے اُستانی کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی شریف زادی جو قرآن اور دینی کتابیں پڑھا سکتی ہو، مل جائے تو غنیمت ہے۔ بیوہ اور بے اولاد ہو تو سبحان اللہ۔ تمام عمر میرے گھر میں گزار دے۔ گھر کا انتظام کرے اور بچوں کی تربیت کرے۔ عمر چالیس سال ہو یا اس سے کم و بیش۔ اس کے علاوہ ایک باورچی کی ضرورت ہے جو ہندی کھانا پکانا جانتا ہو اور دیانت دار ہو۔ آپ بھی خیال رکھیں۔ میں نے بعض اور دوستوں سے بھی کہہ رکھا ہے۔ دہلی میں ممکن ہے کوئی مل جائے۔

باقی جب آپ مستقل طور پر لاہور آ جائیں گے تو پبلشنگ فرم کے متعلق مشورہ کیا جائے گا۔ والسلام۔

محمد اقبال

یہ والا نامہ بھی خاصا تشویش انگیز تھا۔ حکیم صاحب بھی بڑے متردد تھے۔ اُنھوں نے مناسب تدابیر کر دیں۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اگر قلب کے آس پاس کوئی عنصری نقص رونما ہو گیا ہے تو اس کا ازالہ محض کسی طاقت بخش جوہر سے کیسے ہو سکتا ہے۔

باورچی اور اُستانی کی تلاش جاری تھی۔ میں نے عرض کیا احبابِ دہلی سے مشورہ کیا ہے۔ شاید خاطر خواہ انتظام ہو جائے۔ طبع و نشر کا خیال پھر عود

۲۳۔ منیرہ بانو (اب بیگم میاں صلاح الدین) صاحبزادی حضرتِ علامہ مرحوم۔

کر آیا تھا، پھر کچھ امید بندھ گئی ہے۔

ڈیئر نیازی صاحب۔

آپ کا خط ابھی ملا ہے جس کے اندر دوائی بھی ہے۔ صبح نو بجے حلوے کے ساتھ دوا کھانا غیر ممکن ہے کیونکہ [35] اگر حلوہ کھاؤں تو دن بھر بھوک نہیں لگتی اور میرے لیے یہ سخت قابض ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کھانا ہمیشہ ۱۱ بجے کھاتا ہوں اگر آپ کی ہدایت کے مطابق اوقات خوراک میں تبدیلی کی جائے تو تمام نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ وسط ناشتہ ہی میں دوا کا استعمال کیا جائے۔ دیگر عرض یہ ہے کہ ان تمام ادویات میں سے صرف ایک دوا (وسط ناشتہ والی) کھائی جائے تو کیا برا ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ دو دوائیں۔ ایک وسط [36] میں اور دوسری رات کو سوتے وقت۔ اگر حکیم صاحب صرف ایک دوا کی اجازت دیں تو نہایت مناسب ہے کیونکہ اس طرح انگریزی دوا کے استعمال میں کوئی دقت نہ ہوگی۔ باقی حالات بدستور ہیں۔ عام صحت اچھی ہے۔ آواز کا وہی حال ہے جو بھوپال سے واپس آتے ہوئے تھا۔ باورچی کی تلاش کیجیے۔ اُستانی کے لیے میں نے تہذیب نسواں میں اشتہار دیا ہے۔ بیگم محمد علی صاحبہ کی سرپرستی میں جو عورتوں کا رسالہ نکلتا ہے اس میں بھی اگر ہو جائے

۳۵۔ کیونکہ۔

۳۶۔ ناشتہ۔

تو خوب ہو۔ بلغم اب صبح کو نکلتی ہے۔

والسلام۔ جواب جلد۔

محمد اقبال

۹ اکتوبر ۳۵ء

حضرتِ علامہ کا یہ گرامی نامہ خاصے انتظار کے بعد صادر ہوا تھا۔ وہ کچھ تو گھر کے حالات سے پریشان تھے کچھ آواز کی خستگی سے۔ دواؤں کا استعمال بھی کچھ بددلی کا باعث ہو رہا تھا اور اب تو یہ بات بھی صاف ہو گئی تھی کہ ان کا مرض دراصل آواز سے متعلق ہے اور اس کا سرچشمہ قلب ـــــ یعنی حبس صوت نتیجہ ہے حنجرہ کی فالج زدگی کا ـــــ مگر پھر یہ انگریزی اور طبی دواؤں کا خلط ملط ہونا گو ایک امرِ مجبوری تھا مگر غلط۔ بہرحال میں نے حکیم صاحب سے مشورہ کیا اور ان کی ہدایات حضرتِ علامہ کی خدمت میں عرض کر دیں۔

اشتہار دے دیا گیا۔

میں چاہتا تھا اجتماعِ پانی پت سے پہلے طلوعِ اسلام کی اشاعت عمل میں آجائے اور ہو سکے تو اس سے قبل لاہور بھی جاؤں اور پھر حضرتِ علامہ کی معیت میں پانی پت آؤں۔ لیکن یہ ارادہ بوجوہ پورا نہ ہو سکا۔ حضرتِ علامہ منتظر تھے۔ ارشاد ہوا:۔

ڈیئر نیازی صاحب۔

میرا خط آپ کو ملا ہے یا نہیں۔ آپ لکھتے تھے کہ آپ خود لاہور آنے کو ہیں۔ مگر نہ آپ آئے نہ میرے خط کا جواب آیا نہ آپ

کا رسالہ نکلا۔ بہر حال حکیم صاحب قبلہ سے پوچھ کر جواب لکھیے۔ میں نے ابھی
تک دوا کا استعمال شروع نہیں کیا کہ آپ کے خط کا انتظار تھا۔ قاسنا (آسٹریا)
جانے کا خیال ہے۔ ڈاکٹر انصاری صاحب سے خط و کتابت کر رہا ہوں۔
انھوں نے نہایت مہربانی سے مدد کا وعدہ کیا ہے۔ اگر گیا تو فروری یا اپریل
۱۹۳۶ء میں جاؤں گا۔ والسلام

محمد اقبال۔ لاہور
۱۵ اکتوبر ۳۵

میرے لیے بجز اظہار معذرت اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے عرض کیا میں
بڑا شرمندہ ہوں کہ بسبب کمی وسائل آپ کا کوئی ارشاد پورا نہ ہو سکا۔ دوائیں ارسال
خدمت کر دی گئیں۔ حکیم صاحب نے فرمایا ڈاکٹر صاحب دوا کا استعمال شروع
کر دیں۔

ویانا کا ارادہ افسوس ہے پورا نہ ہو سکا۔

اس اثنا میں مسودۂ اسرافیل (بعد میں ضربِ کلیم) کا وہ ٹکڑا جس کا ذکر میں اس
سے پہلے کر چکا ہوں موصول ہو گیا تھا۔ مگر پھر اس کے علاوہ حضرت علامہ نے بکمال
مہربانی دو اور تحریریں —— دونوں میرے پاس محفوظ تھیں[۳۷] —— بشکل تصریحات
ارسال فرمائیں۔ ایک میں عقل اور علم، دوسری میں الہام اور وحی اور ختم نبوت
کی بحث تھی اور مقصد یہ کہ طلوعِ اسلام میں اپنے مضمون کے لیے میں ان سے

---

۳۷۔ اب اقبال اکیڈیمی، کراچی کے پاس۔

استفادہ کنند۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔

لیکن یہاں پھر ایک امر تصریح طلب ہے۔ اِس مضمون کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ۳۵ء میں انجمنِ احمدیہ اشاعتِ اسلام لاہور کے انگریزی ہفت روزہ لائٹ [۳۸] نے بلاوجہ حضرتِ علامہ کے انگریزی خطبات بالخصوص پانچویں خطبے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی کہ یہ جو حضرتِ علامہ کہتے ہیں کہ بابِ نبوت مسدود ہے یہ دراصل مغرب سے مرعوبیت کا نتیجہ ہے۔ حضرتِ علامہ نے کہیں اس سلسلے میں "عقلِ استقرائی" کا ذکر بھی کر دیا تھا۔ مدیرِ لائٹ اُس کا صحیح مفہوم تو سمجھ نہ سکے۔ انھوں نے فرمایا یہ دیکھیے اقبال عقل کو نبوت پر ترجیح دیتا ہے۔ یہ مغرب زدگی نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ مضمون شائع ہوا تو راجہ حسن اختر صاحب نے انگریزی زبان ہی میں مدیرِ لائٹ کے نام ایک خط لکھا جس میں ان کے غلط خیال کی تردید بڑے معقول طریقے سے کی گئی تھی۔ اتفاق سے لاہور میں راجہ صاحب سے لائٹ کے اس مضمون کا ذکر آ گیا۔ میں نے عرض کیا۔ یہ پرچہ چونکہ ایک انجمن کا ہے جس کی ایک مخصوص دعوت ہے لہٰذا مجھے اس کا ترجمہ اردو میں شائع کر دینا چاہیے۔ حضرتِ علامہ نے بھی اِس خیال سے اتفاق فرمایا۔ پھر جب ضمناً بعض دوسرے مسائل کی وضاحت ضروری نظر آئی اور میں نے حضرتِ علامہ سے اس بارے میں مشورہ کیا تو انھوں نے ازرہِ عنایت مجھے دو تحریریں

---

۳۸۔ Light

۳۹۔ جس کا اردو ترجمہ طلوعِ اسلام میں شائع ہوا۔

مرحمت فرمائیں جن کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ہے۔

اکتوبر کے آخری ہفتے میں پانی پت پہنچا لیکن یہ دیکھ کر کہ حضرتِ علامہ کے چہرے پر زردی چھا رہی ہے اور آواز کا ضعف بھی بہت کچھ بڑھ گیا ہے بڑا دکھ ہُوا۔ معلوم ہوتا تھا لاہور سے پانی پت کا سفر بھی ان کی برداشت سے باہر ہے، حالانکہ ابھی چند ہفتے پیشتر جب آخر اگست میں وہ بھوپال سے واپس آئے ہیں تو ضعف و اضمحلال کی یہ کیفیت نہیں تھی۔

پانی پت میں حضرتِ علامہ کا قیام دو روز رہا۔ اُنھوں نے تقریب میں شرکت فرمائی۔ حضرت شاہ بُو علی قلندرؒ کے مزار پر عقیدت مندانہ حاضری دی۔ احباب اور نیاز مندوں سے باکرام و التفات پیش آئے اور پھر چودھری محمد حسین صاحب مرحوم، راجہ حسن اختر، جاوید سلّمہٗ اور علی بخش کی معیت میں لاہور واپس تشریف لے گئے۔ مگر پھر یہ امر بڑا تکلیف دہ تھا کہ اس تقریب میں حضرتِ علامہ اگرچہ مسند پر تشریف فرما رہے۔ لیکن نہ اپنا مشہور قطعہ

مزاجِ ناقہ را مانندِ عرفی نیک می دانم
چو محمل را گراں بینم حُدی را تیز تر خوانم

خُود پڑھ سکے، نہ ان تعریفی کلمات کے جواب میں بطورِ تشکر ہی کچھ فرمایا جو اعلیحضرت نواب صاحب بھوپال اور دُوسرے حضرات نے ان کی شان میں کہے۔

پاس اُنتا میں مکتوبِ اِسلام شائع ہو چکا تھا۔ حضرتِ علامہ نے اسے پسند فرمایا۔

مَیں کچھ مصروف تھا۔ کچھ ذاتی حالات سے پریشان۔ نومبر کے دس پندرہ دن یُونہی گزر گئے۔ دو ہفتے کی دوائیں ارسال کر چکا تھا۔ البتہ پانی پت سے واپسی پر اُستانی کے سلسلے میں ایک صاحب سے گفتگو جاری تھی لیکن کوئی بات طے ہونے میں نہیں آتی تھی۔ مَیں نے معذرت کی تو اِرشاد ہوا:۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السّلامُ علیکم۔

آپ کا پوسٹ کارڈ ابھی ملا ہے۔ تحقیق میں دیر ہو گئی ہے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ ..... صاحبہ کے شوہر کا خط آیا تھا جس سے مجھے معلوم ہو گیا وہ خارج از بحث ہے[۱]۔ فی الحال آپ کے دوست کے مشورے پر ہی عمل بہتر ہے۔ یہ معاملہ نازک ہے۔ مَیں آپ کی خوشی میں شریک ہُوں مگر یقین جانیے کہ مجھے پانی پت کے سفر میں تکلیف ہوئی۔ اب جو کچھ قوتِ سفر باقی ہے اسے بھوپال کے سفر کے لیے محفوظ رکھتا ہُوں۔ سیالکوٹ کی محفلِ عروسی میں میری رُوح انشاءاللہ شریک ہو گی۔ اگر یہ حالات نہ ہوتے تو میرا بدن بھی شریک ہوتا۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ والسّلام۔

محمد اقبال۔ لاہور

۱۸ نومبر ۳۵ء

پانی پت میں حضرتِ علّامہ کی صحت کو دیکھ کر جو اندیشہ پیدا ہو گیا تھا وہ صحیح نکلا۔ مَیں نے پریشان ہو کر حکیم صاحب قبلہ سے اس کا ذکر کیا تو اُنھیں بھی

---

[۱] یعنی۔ بطور نگرانِ خانہ

تشویش ہوئی۔ لہٰذا اس مرتبہ جو دعائیں تجویز کیں ان میں اس امر کا خاص طور سے خیال رکھا اور پھر حضرتِ علامہ کی طبیعت بھی جلد ہی سنبھل گئی۔

مَیں ان دِنوں بہت آزردہ خاطر تھا۔ حضرتِ علامہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا :۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ کا خط مل گیا ہے۔ آزردگی اور پریشان خاطری مُسلمان کا شیوہ نہیں۔ اسلام کی حقیقت 'فقرِ غیور'[۴۱] ہے اور بس! صدق و اخلاص[۴۲] ہاتھ سے نہ دیجیے۔ مالی مشکلات کا فکر نہ کیجیے کہ یہ کبھی آتی ہیں کبھی خود بہ خود دُور ہو جاتی ہیں۔ بسا اوقات انسان کو بظاہر اس کے حق سے

۴۱۔ 'فقرِ غیور' کی تشریح حضرتِ علامہ نے ضربِ کلیم میں اس طرح فرمائی ہے :۔

روحِ اسلام کی ہے نورِ خودی نارِ خودی ‏ زندگانی کے لیے نارِ خودی نور و حضور
یہی ہر چیز کی تقویم، یہی اصلِ نمود ‏ گرچہ اس رُوح کو فطرت نے رکھا ہے مستور
لفظِ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر ‏ دُوسرا نام اسی دین کا ہے 'فقرِ غیور'

۴۲۔ صدق جزوِ تقویٰ ہے۔ والّذی جاء بالصدق و صدّق به اولٰئك هم المتقون۔

اخلاص کے معنی ظاہر ہیں وَلنا اَعمالنا و لكم اَعمالكم و نحن له مخلصون۔

زیادہ دیتے ہیں یہ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ انسان کی سعی کو اس
میں بہت کم دخل ہے۔[۴۳]

خانصاحب عبد اللطیف کے شرائط افسوس ہے مجھے منظور نہیں[۴۴]
زیادہ کیا عرض کروں۔ خدا تعالیٰ آپ کے کام میں برکت دے۔

والسلام۔

محمد اقبال۔ لاہور

۲۱ دسمبر ۱۹۳۵ء

اب میرا قلب پوری طرح مطمئن تھا۔

---

۴۳۔ اور جس کی تائید موجودہ سیاسی معاشی حقائق سے بطریقِ احسن ہو رہی ہے۔ ذرا
غور کیجیے گا' انسان کی ذہن سالی یا یہ دعوئ علم و حکمت اور یہ تدبیر و تنظیم کہاں پہنچ گئی ہے
یہ ہیں ہمارے چارہ فرماؤں کی چارہ فرمائیاں۔ الذین ضل سعیہم فی الحیٰوۃ الدنیا
وھم یحسبون انھم یحسنون صنعاً۔

۴۴۔ مہتمم مطبع جامعہ دہلی۔

# ۱۹۳۶

اسلام اور احمدیت
ڈاکٹر افتخار
سفرِ بھوپال

نومبر کے آخری عشرے میں دہلی سے لاہور پہنچا۔ کچھ دن لاہور میں گزرے۔ بعد میں چند دنوں کے لیے سیالکوٹ جانا پڑا۔ آخر دسمبر میں دہلی واپس آگیا۔ حضرتِ علامہ کی خدمت میں بالالتزام حاضری دی۔ بظاہر ان کی صحت اچھی تھی۔ اُٹھنے بیٹھنے میں کوئی تکلیف نہ ہوتی، نہ گفتگو میں۔ شکایت تھی تو صرف جسِ صوت کی۔ مزاج میں بھی شگفتگی آچلی تھی حتیٰ کہ وہ تھوڑی بہت نقاہت اور اضمحلال جس کا اظہار سفر پانی پت میں ہوا تھا اور جس کی طرف اپنے ایک عنایت نامہ میں انھوں نے اشارا بھی کیا تھا دور ہو چکا تھا۔

ہندوستان (غیر منقسم) کی سیاسی اور مذہبی فضا اُن دنوں بڑی مکدر ہو رہی تھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات روز بروز بڑھ رہے تھے۔ مسلمانوں کا سوادِ اعظم اگرچہ کانگریس سے کٹ چکا تھا لیکن وطنیت پسندوں کی ایک چھوٹی سی جماعت

برابر اس کی تائید کا دم بھر رہی تھی اور ہندو خوش تھے، بلکہ انھیں اعتماد تھا کہ آزادیِ وطن کی اس تحریک میں جس سے ان کا ایک خاص مقصد ہے اس کی کامیابی یقینی ہے۔ برعکس اس کے مسلمانوں کے خیالات میں ایک عجیب انتشار رو نما تھا۔ اسلام کو سیاست سے گہرا تعلق ہے اور اگر بالفرض اس سے انکار بھی کر دیا جاتا جب بھی ہندو ہوں یا انگریز اس حقیقت سے بہرحال انکار نہیں کر سکتے تھے کہ پچھلے سات آٹھ سو برس کی تاریخ نے اس نیم برِاعظم میں دو الگ الگ گروہ ـــــ یا عام معنوں میں قومیں ـــــ پیدا کر رکھے ہیں جن کا ماضی ایک ہے، نہ روایات ایک، نہ طرزِ زندگی ایک، نہ ذہن اور مزاج میں کوئی اشتراک۔ لیکن ہندو کچھ تو اپنی اکثریت اور کچھ اس برتری کے زعم میں جو سیاست ہو یا معاش برطانوی حکومت نے اسلامی اقتدار کے خاتمے پر بوجوہ ان کو دے رکھی تھی اس حقیقت سے عمداً آنکھیں بند کر رہے تھے کہ اس ملک کی سات آٹھ سو برس کی تاریخ یا مسلمانوں کے اصولِ زندگی کے سیاسی یا اجتماعی اعتبار سے بھی کچھ معنی ہو سکتے ہیں۔ ادھر برطانوی حکومت بھی اتنا تو ضرور چاہتی تھی کہ اپنے مخصوص مفاد کے پیشِ نظر اسلامی اقلیت کو سر تا سر ہندو اکثریت میں ضم نہ ہونے دے۔ برطانوی شاطرانِ سیاست ان کے لیے کبھی جداگانہ نیابت اور کبھی تحفظات کی سفارش کرتے لیکن جہاں تک قومیت اور وطنیت کی بحث کا تعلق جدید عمرانی نقطۂ نظر سے تھا وہ بھی مجبور تھے کہ کچھ تو اپنی ذہنی اور دماغی ساخت اور کچھ عالمِ اسلام سے تعصب کے باعث متحدہ یعنی ہندوستانی قومیت ہی کی حمایت کرتے۔ لہٰذا ان حالات میں کبھی تو یہ آواز اٹھتی "اسلام، ریاست اور کلیسا" (محترمہ خالدہ خانم نے اس کے لیے 'مسجد' کی اصطلاح وضع کی تھی۔ مطلب ہے 'دین و دولت') کی تفریق کا قائل نہیں۔ اسلام میں

مذہب اور سیاست ایک ہیں۔ کبھی یہ کہ مسلمانوں کو چاہیے مذہب کو سیاست سے الگ کر دیں۔ اس سلسلے میں ترکوں کی مثال پیش کی جاتی۔ کبھی یہ کہ اسلام میں سیاست اور مذہب توام ہیں۔ لیکن اس سے ہمارے وجودِ قومی کی نفی تو نہیں ہوتی۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ افغانی، ایرانی، یا ترکی اور عربی قومیت سے انکار کر دیا جائے۔ یہ قومیں بہر کیف متحد ہیں اور مذہباً مسلمان۔ مگر اس کے باوصف ان کا اپنا ایک الگ تھلگ قومی وجود ہے۔ ہندی مسلمانوں کا بھی ایک قومی وجود ہونا چاہیے۔ وہ بھی ایک قوم ہیں جیسے افغان، ترک، یا عرب۔ پھر جس طرح ترکی اور عربی، یا ایرانی اور افغانی قومیت سے اسلام کا وجود کالعدم نہیں ہوتا، ہندی اور بالخصوص متحدہ ہندی قومیت سے اسلام کی ہستی کیوں خطرے میں ہے؟ درآں حالیکہ بصورتِ آزادی ہم مسلمانوں کو ہر طرح سے مذہبی آزادی حاصل ہو گی۔ مگر لوگ نہیں سمجھتے تھے تو یہ معمولی سی حقیقت کہ مذہبی آزادی تو برطانوی اقتدار کے باوجود بھی حاصل ہے، لہٰذا ان کے اس قول کے کچھ معنی ہو سکتے تھے تو یہی کہ ان کی قومی جدوجہد سیاسی جدوجہد ہے، اسلامی نہیں۔ بالفاظِ دیگر اسلام کی ہستی حکومت اور محکومی سے بے تعلق ہے۔ چنانچہ تحریکِ ترکِ موالات کے آغاز میں بھی بعض مذہبی جماعتوں نے اسی بات کی آڑ لے کر اس کی مخالفت کی تھی۔ ایسے ہی اس زمانے میں یہ بھی کہا گیا کہ ہماری زندگی کے بہت سے دائرے ہیں۔ مثلاً ایک دائرہ وطن کا ہے، ایک مذہب کا۔ ہم کبھی اس دائرہ میں قدم رکھتے ہیں، کبھی اُس میں۔ ان میں باہم کوئی تصادم نہیں۔ بحیثیت مسلمان ہماری زندگی کا ایک دائرہ ہے جس میں قدم رکھنے سے ہماری ہندوستانی قومیت ہمارا راستہ نہیں روک سکتی، بعینہٖ جس طرح قومیت کے دائرے میں قدم رکھا جائے تو اسلام ہمارے راستے میں حائل نہیں ہو گا۔ یہاں ان

وائیوں کی بحث تو جس نے بڑی حد تک ایک دائرۃ السّو کی شکل اختیار کر لی تھی بڑی بے محل ہے۔ البتہ اس سلسلے میں ایک بہت بڑے مسلمان ماہرِ تعلیم نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ہم چاہتے ہیں وطنیت اور مذہبیت میں مفاہمت پیدا کریں We will reconcile them with nationalism حالانکہ یہ وہ کام ہے جو لُوتھر[1] سے بھی نہیں ہو سکا۔ بہر حال کچھ اس طرح کی آوازیں تھیں جو اس مُلک کے مختلف گوشوں سے اُٹھ رہی تھیں۔ مگر ان کے مقابلے میں ایک گروہ کا یہ بھی خیال تھا کہ بحالتِ موجودہ اسلام اور وطنیت یا مذہب اور سیاست کی بحث چھیڑنا ہی غلطی ہے۔ یہ بحث یا تو بعض مفاد پرست اشخاص چھیڑ رہے ہیں یا علمی اور فلسفیانہ طبیعت کے لوگ جو اپنے خیالات کی دُھن میں حقائق سے چشم پوشی کرتے ——— نادانستہ ہی سہی ——— یہ نہیں سمجھتے کہ یہ موقعہ اس قسم کی بحثوں کے چھیڑنے کا نہیں اس لیے کہ بحالت موجودہ مسئلہ ہے تو صرف یہ کہ جس طرح بھی بن پڑے برطانوی اقتدار سے نجات حاصل کی جائے تاکہ اس مُلک، علیٰ ھٰذا بیرونی ممالک کے مُسلمان عزت کی زندگی بسر کر سکیں کیونکہ یہ صرف برطانوی شہنشاہیت ہے جس نے سارے عالمِ اسلام کو اپنے چنگل میں لے رکھا ہے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ تحریکِ خلافت کے ماتحت ترکِ موالات کا اقدام کیا گیا تو اِسی حقیقت کے پیشِ نظر۔ ہمیں چاہیے اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہ کریں۔ مگر پھر یہ جو کچھ کہا جاتا سرسری طور پہ کہا جاتا، یعنی

---

۱۔ لُوتھر کی تحریک سے ایک تو یورپ کا اتحاد ختم ہو گیا۔ ثانیاً مسیحی اخلاق کی جگہ قومی اخلاق نے لی۔ گویا مذہب اور قومیت (یا سیاست) میں کوئی مفاہمت پیدا نہ ہو سکی۔

یہ ان معدودے چند افراد کے اقوال تھے جو گویا مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کی رہنمائی کر رہے تھے۔ یہ نہیں کہ وہ ان مسائل پر سنجیدگی سے غور کرتے ہوئے کوئی خالص سیاسی فکر پیدا کرتے۔ رہا تعلیم یافتہ طبقہ، یا وہ پڑھے لکھے افراد جو سیاست سے بے تعلق علیحدگی کی زندگی گزار رہے تھے ان کا ذہن مغربی تعلیم سے اس حد تک متاثر تھا کہ وہ بجز ان خیالات کے اور کچھ سوچ ہی نہیں سکتے تھے جو یورپ میں مذہب اور زندگی کے بارے میں ایک خاص نقطۂ نظر کے باعث عام طور پر پھیل چکے ہیں اور پھر علم و حکمت کا جامہ اوڑھ کر سرکاری درس گاہوں کے ذریعے ملک بھر میں پھیلے۔ بعینہٖ جیسے قدیم الخیال طبقہ یہ نہیں سمجھتا تھا کہ جب اسلام ایک نظامِ مدنیت ہے تو دورِ حاضر میں اس کا احیا جب ہی ممکن ہے جب ہم ان احوال و ظروف کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر لیں جو ایک غیر اسلامی تہذیب و تمدن یا مغرب کے سیاسی استیلا نے قریباً قریباً دُنیا بھر میں پیدا کر رکھے ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت ہماری سیاسی جماعتوں کی تھی۔ ان کی تدابیر و تجاویز اور عملی اقدامات بھی بڑے وقتی، بڑے غیر اہم اور غیر ضروری مسائل تک محدود تھے۔ اب اسے اسلام کی قوتِ غالبہ کہیے یا یہ کہ مسلمانوں کے ذہن سے اسلام کا خیال کیسے نکل سکتا ہے۔ لہٰذا یہ کچھ کہا جا رہا تھا اسلام کی تائید اور تصدیق کے سہارے۔ گویا افراد ہوں یا جماعتیں سب کی کوشش یہ تھی کہ اس بحث میں جس طرح بھی ممکن ہو تعبیر و تاویل سے کام لے کر ثابت کریں کہ انھیں کا طرزِ عمل حق بجانب ہے۔ اس سے قدرتاً دینی اور سیاسی نزاع کا ایک ناگوار سلسلہ شروع ہو گیا جس نے آگے چل کر بعض نئی تحریکوں کی شکل اختیار کر لی۔ لیکن باعتبارِ نوعیت یہ نزاعات نئے نہیں تھے اور ان کے متعلق حضرت علامہ

اپنے خیالات کا اظہار بڑی وضاحت سے کر چکے تھے لہٰذا انھوں نے اس بحث و
سے مطلق اعتنا نہیں کیا۔ مگر پھر ایسا ہوا کہ سیاسی حوادث نے دفعتہً ایک کروٹ
لی۔ لہٰذا کچھ احوالِ ملک کی تبدیلی اور کچھ ہر جماعت کی ذاتی عصبیت نے ایک ایسی
فضا پیدا کر رکھی تھی جس میں بدگمانی عام تھی، اور اس لیے ہر فریق چاہتا تھا کہ جس طرح
بھی ممکن ہو اپنی طاقت اور اثر بڑھانے کی کوشش میں لگا رہے۔ اس سے بحث نہیں تھی
کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا۔ لوگ گویا حالات سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے لہٰذا جو مسئلہ
سامنے آتا اور اس کے لیے جو اقدام کیا جاتا اس میں بھی ان کا طرزِ عمل کچھ ایسا ہی ہوتا۔
یہ امر کہ مسلمان باہم مل کر اپنے لیے کوئی راستہ تجویز کریں کسی کے ذہن میں نہیں تھا۔
تو گویا بے نتیجہ جوش و خروش، کچھ تعصب اور کچھ بدظنی، کچھ حریفانہ عزائم یا حریفانہ
بحث و جدال۔ بدقسمتی سے یہ صورتِ حالات برسوں سے عام ہو چلی تھی
مگر پھر کشمیر میں نفاذِ اصلاحات کے بعد جب مجلسِ احرار اور جماعتِ احمدیہ کا قدیم
نزاع ——— مذہبی، سیاسی ——— ایک نئی شکل میں زندہ ہوا، یا زندہ کر دیا گیا تو اس
سے پنجاب (قبلِ تقسیم) کی فضا اور زیادہ مکدر ہو گئی۔ کشمیر کمیٹی میں کچھ ایسی
ہی کشمکش دیر سے چلی آ رہی تھی۔ لہٰذا اندیشہ تھا کہ اس کمیٹی کے اندر بھی ایک
دن یمین و یسار کا تصادم ناگزیر ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا حتیٰ کہ کشمیر کمیٹی کا وجود
برائے نام قائم رہ گیا جس کی وجہ یہ تھی کہ کمیٹی کے اندر اور ایسے ہی کمیٹی کے باہر بھی
بعض ارکان کا احساس یہ تھا کہ اس کے کچھ عناصر مسئلۂ کشمیر کی بجائے اپنے ذاتی اور
جماعتی مقاصد کی تبلیغ میں مصروف ہیں۔ یہ خیال پیدا ہوا تو عقیدۂ ختمِ نبوت، یا
یہ سوال کہ بحیثیتِ ایک اُمت ——— یعنی اجتماعِ ملی ——— مسلمانوں کی وحدت

اور حفظ و استحکام کا دار و مدار کس اصول پر ہے پھر تازہ ہو گیا اور اس کے تعیّن کے طور پر یہ کہ مسلمان کون ہے اور کون نہیں؟ یعنی وہ اگر اپنی جمعیت اسی رنگ میں قائم رکھنا چاہیں جیسے اس زمانے میں اقوام و امم نے وطن اور نسل کی اساس پر قائم کر رکھی ہے۔ اب یہ سوال مذہبی بھی تھا اور سیاسی بھی۔ اس کا جواب ممکن تھا اور اس کی صورت یہ تھی کہ ہماری نظر مذہب اور ریاست دونوں پر رہے۔ بالفاظِ دیگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اسلام بیک وقت دونوں کا جامع ہے۔ مگر لوگ اس کا جواب دیتے تو محض سیاسی، یا مذہبی پہلو سے لہٰذا یہ مسئلہ اور الجھتا چلا گیا۔ پھر شروع شروع میں تو یہ نزاع جیسا کہ اس سے پہلے عرض کر دیا گیا تھا صرف پنجاب (قبلِ تقسیم) تک محدود رہا تھا، کیونکہ اس کا تعلق اسی صوبے کی ایک سیاسی اور مذہبی جماعت سے تھا۔ مگر پھر جب اس کی غیر معمولی اہمیت کے پیشِ نظر بعض ایسے حقائق کی تشریح ناگزیر ہو گئی جن کا تعلق اس وقت کی سیاست سے ہر لحاظ سے نہایت گہرا تھا تو حضرتِ علامہ کو مجبوراً ایک بیان دینا پڑا۔ یوں اس نزاع نے ایک ملّی اور قومی مسئلے کی شکل اختیار کر لی۔ ملّی اصولاً اور قومی اس وقت کے سیاسی احوال و ظروف کے ماتحت حضرتِ علامہ نے اوّل تو اس بیان میں اس امر کی تشریح فرمائی کہ سیاسی، اجتماعی، علیٰ ہٰذا مذہبی اعتبار سے وحدتِ امت کی اساس کس اصول پر ہے اور پھر برطانوی اقتدار کا مقابلہ رومی سلطنت سے کرتے ہوئے دونوں کا دعویٰ تھا کہ ان کے ماتحت ہر قوم کو مذہبی آزادی حاصل ہے) اس حقیقت سے پردہ اٹھایا کہ اگر مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ دولتِ برطانیہ کے زیرِ اقتدار وہ از روئے آئین اپنا وجودِ ملّی قائم اور برقرار رکھ سکتے ہیں تو یہ ان کی خوش فہمی ہے۔ لہٰذا اس بیان کا شائع ہونا تھا کہ طرح طرح کے سوال پیدا ہونے لگے اور ملک بھر کے روزناموں، رسائل و جرائد نے اس

پر رائے زنی شروع کردی۔ یہ اس لیے کہ حضرتِ علامہ نے ایک ایسے نزاع کا سلسلہ جو بظاہر ایک مذہبی عقیدے تک محدود تھا سیاست و اجتماع علیٰ ہٰذا اس وقت آئینی جدّ و جہد سے جوڑ دیا تھا جس سے ہندوستان (غیر منقسم) کی ساری سیاست متأثر ہوتی تھی۔ اُنھوں نے اسلام کی ہیئتِ اجتماعیہ علیٰ ہٰذا وحدتِ اُمّت کی تعبیر ایک ایسے رنگ میں کی تھی جو سرتاسر درست ہی نہیں بلکہ اس اصولِ قومیت کے بھی منافی تھا جو کانگرس نے مغربی افکارِ سیاست سے اخذ کیا تھا اور جس کا مطلب یہ تھا کہ برطانوی اقتدار سے آزادی کی جدّ و جہد نے آئینی یا غیر آئینی جو طریق بھی اختیار کر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور اصولِ کار بھی ہے مگر یہ بات کانگرس کے عزائم، مقاصد اور تدابیر کے سرتاسر خلاف تھی لہٰذا بیان شائع ہوا تو پنڈت جواہر لعل نہرو خاموش نہ رہ سکے۔ اُنھوں نے بھی کچھ دنوں کے بعد ایک بیان شائع کر دیا جس میں اپنے مخصوص خیالات اور معتقدات کے ماتحت حضرتِ علامہ کے ارشادات کی تنقید کرتے ہوئے مذہب اور سیاست دونوں کو زیرِ بحث لے آئے۔ حضرتِ علامہ کے بیان اور بیان کی اشاعت کے بعد بعض تصریحات کا حقیقی سبب تو وہ نزاع تھا جو بدقسمتی سے مجلسِ احرار اور جماعتِ احمدیہ کے درمیان مسئلۂ ختمِ نبوت کے بارے میں جاری تھا لیکن اس نزاع کے دوران میں چونکہ وحدتِ اُمّت کا مسئلہ بھی زیرِ بحث آجاتا تھا لہٰذا اس امر کی تشریح لازم آتی تھی کہ اسلام کا نقطۂ نظر سیاست و اجتماع اور تہذیب و ثقافت کے بارے میں کیا ہے۔ ایک لحاظ سے یہ بحثیں محض علمی اور فلسفیانہ تھیں لیکن ان کا ایک پہلو جیسا کہ ہم ابھی عرض کر آئے ہیں ایسا بھی تھا جس سے اس وقت کی عملی سیاست متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ ہندو اکثریت

کا مفاد غالباً اس میں تھا کہ مُسلمانوں کے اندر اگر عقیدۃً کچھ فرقے موجود ہیں تو جس طرح
بعض مذہبی اُمُور میں ان کا اِتّحاد و اِشتراک ناممکن ہے، بعینہٖ سیاسی اور اجتماعی اِعتبار
سے بھی اگر وہ مختلف جماعتوں میں تقسیم ہو جائیں اور اس کا نتیجہ یہ ہو کہ ان کی وفاداریاں
بٹ جائیں تو اس میں از رُوئے مذہب کیا خرابی ہے ــــ کیونکہ مذہب تو نام ہے
اِنسان کے ذاتی عقیدے کا ــــ بلکہ اگر یہ نقطۂ نظر قبول کر لیا جائے تو وہ اس سے
خاطر خواہ فایدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح عین ممکن ہوگا کہ ان میں سے کوئی جماعت
اِسلامی اکثریت کے صُوبوں میں بھی اپنی جُداگانہ نیابت کا مطالبہ کرنے لگے مثلاً پنجاب
ہی میں جہاں تین ملتیں یا تین قومیں - ہندو، مُسلمان اور سکھ - پہلے سے
موجُود ہیں۔ یہاں اگر ایک یا دو ملتوں کا اور اضافہ ہو جائے اور وہ جُداگانہ نیابت پر
اصرار کریں تو اس پر اعتراض کی کونسی بات ہے۔ حالانکہ مذہب ہو یا سیاست جس پہلو
سے دیکھا جائے مُسلمانوں کی وحدتِ ملی، علیٰ ہٰذا اس مُلک میں ان کے مُستقبل کے لیے یہ
چیز بڑی خطرناک تھی۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے بھی مسئلہ زیرِ بحث کے اُن پہلوؤں کو تو
گویا بین السطُور میں رکھا، لیکن متن میں بڑے علمی انداز میں اور بظاہر سیاسیات سے
بے تعلق ہو کر حضرتِ علامہ کے ارشادات کی تنقید اس طرح کی جس سے بعض اِسلامی
حقائق بہت بُری طرح مجرُوح ہوتے تھے اور جس کے پیشِ نظر حضرتِ علامہ مجبور ہو گئے
کہ ان عمرانی، اخلاقی اور مذہبی حقایق سے پردہ اُٹھائیں جن پر گویا بحیثیت ایک نظامِ
مدنیت اسلام کی عمارت کھڑی ہے اور جو اگر غیر واضح رہ جاتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا
کہ اِسلام کا یہ دعویٰ کہ وہ بجائے خود ایک سیاست و اجتماع اور ایک مُستقل تہذیب
ہے غلط ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ پنڈت جی نے اِسلامی تعلیمات سے ناواقفیت کے

باوجود ان مسائل پر جس انداز میں رائے زنی کی تھی وہ بڑا ناگوار تھا اور اس لیے حضرتِ علامہ کو بڑی رنج کے ساتھ پنڈت جی کے جواب میں قلم اٹھانا پڑا۔ میں لاہور ہی میں تھا جب پنڈت جی کا یہ بیان زیرِ بحث آیا اور تعجب ہوا کہ انھوں نے بطورِ ایک نظامِ حیات اسلام کو سمجھنے کی کوشش تو کی نہیں۔ برعکس اس کے غلط خیالیوں اور غلط بیانیوں کا ایک طومار باندھ دیا۔ دراصل پنڈت جی نے بلاوجہ ایک ایسی بحث میں دخل اندازی کی تھی جس کے وہ اہل نہیں تھے۔ ان کی روش بھی طالب علمانہ نہیں تھی، بلکہ معترضانہ۔ یوں بھی اُن کا خطاب ایک طرح سے حضرتِ علامہ ہی سے تھا اور اس لیے حضرتِ علامہ کے لیے بجز اس کے کہ ان سب حقائق کی تشریح فرمائیں جن کی طرف پنڈت جی نے اشارہ کیا تھا کوئی چارۂ کار ہی نہیں تھا۔ پنڈت جی کے بیان کو بے جواب چھوڑ دینا ایک طرح سے اعترافِ شکست تھا جس سے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو شدید صدمہ پہنچتا۔ لہٰذا کچھ دنوں کی تگ و دو کے بعد حضرتِ علامہ نے فیصلہ کیا کہ ایک طویل بیان شائع کریں۔ حالانکہ انھیں آرام کی ضرورت تھی اور حکیم صاحب بھی فرما چکے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کو دماغی محنت سے احتراز کرنا چاہیے۔ بایں ہمہ حضرتِ علامہ نے یہ طویل بیان جس نے آگے چل کر ایک مضمون کی شکل اختیار کر لی رقم فرمایا۔ چنانچہ یہی بیان ہے جو بعد میں اسلام اور احمدیت کے عنوان سے شائع ہوا۔

میں دہلی پہنچ گیا۔ لیکن مضمون کا خیال برابر میرے ذہن میں تھا۔ میں نے خیریتِ مزاج دریافت کی اور ساتھ ہی مضمون کا بھی پوچھا۔ میں سمجھتا تھا اس کی تکمیل ہو گئی ہو گی۔ اس لیے کہ میں جب لاہور سے چلا تو حضرتِ علامہ اس کا بہت سا حصہ لکھ چکے تھے۔ ارشاد ہوا:۔

ڈیئر نیازی صاحب۔

میں خدا کے فضل سے اچھا ہوں۔ ایک ایرانی الاصل سید زادے کی دعا نے بہت فایدہ کیا۔ کیا عجب کہ آواز پھر عود کر آئے اس کا دعویٰ تو یہی ہے۔ اسی واسطے میں نے چند روز کے لیے بھوپال جانا ملتوی کر دیا ہے اس کے علاوہ سردی بھی بہت تھی۔ غالباً جنوری کے آخر میں جاؤں گا۔ مضمون ختم ہو گیا ہے۔ پمفلٹ کی صورت میں شائع ہوگا۔ غالباً تیس چالیس صفحے ہوں گے۔ آج ٹائپ ہوگا۔ ٹائپ ہونے کے بعد میں پھر نظرِ ثانی کر کے پریس میں دوں گا۔

والسلام
محمد اقبال

۳ جنوری ۳۶

مضمون کی خاطر حضرتِ علامہ نے بھوپال جانا ملتوی کر رکھا تھا۔ ایرانی النفس سید زادے کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ آواز کی کشائش سے ایک گونہ اطمینان ہوا۔ اب مضمون کا انتظار تھا۔ لیکن ہفتہ عشرہ گزر گیا اور مضمون موصول ہوا، نہ کسی اخبار میں نظر آیا۔ میں نے استفسار کیا تو فرمایا:

ڈیئر نیازی صاحب۔

آپ کا خط مل گیا ہے۔ اس سے پہلے میں نے آپ کو ایک پوسٹ کارڈ بجواب آپ کے ایک پہلے خط کے لکھا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے وہ کارڈ آپ تک نہیں پہنچا۔

بہرحال خدا کا شکر ہے کہ صحت اچھی ہے۔ آواز کا بھی علاج ہو

رہا ہے۔ مضمون کا آخری پروف میں نے آج بھیجا ہے۔ اُمید کہ آج شام یا کل شام تک چھپ جائے گا۔ انشاءاللہ۔ میں آپ کو کل پرسوں تک اس کی ایک کاپی ارسال کرسکوں گا۔ باقی خدا کے فضل وکرم سے خیریت ہے۔ میں جنوری کے آخر یا مارچ کے پہلے ہفتے میں بھوپال جانے کا قصد رکھتا ہوں۔ والسلام

راجہ صاحب سے سلام کہہ دیجیے گا۔

محمد اقبال لاہور

۱۷ جنوری ۳۶

حالانکہ حضرتِ علامہ کا پوسٹ کارڈ مجھے مل چکا تھا۔ بہرحال مضمون اب دو ایک روز میں شائع ہو رہا تھا۔

راجہ صاحب — یعنی راجہ حسن اختر جو ان دنوں دہلی میں میرے ہاں مقیم تھے۔

"آواز کا علاج ہو رہا ہے" یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ کوئی نیا یا حضرتِ علامہ حکیم صاحب کی دواؤں کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔

مضمون دوسرے تیسرے روز شائع ہو گیا اور میں نے اس کا ترجمہ اردو میں شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں ایک اصطلاح بحث طلب تھی۔ میں نے حضرتِ علامہ کی رائے دریافت کی تو ارشاد ہوا:۔

ڈیئر نیازی صاحب۔

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ الحمدللہ کہ آپ خیریت سے ہیں۔ میرا حال بھی خدا کے فضل سے بہتر ہے۔ انشاءاللہ وسط فروری میں بھوپال جانے کا قصد ہے۔

major occultation کا ترجمہ ہے غیبتِ کبریٰ۔

راجہ حسن اختر صاحب سے سلام کہہ دیجیے اور اگر ان کو کاپی پمفلٹ کی نہیں ملی تو مطلع کیجیے کہ بھیج دوں۔ معلوم نہیں ان کا ایڈریس کیا ہے۔ یورپ کے لیے ایک علیحدہ ایڈیشن پانچ سو کی تعداد میں شائع کیا گیا ہے۔ والسلام۔

محمد اقبال۔ ۲۸ جنوری ۳۶

لاہور

راجہ حسن اختر ابھی دہلی ہی میں تھے۔ غیبتِ کبریٰ [۲] کی اصطلاح سمجھ میں آ گئی اور یہ بھی کہ حضرت علامہ کا اشارہ اپنے بیان میں کس طرف ہے [۳]۔ میں نے جواب میں صحتِ مزاج دریافت کی اور یہ بھی عرض کیا کہ اسلام اور احمدیت کا ترجمہ مکمل ہو گیا ہے۔ ارشاد ہوا:-

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ نے لکھا تھا کہ ترجمہ اسلام اور احمدی ازم تیار ہو گیا ہے۔ مہربانی کر کے جلد مطلع کریں کب شائع ہو گا۔ اگر آپ سے نہیں ہو سکا تو بعض احباب یہ کہتے

---

۲۔ یہ اشارہ ہے اس عقیدے کی طرف کہ امام مہدی امام آخرالزمان ہیں۔ ایک ہزار برس سے زیادہ مدت ہوئی کہ وہ سامرا کے ایک غار میں روپوش ہو گئے۔ وہ زندہ ہیں گو ہماری نگاہوں سے پوشیدہ۔

۳۔ ملاحظہ ہو اسلام اور احمدیت۔ حضرتِ علامہ کا ارشاد یہ تھا کہ ظہورِ مسیح مہدی کے متعلق مسلمانوں کے خیالات کچھ بھی رہے ہوں ختمِ نبوت سے آج تک کسی نے انکار نہیں کیا۔

ہیں کہ مولوی ظفر علی خاں صاحب سے کرایا جائے۔ جواب جلدی لکھیں۔

والسلام۔

طلوعِ اسلام کے نکلنے میں اس قدر تعویق رسالے کی اشاعت کے لیے اچھی نہیں۔

محمد اقبال۔ لاہور

۳ فروری ۳۶

میرا خیال تھا کہ اسلام اور احمدیت کا ترجمہ طلوعِ اسلام میں شائع کروں ـــــ جیسا کہ بالآخر کیا ـــــ لیکن طلوعِ اسلام کی اشاعت میں چونکہ دیر ہو رہی تھی۔ اس لیے حضرتِ علامہ یہ سمجھے کہ ترجمہ شاید مکمل نہیں ہوا۔ مَیں نے مفصل خط لکھا اور اپنی معذوریوں کا ذکر کیا۔ مجھے خود احساس تھا کہ رسالے کی اشاعت میں تعویق نہیں ہونی چاہیے مگر حالات کچھ ایسے تھے کہ رسالہ شائع نہ ہو سکا۔ مَیں نے عرض کیا اس کی سب سے بڑی وجہ میری ناتجربہ کاری ہے۔ مزید کہ مَیں نے اس امر کا خیال ہی نہیں کیا کہ رسالے کا ایک پہلو کاروباری بھی ہے اور یہ میری غلطی ہے۔ رہا ترجمہ سو اگر مولانا ظفر علی خاں کریں تو اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔

حضرتِ علامہ بظاہر مطمئن ہو گئے۔ چند دِن خاموشی رہی۔ پھر ارشاد ہوا:۔

لاہور۔ ۹ فروری ۳۶ء

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ کا خط مل گیا ہے۔ اسلام اور احمدیزم۔ صفحہ ۲۰ ملاحظہ فرمایئے۔ سطر ۶

in the same year[4] ؟ ۔ مجھے تو یہی یاد تھا کہ نوارینو[5] کی لڑائی ۱۷۹۹[6] میں ہوئی تھی مگر آج ایک شخص نے شبہ میں ڈال دیا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ یہ لڑائی ۱۸۲۷[7] میں ہوئی ۔ اس شبہ کی بنا پر ضروری ہے کہ آپ

---

۴ ۔ اسی سال

۵ ۔ Navirano

۶ ۔ یہ سلطان شہید کا سال شہادت ہے ۔

۷ ۔ ٹھیک تاریخ ہے ۲۰ اکتوبر، ۱۸۲۷ء ۔ دولتِ عثمانیہ کے زوال میں اس محاربہ کو بڑا دخل ہے کیونکہ اس محاربہ میں ترکی بیڑے کی تباہی سے کم از کم دو صدیوں کے تفوق کے بعد دولتِ عثمانیہ کی بحری طاقت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا ۔ یہ محاربہ اس ترکی یونانی جنگ کے سلسلے میں پیش آیا جسے اہلِ یورپ یونان کی جنگِ آزادی سے تعبیر کرتے تھے اور جس میں سیاسی مصلحتوں، ترکوں اور ترکوں کے باعث عالم اسلام، علی ہذا مشرق سے جذباتِ نفرت اور اہلِ یورپ کی ہوسِ اقتدار کے ساتھ ساتھ ایک خیالی یونان کے تصور نے ـــ جس کا دو ہزار برس ہوئے خاتمہ ہو چکا تھا ـــ ایک جذباتی رنگ پیدا کر دیا تھا ۔ معلوم ہوتا تھا اہلِ یورپ سقراط اور افلاطون کے یونان کی آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں جیسے اس وقت بھی ایتھنیز اور اسپارٹا اپنی قدیم روایات کے ساتھ زندہ اور برقرار تھے ۔ بہر حال واقعات یہ ہیں کہ ۶ جولائی ۱۸۲۷ء کو روس، فرانس اور انگلستان نے بابِ عالی کو عارضی صلح پر مجبور کر دیا اور ۱۰ اگست کو جب صلحنامہ بحیرہ روم کے برطانوی سپہ سالار کوڈرنگٹن Codrington کے حوالے کر دیا گیا تو اس کے ساتھ ہی موریا (جنوبی یعنی حقیقی یونان) میں اتحادیوں نے ترکی رسل و رسائل کا سلسلہ بھی روک دیا ۔ ۱۲ ستمبر کو اطلاع پہنچی کہ مصر (اسکندریہ) سے ترکی بیڑے کے لیے کمک آ رہی ہے ۔ چنانچہ اب ترکی بیڑہ نوارینوں میں (باقی صفحہ ۳۴۰ کے نیچے)

خود اس امر کی تحقیق کر لیں۔ کسی انسائیکلو پیڈیا سے معلوم ہو جائے گا یا کسی یورپین تاریخ سے۔ اگر تحقیق سے ۱۸۲۷ء ہی درست ہو تو مذکورہ بالا سطر میں مناسب ترمیم اپنے اردو ترجمے میں کر دیں مثلاً آپ یہ لکھ سکتے ہیں "کچھ مدت بعد نوارینو کی لڑائی ہوئی جس میں ترکوں کا بیڑہ فنا ہو گیا۔" غرضیکہ پوری تحقیق کے بعد تبدیلی کر کر دیں۔ والسلام۔

مجھ کو ابھی تک یہی گمان ہے کہ یہ جنگ ۱۷۹۹ میں ہوئی تھی۔ بہر حال تبدیلی ضروری ہے۔ والسلام

محمد اقبال

حضرتِ علامہ کا یہ مکتوب اگلے روز ۱۰ فروری کو صادر ہوا۔ ایک دن تحقیق میں گزر گیا۔ اگلے روز جواباً عرض کیا کہ تعمیلِ ارشاد کر دی ہے۔ لیکن اسی روز حضرتِ علامہ ایک اور خط لکھ چکے تھے اور یہ اسلام اور احمدیت کے ترجمے کے متعلق تھا۔ فرمایا:—

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

معلوم ہوتا ہے انجمن خدام الدین سے آپ نے اسلام اور احمد ازم کا ترجمہ کرنے کی اجازت نہیں لی۔ وہ شاکی ہیں خصوصاً اس وجہ

---

(بقیہ از صفحہ ۳۱۹) لنگر انداز ہو گیا۔ اتحادیوں کا بیان ہے کہ اس پر ابراہیم پاشا نے صلح سے انکار کر دیا۔ لہٰذا اتحادیوں کو مجبوراً ترکی بیڑے سے جنگ کرنا پڑی۔ ۲۰ اکتوبر کو نوارینو میں جو معرکہ ہوا اس میں تین چوتھائی ترکی بیڑہ نقصانِ عظیم اٹھا کر غرق ہو گیا۔ یہ آغاز تھا دولتِ عثمانیہ کی بحری طاقت کے خاتمے کا۔

سے کہ مولوی ظفر علی خاں سے اس کا ترجمہ کروا کر اسے مفت شائع کرنے کا قصد رکھتے ہیں۔ ان سے ضرور دریافت کر لینا چاہیے تھا۔ والسلام

محمد اقبال۔ لاہور

۱۲ فروری ۳۶

انجمن سے آپ کو ضرور فیصلہ کر لینا چاہیے کیونکہ اگر انھوں نے اُردو ترجمہ مُفت شائع کر دیا تو آپ کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ کیا آپ اپنے ترجمے کو قیمتاً بیچ رہے ہیں۔ مَیں فروری کے آخری ہفتے میں بھوپال کا قصد رکھتا ہوں۔

مَیں نے عرض کیا۔ مضمون تو آپ نے لکھا ہے اور ترجمہ مَیں نے کیا ہے جس کی اطلاع مَیں نے آپ کی خدمت میں اس لیے کر دی تھی کہ اسے افادۂ عام کے لیے طلوعِ اسلام میں شائع کروں۔ انجمنِ خدّام الدین سے فیصلہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مَیں جو کچھ کر رہا ہوں اس سے کوئی مالی منفعت مطلوب نہیں۔ انجمن کو میرا ترجمہ پسند نہیں تو بے شک مولانا ظفر علی خاں اس کا ترجمہ کر دیں۔ میں نے پہلے ہی عرض کیا تھا کہ ان سے بہتر انتخاب اور کیا ہو سکتا ہے۔ مَیں اس پر کیوں اعتراض کرنے لگا۔ مَیں نے خطبۂ الٰہ آباد کا ترجمہ بھی محض اپنے شوق سے اور خدمت سمجھ کر کیا تھا۔ اس وقت بھی کوئی مالی مفاد پیشِ نظر نہیں تھا۔

معلوم ہوتا ہے حضرت علامہ کا میرے عریضے سے اطمینان ہو گیا چنانچہ اس مرتبہ جو گرامی نامہ صادر ہوا اس میں ان اُمور کی طرف مطلق اشارہ نہیں تھا۔

اس اثنا میں محاربۂ نزارینہ کی اصل تاریخ کے متعلق حضرت علامہ خود ہی تحقیق کر چکے تھے، لہذا ارشاد ہوا:۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

پہلے خط لکھ چکا ہوں۔ نزارینہ کی لڑائی واقعی ۱۹۲۷ میں ہوئی تھی۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ اگرچہ یہ غلطی اس موقع کی آرگیومنٹ ۸ پر موثر نہیں ہے۔ تاہم اپنے ترجمے میں اس کی اصلاح کر دیں خواہ متن میں خواہ نوٹ کے طور پر۔

ڈاکٹر افشار کا خط اس میں ملفوف کرتا ہوں۔ یہ صاحب ایرانِ جدید کے مشہور اُدبا میں سے ہیں۔ آج کل بمبئی میں ہیں۔ یہ خط اُنھوں نے وہیں سے لکھا ہے۔ اس میں چند اشعار اُنھوں نے پیامِ مشرق کے لیے لکھے ہیں جس کا ایک نسخہ میں نے ان کی درخواست پر ان کی خدمت میں بھیجا تھا۔ طلوعِ اسلام کے آیندہ نمبر میں شائع ہو جائیں تو محفوظ رہ جائیں گے۔

والسلام۔

محمد اقبال

۱۵ فروری ۳۶

لاہور

میں نے عرض کیا تعمیلِ ارشاد کر چکا ہوں ۹۔ ڈاکٹر افشار کا قطعہ

۸۔ دلیل۔

۹۔ محاربۂ نزارینہ کی صحیح تاریخ کی۔

طلوعِ اسلام میں شائع ہو جائے گا۔ قطعہ یہ ہے :۔

## پیامِ مشرق
## یا
## گل ہائے نوظہور

اندیشہ داشتم چہ ز ہندوستاں برم — سوغاتے از سفر بہ بر دوستاں برم
ایراں کہ بوستانِ گل و بلبل است من — در حیرتم چہ تحفہ سُوئے بوستاں برم
اقبال روئے کرد فراز آمدم ندر — گُل ہائے نوظہور کہ زی گلستاں برم
نغمہ سرا شوند ہمہ بلبلانِ فارس — زیں نغز چامہ ہا کہ ز ہندوستاں برم

اب مجھے سلطان الہند[1] کے مزار پر کندہ شدہ تاریخ کی جستجو تھی جس کے متعلق مَیں اس سے پہلے بھی حضرتِ علّامہ کی خدمت میں لکھ چکا تھا۔ حضرتِ علّامہ نے فرمایا :۔

ڈیئر نیازی صاحب۔

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ سلطان الہند کے مزار پر جو تاریخ لکھی ہے عربی میں ہے۔ افسوس اس کے الفاظ مجھے پورے طور پر یاد نہیں۔

---

۱۔ سلطان فتح محمد خاں (ٹیپو سلطان)۔

خیال یہ تھا کہ طلوعِ اسلام میں سلطان شہید کے بارے میں ایک سلسلۂ مضامین شائع کیا جائے۔

نصیر احمد کی درخواست میں نے انجمن کے دفتر میں اپنے ریمارک کے ساتھ بھیج دی تھی۔ اس کا فیصلہ پبلسٹی کمیٹی کرے گی۔ اس کی میٹنگ معلوم نہیں کب ہو۔ آپ چودھری صاحب کو لکھ دیں کہ وہ اس کا خیال رکھیں۔ انجمن خدام الدین کو آپ خود خط لکھیں۔ اس کے علاوہ آج کے اخبار احسان میں شعبۂ تبلیغ و اشاعت مسجد مبارک اسلامیہ کالج لاہور کی طرف سے اعلان ہوا ہے کہ اسلام اور احمدیزم کے اردو ترجموں کی کاپیاں لاکھوں کی تعداد میں شائع کی جائیں۔ اور مفت تقسیم کی جائیں۔ چونکہ آپ ترجمہ کر چکے ہیں جس کی طباعت بھی ہو چکی ہے آپ اس شعبۂ اشاعت و تبلیغ سے خط و کتابت کریں۔ ممکن ہے وہ آپ سے کل تعداد خرید لیں۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ فروری کے آخری ہفتے میں بھوپال جانے کا قصد ہے

والسّلام
محمد اقبال۔ لاہور
۱۵ فروری ۳۶ء

میں نے جواب میں پھر عرض کیا مجھے ترجمے سے کوئی مالی منفعت مقصود نہیں۔ مسجد مبارک کا شعبۂ اشاعت و تبلیغ اپنے خرچ سے جتنی تعداد میں چاہے چھپوا لے۔

چودھری صاحب کو میں نے کوئی خط نہیں لکھا۔ اب میں منتظر تھا حضرتِ علامہ کب بھوپال تشریف لے جاتے ہیں۔ دواؤں کی ترسیل اور حکیم صاحب کی خدمت میں حاضری کا سلسلہ بالالتزام جاری تھا، گو حضرتِ علامہ اُمورِ ملّی میں

اس درجہ منہمک تھے کہ ان مکتوبات میں علالت کا ذکر تک نہیں کیا۔

حضرتِ علامہ کی خدمت میں میرا عریضہ پہنچا تو فرمایا:۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ کا خط مل گیا ہے الحمدللہ کہ خیریت ہے۔

میں بھی خدا کے فضل سے کسی قدر بہتر ہوں۔ ۲۸ فروری یا یکم مارچ کو بھوپال کا قصد رکھتا ہوں۔ جاتی دفعہ دہلی نہ ٹھہروں گا۔ انشاءاللہ بھوپال سے واپسی پر قنصل خانے میں ایک آدھ روز قیام رہے گا کہ سردار صلاح الدین اصرار کرتے ہیں۔ روانگی سے پہلے آپ کو پھر خط لکھوں گا۔ ارادہ یہ ہے کہ تمام دن دہلی اسٹیشن پر ہی رہوں گا وہاں سے پانچ بجے شام کی گاڑی میں بھوپال روانہ ہو جاؤں گا۔ آپ پہلے سے اس گاڑی کا وقت معلوم کر چھوڑیں۔ والسلام۔

محمد اقبال۔ لاہور

۱۹ فروری ۳۶

میں نے سردار صاحب کی خدمت میں اطلاع کر دی۔ انھیں بڑی شکایت تھی کہ حضرتِ علامہ براہِ راست بھوپال جا رہے ہیں۔ قنصل خانے میں قیام نہیں فرمائیں گے۔ ۲۶ کو اطلاع موصول ہوئی:۔

لاہور۔ ۲۵ فروری ۳۶

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

میں یہاں سے ۲۹ فروری کی شب کو فرنٹیئر میل چلوں گا یا دوسری

ٹرین میں جو اس کے قریب ہی لاہور سے چلتی ہے۔ بہرحال یکم مارچ کی صبح کو دہلی پہنچ کر دن بھر وہیں قیام کروں گا۔ ۴-۵ بجے بعد دوپہر جو ٹرین دہلی سے بھوپال کی طرف جاتی ہے اس میں سوار ہو کر ۲ مارچ کو بھوپال پہنچوں گا۔

اطلاعاً گزارش ہے۔ والسلام۔

محمد اقبال

یکم مارچ کو حسبِ قرارداد حضرتِ علامہ دہلی تشریف لائے۔ قیام کچھ ریلوے اسٹیشن پر اور کچھ متصل خانے میں رہا۔ تیسرے پہر بھوپال روانہ ہو گئے۔ مقصدِ سفر اب بھی وہی تھا۔ بجلی کا علاج اور سر راس مسعود کی ملاقات۔

بھوپال پہنچتے ہی حضرتِ علامہ نے خیریتِ مزاج سے مطلع فرمایا:-

بھوپال۔ شیش محل

۳ مارچ

ڈیئر نیازی صاحب۔

میں کل مع الخیر بھوپال پہنچ گیا۔ سید راس مسعود کے پاس کوئی خبر طلوعِ اسلام کا آج تک نہیں پہنچا۔ ان کے نام تمام نمبر فوراً بھجوا دیجیے۔ مزید کوشش بھی کی جائے گی۔ سید صاحب کا نام بھی اپنے خریداروں میں لکھ لیجیے۔ میں نے ان سے آپ کی مدد کا وعدہ لے لیا ہے اور اعلیٰ حضرت سے خود بھی کہوں گا۔ افغانستان والے معاملے کو بھی ■■■■■■ کرنا چاہیے۔ باقی ہر معاملے میں خدا پر بھروسہ رکھنا مسلمان کا کام ہے۔ والسلام

محمد اقبال

طلوعِ اسلام کی کامیابی کا حضرت علامہ کو بڑا خیال تھا۔ ان کے احسانات یُوں بھی مجھ پر کیا کم تھے۔ اس التفات و توجّہ نے تو گویا میری زبانِ سپاس پر مُہر کر دی۔ مَیں ان ایّام میں دہلی سے لاہور منتقل ہونے کی طیاریاں کر رہا تھا۔ حضرتِ علامہ کی تجویز بھی یہی تھی کہ مَیں لاہور چلا آؤں۔ لہٰذا سلسلۂ خط و کتابت میں تعویق ہُوئی تو ارشاد ہُوا:۔

بھوپال

۸ مارچ ۳۶ء

ڈیئر نیازی صاحب۔ السّلامُ علیکم۔

اُمّید ہے یہ خط آپ کو دہلی میں مل جائے گا۔ آپ ایک عرضداشت اعلیحضرت کے نام رسالہ طلوعِ اسلام کی مدد کے لیے لکھیے۔ اَور تینوں رسالے بھی ان کے نام ارسال کر دیجیے۔ عرضداشت میں رسالہ کے اغراض و مقاصد اَور اس کا نصبُ العین عمدہ الفاظ میں بیان کیجیے۔ نیز یہ بھی لکھیے کہ اس وقت سارے ہندوستان میں علمی اداروں اَور رسالوں کی حوصلہ افزائی کرنے والی سوائے اعلیحضرت کی ذاتِ والا صفات کے اَور کون ہے۔ یہ عرضداشت میرے نام ارسال کیجیے تاکہ مَیں اس پر اپنی سفارش لکھ کر سیّد راس مسعُود کے پاس بھیج دُوں۔ والسّلام۔

محمد اقبال

لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا تھا اعلیحضرت سے کس بنا پر طلوعِ اسلام کی امداد کے لیے درخواست کرُوں۔ عرضداشت کا مضمُون بھی ذہن میں نہیں آتا

تھا۔ احباب سے ذکر کیا تو اُنھوں نے کہا یہ دربارداری کے معاملات ہیں۔ تم ان سے عہدہ برآ نہیں ہو سکو گے۔ ویسے حضرتِ علامہ کے ارشاد کی تعمیل ضروری ہے۔

بہرحال جوں توں کر کے ایک عرضداشت مرتب کی۔ لیکن گھربار چونکہ لاہور منتقل ہو رہا تھا، لہٰذا اس کی ترسیل میں غیر معمولی تاخیر ہوگئی۔ آخر مارچ میں مَیں لاہور منتقل ہوگیا۔ حضرتِ علامہ نے مجھے خاموش پایا تو میرے مرحوم دوست سید سلامت اللہ کو خط لکھا۔ حضرتِ علامہ کو طلوعِ اسلام اور میرے مستقبل کا کس قدر خیال تھا۔ اِرشاد ہُوا:۔

بھوپال ۲۸ مارچ ۳۶

ڈیئر سلامت اللہ شاہ صاحب :

معلوم نہیں نیازی صاحب لاہور پہنچے یا نہ پہنچے۔ مَیں نے جو خط ان کو لکھا تھا اس کا کوئی جواب اُنھوں نے نہیں دیا۔ مَیں نے ان کو لکھا تھا کہ طلوعِ اسلام کی مدد کے لیے ایک عرضداشت اعلیٰحضرت نواب صاحب بھوپال کے نام لکھ کر میرے نام فوراً ارسال کر دیں۔ عرضداشت کا مضمون بھی مَیں نے اس خط میں لکھ کر دیا تھا۔ وُہ اب تک خاموش ہیں۔ اگر انھوں نے تساہل کیا تو معاملہ دُوسرے سال پر پڑ جائے گا۔ اس وقت بجٹ تیار ہو رہا ہے اگر وُہ فوراً عرضداشت بھیج دیں تو کام اسی سال سے ہو جائے گا۔ جہاں کہیں بھی ہوں ان کو تاکید کر دیں کہ عرضداشتِ مذکورہ عمدہ کاغذ پر خوشخط لکھ کر فوراً اِرسال کر دیں۔ عرضداشت میں اعلیٰحضرت کو ایڈریس

کیا جائے اور میرے پاس بھیجا جائے تاکہ میں اس پر اپنی سفارش لکھ سکوں۔

والسلام۔

محمد اقبال

میں اب لاہور میں تھا اور سید سلامت اللہ حضرتِ علامہ کو اس امر کی اطلاع کر چکے تھے۔ میں نے بھی مفصل عریضہ تحریر کر دیا۔ ۳۱ مارچ کا مکرمت نامہ یہ ہے :۔

بھوپال

۳۱ مارچ ۳۶

ڈیئر نیازی صاحب۔ السلامُ علیکم۔

آپ کی عرضداشت پہنچ گئی ہے۔ میں انشاء اللہ ۹ اپریل کی شام کو ساڑھے سات بجے لاہور پہنچ جاؤں گا۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ والسلام۔

محمد اقبال۔ بھوپال

۹ اپریل کو حضرتِ علامہ واپس لاہور تشریف لائے۔ معلوم ہوتا تھا بھوپال کا قیام ان کی صحت کے لیے بہت اچھا رہا۔ آواز کی حالت بھی بہتر ہو گئی تھی۔ اور چہرے پر بھی تندرستی کے آثار نمایاں تھے۔ قیامِ بھوپال میں چونکہ طبی علاج کا سلسلہ عارضی طور پر منقطع ہو گیا تھا اس لیے میں دہلی سے روانہ ہوا تو حکیم صاحب قبلہ کی خدمت میں اس امر کی اطلاع بھی کر دی۔ یوں بھی مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونا ضروری تھا تاکہ دو ڈھائی برس کی

اس مدّت میں وہ جس التفات اور محبت سے پیش آئے اس کا شکریہ ادا کرسکوں۔ حکیم صاحب قبلہ کی یہ عنایات مجھے ہمیشہ یاد رہیں گی۔ اللہ تعالیٰ ان کے مراتبِ عالیہ میں اضافہ کرے۔ آمین!

یوں وہ سلسلۂ مکاتبت جس کا آغاز ۱۹۲۹ میں ہوا تھا ۱۹۳۶ میں ختم ہو گیا۔

مگر ــــــ

# ۱۹۳۷

## علمائے مصر
## ایک مضمون

مگر ـــــ مگر یہ کہ باوجود روزمرہ حاضری کے دو مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ حضرت علامہ نے خود لکھ کر مجھے طلب فرمایا، حالانکہ علی بخش پیغام رسانی کے لیے موجود تھا۔ میں کسی روز دیر سے پہنچتا یا اتفاقاً ناغہ ہو جاتا تو علی بخش کا آنا یقینی تھا۔ پیغام یہی ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب یاد کر رہے ہیں۔ پہلا مکتوب ۲۳ جنوری کا ہے :۔

لاہور۔ ۲۳ جنوری ۳۷ء

ڈیئر نیازی صاحب۔ مصر کے علما آج آگئے ہیں۔ میں نے ان کو ۲۷ جنوری بروز بدھ ڈیڑھ بجے بعد دوپہر ٹی پر بلایا ہے۔ آپ مع راجہ حسن اختر صاحب ضرور تشریف لائیں۔

ٹی سپنسر ہوٹل (۷ منٹگمری روڈ) میں ہوگا جو آپ کی جگہ سے قریب ہے۔

والسلام

محمد اقبال

میو روڈ۔ ۷۰۰

علمائے مصر کا یہ بے ضابطہ وفد (غیر منقسم) ہندوستان کا دورہ کرتا ہوا لاہور آیا۔ حضرت علامہ سے متعدد ملاقاتیں ہوئیں مگر اس وفد میں کوئی خاص بات نہیں تھی، ویسے کہا جاتا تھا اس کا تعلق جامعہ ازہر سے ہے اور مقصد یہ کہ اس نیم برِ اعظم کے مسلمانوں سے محبت اور دوستی کے روابط پیدا کرے۔ لیکن یہ دوستی اور محبت کا معاملہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اِس لیے کہ مسلمان تو جہاں کہیں بھی ہیں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور وہ جب کبھی ایک دوسرے سے ملیں گے دوستی اور محبت ہی کے جذبات لے کر ملیں گے۔ اسلام سے بڑھ کر دوستی اور محبت کا پیغامبر کون ہے۔ "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ"۔ لہٰذا اُمم اسلامیہ کی طرف سے جب دوستی اور محبت کے وفود بھیجے جائیں اور ہم یہ بھی چاہیں کہ ان سے کوئی مفید مطلب نتیجہ مترتب ہو تو اس کی یہی ایک صورت ہے کہ ہم سب مل کر وہ طرزِ زندگی اختیار کریں جس کی اسلام نے ہمیں تلقین کی ہے۔ ورنہ یوں دیکھئے کہ انسان کی طبیعت میں اُنس اور وحشت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ وہ آج دشمن ہے تو کل دوست۔ یہی حال قوموں کا ہے ... ان کی دوستی اور دشمنی بھی پائیدار نہیں۔ یہ تو صرف اسلام کا فیض تھا جس نے متمدن دنیا کے ایک بہت بڑے حصے میں قوموں اور نسلوں کی بیگانگی، عداوت اور وحشت کو بڑی حد تک اُنس اور محبت میں بدل دیا اور جس کی بدولت لاکھوں کروڑوں انسانوں کی ایک ایسی برادری وجود میں آئی جس کی روایات یکساں تھیں، مقاصد اور عزائم

یکساں، مگر پھر اس قسم کا اجتماعی شعور جس میں قوموں کا وجود صرف عرفاً قائم رہے اور وہ
اپنی مخصوص صلاحیتوں کے باوجود اپنے آپ کو ایک ہی معاشرے میں ضم کر دیں جب ہی ممکن ہے کہ
اسے کوئی عالمگیر اصولِ حیات سہارا دیتا رہے۔ یونہی اس کی اجتماعی زندگی، علیٰ ہٰذا تہذیبی
وحدت قائم رہ سکتی ہے اور یونہی اس کے افراد میں محبت اور یگانگت کے وہ جذبات پیدا
ہوں گے جو ان سب کو ایک مشترک مطمحِ نظر کے لیے باہم مل کر زندگی بسر کرنے پر آمادہ کریں۔
یہ مطمحِ نظر اس زمانے میں تو بڑی حد تک قائم تھا جب اسلامی تہذیب عروج پر تھی اور مسلمانوں
کا سیاسی اقتدار بھی مسلّم تھا۔ لیکن پھر جب ان میں ضعف و انحطاط کے آثار پیدا ہوئے اور
کچھ اندرونی اور کچھ بیرونی صدمات کے بعد پچھلی دو صدیوں میں یورپ نے اس کا سیاسی
وجود کچل دیا تو اس مطمحِ نظر کی صرف یاد باقی رہ گئی۔ عالمِ اسلام کی مثال گویا اب اس شخص
کی تھی جو کسی بہت بڑی بیماری سے صحت یاب ہو کر ہوش میں آئے اور اپنی گزشتہ
زندگی کو یاد کرتے ہوئے یہ چاہے کہ اس کے گزرے ہوئے ایّام پھر واپس آ جائیں۔ بعینہٖ
مسلمانوں میں یا تو اپنی گزشتہ تاریخ اور تہذیب و تمدّن کے زیرِ اثر جذباتی طور پر یہ تحریک
پیدا ہوتی کہ بلادِ اسلامیہ میں دوستی اور محبت کے روابط قائم ہوں، یا پھر مغرب کا سیاسی
اور معاشی استیلا اور استیلا کے ساتھ ساتھ تہذیبی تفوّق انھیں مجبور کرتا کہ اپنے طرزِ
زندگی کو محفوظ رکھنے کی کوشش کریں۔ لیکن یہ اکثر و بیشتر سیاسی احوال تھے جو انھیں
ایک دوسرے کی طرف کھینچ لاتے اور مقصد یہ ہوتا کہ دوسروں کو اپنا ہم خیال
بنائیں جس سے بہت ممکن ہے بین الاقوامی لحاظ سے انھیں کسی معاملے میں تھوڑی
بہت تائید حاصل ہو جائے۔ اب خالص مذہبی نقطۂ نظر، یا سیاسی اور اجتماعی لحاظ
سے تو اسلامی نظامِ حیات، یا اسلامی تہذیب و تمدّن کا احیا جب ہی ممکن تھا کہ

مسلمان ــــ جو ابتدا میں ایک اُمّت تھے، خیر اُمّۃ اخرجت للناس، لیکن پھر ایک اُمّتِ واحدہ اور اس کے منشا و مقصد کو بھول کر متعدد اُمّتوں میں تقسیم ہو چکے ہیں اور وہ بھی جغرافیائی اور نسلی اعتبار سے تا حتّٰی کہ اُمّت اور مِلّت کے معنی ہی مسخ ہو گئے ــــ اپنی اس کوشش کی بنا اسلام پر رکھتے۔ وہ دیکھتے کہ بحالاتِ موجودہ انھیں اسلام کے پیشِ نظر اپنی زندگی میں کیا تغیّر پیدا کرنا چاہیے۔ علیٰ ھٰذا یہ کہ سیاسی، اجتماعی یا تہذیبی اعتبار سے وہ جن احوال میں گرفتار ہو چکے ہیں ان سے استخلاص کا ذریعہ از روئے اسلام کیا ہے۔ بغیر اس کے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنا کھویا ہوا اتحاد اور کھوئی ہوئی عظمت پھر سے حاصل کر سکیں۔ لیکن مسلمان نہیں سوچتے تھے تو نہیں۔ چنانچہ یہ امر بڑا افسوس ناک ہے کہ باوجود صدقِ نیّت اور ایک دوسرے سے اخلاص و مروّت کے مسلمانوں کی نگاہیں ــــ وہ افراد ہوں یا جماعتیں سیاسی رہنما ہوں، یا مصلحین مذہب ــــ عام طور پر وقتی معاملات یا مقامی حالات پر رہتیں۔ لہٰذا انھوں نے جس مسئلے کو دیکھا ایک پہلو سے دیکھا۔ بالفاظِ دیگر انھوں نے اس صاف و سادہ حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ ان کی زندگی کے جتنے بھی مسائل ہیں ــــ انفرادی یا اجتماعی ــــ کسی ایک یا سارے اسلامی ممالک سے متعلق، ان کو مذہبی کہیے یا غیر مذہبی داخلی یا خارجی ان سب کا تعلق دراصل ایک ہی مسئلے سے ہے، یعنی یہ صرف اسلام کا مسئلہ ہے جس پر انھیں ہر جہت اور ہر زاویے سے نظر ڈالنی چاہیے۔ اس لیے کہ اسلام ہی بیک وقت سب کچھ ہے۔ مذہب بھی اور سیاست بھی۔ ان کی تاریخ ــــ یہ تہذیب و تمدّن کی تاریخ ہو، یا اخلاق اور علم و حکمت کی ــــ اسلام ہی کی تاریخ ہے۔ وہی ان کی ساری زندگی پر حاوی اور وہی ان کے ارتقا اور نشو و نما کا

حائل رہا۔ یہ نقطۂ نظر تھا جس کے ماتحت حضرتِ علامہ نے ارکانِ وفد سے متعدد گفتگوئیں کیں۔ حضرتِ علامہ چاہتے تھے کہ ایک تو ارکانِ وفد اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ مسلمانوں کا مسئلہ کسی ایک قوم کا مسئلہ نہیں بلکہ سارے عالمِ اسلام "یعنی سیاسی اور وقتی معاملات سے ہٹ کر دیکھیے تو ایک پوری تہذیب کا مسئلہ جس کے حل کی یہ صورت نہیں کہ جغرافی اور نسلی اعتبار سے ہم اپنی مخصوص قومی ہستی یا ملک اور وطن کے احوال اور مفاد کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے لیے کوئی الگ تھلگ راستہ نکالیں۔ اس کے حل کی یہ صورت ہے کہ ہم ان سب باتوں کے پیشِ نظر اول یوں سوچیں کہ ہم سب ایک ہیں اور پھر دیکھیں کہ باعتبارِ حالات و مصلحت وقت ہمیں اپنے معاملات میں کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ حضرتِ علامہ نے اس سلسلے میں جہاں بین الاقوامی معاملات کی طرف اشارہ کیا اور اس امر کی طرف بھی کہ ان کے نزدیک بلادِ اسلامیہ کے سیاسی اور اجتماعی احوال کی اصلاح کا مؤثر اور مناسب طریق کیا ہے وہاں اس امر پر بھی زور دیا کہ عالمِ اسلام کی نشأۃ الثانیہ کے لیے اسلامی معارف کا احیا کس قدر ضروری ہے۔ مثلاً اور نہیں تو علمائے ازہر جدید عمرانی مسائل' یا سیاسی معاشی احوال کو دیکھتے ہوئے فقہ اسلامی ہی کی تجدید کا بیڑا اٹھائیں۔ راقم الحروف یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ارکانِ وفد حضرت علامہ کی گفتگوؤں سے کیا اثرات لے کر واپس گئے۔ لیکن بظاہر تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ انھیں حضرتِ علامہ کے ارشادات سے حرف بحرف اتفاق ہے۔ مگر پھر ایک مشکل تھی جس کے حل کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا اور وہ یہ کہ یہ مصر ہو یا کوئی اور اسلامی ملک مسلمانوں کے جس وفد نے بھی اس نیم برِ اعظم میں قدم رکھا اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ 'ہندی' مسلمانوں کو ہندوؤں سے علیحدگی پر کیوں اصرار

ہے۔ ان کا اپنا تجربہ تو یہی تھا کہ بلادِ اسلامیہ میں باوجود اختلافِ مذہب کبھی ایسا نہیں ہُوا کہ مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں کوئی ناگوار سیاسی بحث پیدا ہو۔ لیکن وہ نہیں سمجھتے تھے تو یہ کہ بلادِ اسلامیہ میں غیر مسلمان نہ صرف اقلیت میں ہیں جن کو شروع ہی سے اسلام نے ہر طرح کی مراعات دیں اور ایسی کشادہ دلی اور رواداری کا سلوک کیا کہ صدیاں گزر گئیں مگر ان کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آیا' بلکہ سچ پُوچھیے' تو اسلامی ریاست کی فیاضی اور سرپرستی نے انھیں اور بھی مضبوط کر دیا تھا' علاوہ اس کے ان کی زبان ایک ہے' طور زندگی کا طور و طریق بھی زیادہ مختلف نہیں۔ لیکن ہندوستان میں اس کے برعکس مسلمان گو اقلیت میں تھے ـــ اور اقلیت بھی ایسی کہ دُنیا کی بہت سی قومیں تعداد میں ان سے کم تھیں ـــ ہندوؤں نے اور کسی خیال سے نہ سہی' مُلک کے مفاد اور سُود و بہبود ہی کی خاطر بھی یہ کوشش نہیں کی کہ ان سے مفاہمت اور مصالحت پیدا کریں۔ انھیں مسلمانوں سے ہمیشہ نفرت رہی اور اس لیے انھوں نے اسلامی بالخصوص اسلامی ہند کی تاریخ کو بھی انتقاماً برے ہی غلط رنگ میں پیش کیا۔ حالانکہ ہندوستان اگر ہندوستان بنا تو مسلمانوں کی بدولت۔ حاصلِ کلام یہ کہ یہاں سیاست میں جو دشواری اور تلخی پیدا ہوتی تو ہندوؤں کی تنگ نظری اور تعصب سے پیدا ہوئی جسے بلادِ اسلامیہ سے آنے والے وفود اکثر نظر انداز کر دیتے' بالخصوص اس وقت جب ان کے سامنے کوئی سیاسی غرض ہوتی کیونکہ سیاسی غرضمندی کا تقاضا بہرحال یہ ہوتا کہ اس مُلک کی اکثریت' یعنی ہندوؤں کو اپنا ہم خیال بنایا جائے۔ پھر یہ بات جب ہی ممکن تھی کہ ان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت ان کی ہمنوا ہوتی۔ لہٰذا ان موقعوں پر وہ غلطی سے یہ سمجھتے کہ مسلمانوں نے ہندوؤں سے علیحدگی کی جو روش اختیار کر رکھی ہے غلط ہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا وہ کیا کریں؟

مسلمانوں کا ساتھ دیں اور ہندوؤں سے ہمدردی کی کوئی توقع نہ رکھیں، یا پھر ان کی ہمدردی حاصل کریں اور مسلمانوں کا ساتھ نہ دیں۔ اسلامی طرزِ زندگی یا اسلامی وحدت کا احیا تو ایک امرِ عظیم تھا۔ اس کی کسے ہمت تھی اور ہوتی بھی تو مغرب اور مغرب کے پیدا کردہ سیاسی معاشی احوال نے ان کے گرد و پیش جو دیواریں کھینچ رکھی تھیں ان کو دیکھتے ہوئے قدرتاً یہی خیال ہوتا تھا کہ اوّل اس زندان خانے سے نکلنے کی کوئی تدبیر کرنی چاہیے۔ یہ ہو گا تو اسلامی تہذیب و ثقافت کے احیاء میں جو مسائل درپیش ہیں ان پر بھی غور کر لیا جائے گا۔ مگر پھر جب تک یہ دوسرا مسئلہ حل نہ ہو جاتا وہ پہلا مسئلہ کیسے حل ہو سکتا تھا۔ الّا یہ کہ اس کی کوئی اور بھی غیر اسلامی صورت پیدا کی جاتی۔ چنانچہ یہی مشکلات اور یہی حیص بیص تھا جس میں باوجود صدقِ نیت مسلمانوں کی کوششیں اکثر رائیگاں جاتیں۔

رہا یہ امر کہ ہندوستان کا سیاسی مسئلہ فی الحقیقت کیا ہے وہ اس پر بہت کم توجہ کرتے۔ لہٰذا انہیں سمجھانا پڑتا کہ مسلمانوں کا اس ملک میں اپنا ایک جداگانہ تشخص کیوں ضروری ہے اور وہ کیوں مجبور ہیں کہ آزادی کی جدوجہد میں اپنے لیے ایک ایسا راستہ تجویز کریں جس کی انتہا بحیثیت ایک قوم ان کے سیاسی استقلال اور خود اختیاری پر ہو۔ چنانچہ حضرتِ علامہ نے ارکانِ وفد پر جہاں ملکی سیاست کی یہ نزاکتیں بخوبی واضح کر دیں وہاں اس امر پر بھی زور دیا کہ مسلمانوں کو خواہ وہ کہیں بھی ہوں اپنی سیاست اور قومی ترقی کی عمارت اسلام کی بنیادوں پر اٹھانی چاہیے۔ پھر جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں اس سلسلے میں فقہِ اسلامی کی از سرِ نو تشکیل اور اسلام کے نقطۂ نظر سے ایک خالصاً عمرانی تفکر کی ضرورت پر بھی بالخصوص زور دیا۔

لنچ بڑا بے لطف رہا، کچھ تو اس لیے کہ ظہر کا وقت تھا اور طبیعتیں آرام کی

طرف مائل۔ کچھ اس لیے کہ حضرتِ علامہ کی صحت ان دنوں بہت گر گئی تھی۔ چنانچہ وُہ اس زمانے میں بڑے نحیف اور کمزور نظر آتے تھے۔ پھر زبان کی ناواقفیت نے بھی شرکائے دعوت کو موقعہ نہ دیا کہ مہمانوں سے کُھل کر گفتگو کرتے۔ اس پر طرّہ یہ ہُوا کہ اہلِ ہوٹل نے حضرتِ علامہ کی نشست سے کوئی دس قدم دُور مگر ان کے عین مقابل ایک پرانی وضع کا بڑا سا گراموفون لاکر اس طرح رکھ دیا کہ اس کے بھونپو کا رُخ سیدھا اُن کی طرف رہے اور پھر ریکارڈ بھی لگایا تو یہ:

یا دِل سے باز آجا یا دل نواز ہو جا

جس سے محفل میں بڑے زور کا قہقہہ پڑا اور یہ صحبت برخاست ہو گئی۔

محفل برخاست ہوئی تو شرکائے دعوت تھوڑی دیر اور ٹھہر گئے مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس اجتماع کا نقشہ بھی تقریباً وہی رہا جو دعوتوں یا صحیح معنوں میں یہ کہنا چاہیئے ڈنر اور لنچ پارٹیوں کا بالعموم ہُوا کرتا ہے یعنی گپ شپ زیادہ اور کام کی بات کم۔ یوں لنچ سے پہلے شرکائے دعوت کا مہمانوں سے تعارف بھی ہُوا اور بعد میں تقریریں بھی کی گئیں۔ حضرتِ علامہ کی طرف سے وفد کی آمد پر اظہارِ مسرت ہُوا اور وفد کی جانب سے اسلامیانِ ہند کی میزبانی پر اظہارِ تشکّر کیا گیا جس کے ساتھ ساتھ وفد نے یقین دلایا کہ اہلِ مصر اپنے دینی بھائیوں سے رابطۂ اتحاد استوار کرنے کے لیے ہر طرح سے تیار ہیں مگر پھر جیسا کہ مَیں نے عرض کیا ہے یہ شاید زبان سے ناواقفیت کا نتیجہ تھا یا شاید کھانے پینے کی دعوتوں میں ہوتا ہی یہ ہے کہ دعوتِ طعام کو دعوتِ فکر کا رنگ نہیں دیا جاتا۔ اس امر پر مطلق گفتگو نہ ہو

سنی کہ ارکانِ وفد کا سفر ہندوستان کیسا رہا؟ اُنہوں نے اس مُلک اُور اس کے مذہبی اور اجتماعی احوال کے بارے میں کیا رائے قائم کی۔ حضرت علامہ تو خیر اپنی علالت اُور حبسِ صوت کے باعث مجبور تھے کہ ارکانِ وفد سے اس طرح گفتگو کرتے کہ شرکائے دعوت بھی اس میں شریک ہوتے۔ لیکن شرکائے دعوت بھی زیادہ تر آپس ہی میں باتیں کرتے رہے حتیٰ کہ بعض حضرات کو شاید پُورے طَور پر یہ بھی معلُوم نہیں ہو سکا کہ وفد کی حیثیت کیا ہے اور اس کی آمد کا مقصد کیا۔ مگر اس کی جو بھی وجہ تھی۔ یہی حضرتِ علامہ کی علالت۔ حضرتِ علامہ چُونکہ خاموش تھے اس لیے محفل پر بھی ایک طرح سے خاموشی چھائی رہی۔

دُوسرا مکتوب حضرتِ علامہ کے خطبات سے متعلق تھا۔

Lahore

31st Jan. 1937,

Dear Niazi,

Please send me M. Jafri's who you told me published an article on the philosophy of Islam and which somebody send to you from Vellore.

Yours.

Muhammad Iqbal

کاتب دیلور کا اِشارہ سید بشیر الدین صاحب کی طرف ہے۔ رسالۂ اردو کے اقبال نمبر میں ان کا مضمون شائع ہو چکا ہے۔

مضمون اور خط سیّد صاحب ہی نے بھیجا تھا۔ انھیں حضرتِ علّامہ سے بڑی عقیدت تھی۔ مجھ سے اکثر ان کے ارشادات کے بارے میں استفسار کرتے رہتے۔ معلوم نہیں وُہ اب کہاں ہیں۔

ان کا کہنا یہ تھا کہ مضمون سرتاسر خطبات سے ماخوذ ہے۔

○

# خاتمۂ سخن

قرآنِ شریف کے نوٹ

اجتماعِ پانی پت

طلوعِ اسلام

زمین پیوستگی اور غیبتِ کبریٰ

تاریخِ مزارِ سلطان الہند

علمائے مصر

طباعتِ کلام اور ترجمۂ خطبات

علالت، علاج اور ——

مکتوباتِ اقبال کی ترتیب اور تسوید کا مرحلہ طے ہُوا تو واقعات نے دفعۃً کروٹ لی، حتیٰ کہ اس مجموعے کی نظرِ ثانی اور تبیض کی نوبت آئی تو صورتِ حالات یہ تھی کہ راقم الحروف کچھ تو آئے دن کی پریشانیوں اور کچھ مسلسل ایاب و ذہاب کے باعث یہ سارا کام خود سر انجام دے سکا نہ خاطر خواہ طور پر اس کی نگرانی ہو سکی۔ اس آڑے وقت میں احباب نے دستِ اعانت بڑھایا جن کا مجھے منکسر شکریہ ادا کرنا ہے۔ چنانچہ مسودے کی نظرِ ثانی تو ڈاکٹر برہان احمد صاحب فاروقی نے کی

اور تبیض و تصحیح میں گھر کے افراد حتیٰ کہ بچوں تک نے حصہ لیا۔ تبیض و تصحیح ہو چکی اور وہ بھی زیادہ تر میرے بڑے بھائی سید اقبال حسین صاحب کی شبانہ روز محنت سے تو کتابت و طباعت کا اہتمام ہونے لگا۔ لیکن میں اس موقعہ پر جب بڑی یکسوئی اور دل جمعی کی ضرورت تھی بھائی جان یک بیک بیمار ہو گئے اور اس طرح کہ پھر صحت یاب نہ ہو سکے۔ یہ ایک اور پریشانی اور ایک اور صدمہ تھا جس میں بمشکل ہی کوئی کام سکونِ قلب یا جیسا کہ ہونا چاہیے اطمینان و اعتماد سے سرانجام دیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا مکتوبات کی نظرِ ثانی خاطر خواہ طریق پر نہ ہو سکی نہ ان کی کتابت اور کتابت کی نگرانی کے لیے جس دل جمعی اور فراغت کی ضرورت تھی میسر آئی۔ یہی وجہ ہے کہ کتابت کی تکمیل ہوئی اور کاپیاں دیکھنے کا وقت آیا تو راقم الحروف نے محسوس کیا کہ باوجود کوشش کے کئی ایک باتیں اُدھوری رہ گئی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی وضاحت پورے طور پر نہیں ہو سکی۔ ان باتوں کو اب فرداً فرداً بیان کرنا تو ممکن نہیں، البتہ بعض ایسے مباحث کی تفصیل جن کو تشنہ چھوڑ دینا شاید مناسب نہ ہوگا ضروری ہے۔

## قرآنِ شریف کے نوٹ

۱۹۳۵ میں جب اعلیٰحضرت نواب صاحب بھوپال نے حضرتِ علامہ کی لائف پنشن مقرر کر دی اور حضرتِ علامہ نے راقم الحروف کو اس کی اطلاع کی تو اس کے ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا "اب اگر صحت اچھی رہی تو بقیہ ایام قرآنِ شریف کے نوٹ لکھنے پر صرف کروں گا۔" یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ

قرآنِ مجید کے ان تفصیلی حواشی کی تکمیل جب ہی ممکن تھی جب حضرتِ علامہ کو صحت ہو جاتی ۔ مگر اس کے باوجود لوگ دریافت کرتے ہیں کہ اس قسم کے کچھ حواشی کیا پہلے سے لکھے ہوئے موجود تھے، یا ان کا کچھ حصہ بعد میں لکھا گیا، یا اور نہیں تو یہ کہ اگر یہ حاشیے لکھے جاتے تو ان کی نوعیت کیا ہوتی ؟ کیا حضرتِ علامہ اپنے ذہن میں مطالبِ قرآنی کا کوئی خاص نقشہ قائم کر چکے تھے ؟ ان کے خیالات اس سلسلے میں کیا تھے ؟ یہ سوالات نہایت ضروری ہیں اور قوم کا ذوقِ تجسس بجا طور پر اس امر کا مقتضی ہے کہ ان کا کوئی ٹھیک ٹھیک جواب مل سکے، بالخصوص اس لیے کہ ناقدین کی رائے کچھ بھی ہو حضرتِ علامہ کا اپنا ارشاد تو یہی تھا کہ اُن کے افکار کا سرچشمہ قرآنِ پاک اور اسوۂ حضورِ رسالتمآب صلعم کے سوا اور کچھ نہیں ۔ یہ اُسی ذاتِ گرامیؐ سے جس پر قرآنِ مجید نازل ہوا والہانہ عشق و محبت کا تعلق تھا جس کی بدولت کتاب ۔۔ کتاب اللہ ۔۔ کی حکمت ان پر عیاں ہوئی ۔ پس چہ باید کرد کے یہ اشعار کس کی نظر سے نہیں گزرے :-

در جہانِ ذکر و فکرِ انس و جاں
تو صلوٰۃِ صبح تو بانگِ اذاں !
ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی
قطرہ و دریا و طوفانم توئی
گردِ تو گردد حریمِ کائنات
از تو خواہم یک نگاہِ التفات

قرآنِ پاک سے حضرتِ علامہ کو جو عشق تھا اور اس کا مطالعہ انھوں نے جس محنت اور کاوش سے کیا تھا وہ کوئی ایسی بات نہیں جس سے لوگ ناواقف ہوں۔ ان کی طالب علمی اور ابتدائی زمانے کے دوست بھی اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ بڑے سحر خیز تھے۔ فجر کی نماز اوّل وقت میں ادا کرتے اور پھر قرآنِ مجید کی تلاوت بڑے ذوق و شوق سے فرماتے۔ اپنی آخری علالت میں جب ان کی آواز بیٹھ گئی اور کچھ گلے کی تکلیف اور کچھ حبسِ دم کے باعث تلاوتِ قرآن کا سلسلہ چھوٹ گیا تو انھوں نے کس حسرت سے کہا:۔

در نفس سوزِ جگر باقی نماند
لطفِ قرآنِ سحر باقی نماند

علی بخش ان کے مدت العمر کے ملازم کا بھی جو ہمیشہ ان کے ساتھ سایہ کی طرح لگا رہا یہی بیان ہے کہ فجر کی نماز کے لیے اسے وضو اور جائے نماز کا اہتمام سونے سے پہلے ہی کرنا ہوتا تھا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ تعلیماتِ قرآنی کے بارے میں ان کا ایک خاص نقطۂ نظر تھا جس کی اپنے اشعار اور خطبات میں انھوں نے وضاحت بھی کی لیکن جہاں تک ان تفسیری حاشیوں کا تعلق ہے وہ کبھی سپردِ قلم نہیں کیے ہوئے اور اس کی وجہ ظاہر ہے یعنی علالت۔ البتہ اس سلسلے میں ان کی دو ایک تحریریں ضرور دستیاب ہوئیں اور وہ شاید اب اقبال اکیڈمی کے پاس محفوظ ہیں۔ ایک تحریر میں توحیدِ اسلامی کی بحث میں بعض قرآنی مصطلحات مذکور ہیں۔ دوسری تحریر صرف چند ایک قرآنی مصطلحات پر مشتمل ہے۔ لیکن

ان ذوقلن تحریروں کی حیثیت حواشی کی نہیں۔ حضرتِ علامہ نے ان تحریروں میں کوئی جملہ بھی رقم نہیں فرمایا۔ صرف چند الفاظ مستفسرانہ انداز میں لکھے ہیں جس سے کچھ مترشح ہوتا ہے تو یہی کہ اُنھوں نے اپنی یادداشت کے لیے چند ایک باتیں بطور اشارات لکھ لیں تھی۔ رہا یہ امر کہ وُہ ان باتوں کی تشریح اور تفصیل کس انداز میں اور کس نہج پر کرتے اس کا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے۔ اِلّا یہ کہ ان کی روزمرہ گفتگوؤں یا ان اِرشادات سے جو وقتاً فوقتاً انھوں نے اس سلسلے میں فرمائے سامعین کو ان کے خیالات کا شاید ایک حد تک اندازہ ہو سکے۔ یہ اس لیے کہ قرآن اور رسالت یہ دو موضوع ایسے ہیں کہ کوئی بھی مسئلہ' یا کوئی بھی بحث ہو اس کا خاتمہ اسی پر ہوتا تھا کہ قرآن پاک کا اِرشاد اس سلسلے میں کیا ہے یا یہ کہ حضورِ رسالتمآب صلعم نے اس بارے میں کیا طرزِ عمل اختیار کیا۔ بسا اوقات وُہ یہ بھی فرماتے کہ قرآنِ مجید کا مطالعہ کس نہج پر کرنا چاہیے اور پھر باتوں باتوں میں تعلیماتِ قرآنی کی طرف بڑے لطیف اشارات کر جاتے۔ مختصراً یہ کہ ان کے ذہن میں تعلیماتِ قرآنی کو ایک باقاعدہ شکل میں پیش کرنے کا تصور تو ضرور تھا، لیکن بہ سببِ علالت وُہ اپنا یہ اِرادہ پُورا نہ کر سکے۔ جس کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔ چنانچہ راقم الحروف نے اکثر محسوس کیا کہ ان کے پیشِ نظر شاید یہی ایک مسئلہ ہے جس پر وُہ انتہائی تجسس اور تحقیق سے قلم اُٹھانا چاہتے ہیں۔ رسالۂ اردو کے اقبال نمبر میں میں اپنے مضمون اقبال کی آخری علالت میں اس امر کی طرف اشارہ بھی کر چکا ہُوں کہ اُن کا ذہن کس طرح ہر وقت اسی فکر میں اُلجھا رہتا تھا۔

## اجتماعِ پانی پت[۱]

اکتوبر ۱۹۳۵ء میں جب خواجہ حالی مرحوم و مغفور کی صد سالہ برسی منائی گئی تو میں پانی پت اس وقت پہنچا جب منتظمینِ جلسہ اعلیٰحضرت نواب صاحب بھوپال کے خیر مقدم کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ حضرت علامہ بھی نواب صاحب کی تشریف آوری سے ایک روز پہلے تشریف لے آئے تھے اور پھر جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں انھوں نے پانی پت آتے ہی حضرت شاہ بو علی قلندر کے مزار کی زیارت کی اور بعض دوسرے مقامات بھی دیکھے۔ اگلے روز والیِ بھوپال تشریف لائے اور جلسہ منعقد ہوا تو اس میں حضرتِ علامہ نے بھی شرکت فرمائی۔ یہ جلسہ بڑا پُر رونق تھا۔ پھر جب منتظمین کی طرف سے یہ اعلان ہوا کہ مولینا حالی کی اس صد سالہ برسی کا یہ اجتماع تین دن تک جاری رہے گا اور اس کا ایک ایک اجلاس ہر روز صبح و شام منعقد ہوا کرے گا تو لوگ یہ سمجھے کہ حضرتِ علامہ بھی ان میں شرکت فرمائیں گے۔ اس غلط فہمی سے قدر دانانِ اقبال کو جو پریشانی ہوئی اس کی کیفیت صاحبِ نوائے فسردا حضرت ایوب[۱] کی زبان سے سنیے۔ وہ اپنے ایک مکرمت نامے میں لکھتے ہیں :۔

"... ۱۹۳۵ء میں جب کہ اس برسی کا انعقاد ہوا، میں بسلسلۂ ملازمت دہلی میں مقیم تھا۔ برسی کے اجلاس تین دن تک ہونا تھے اور ہر روز صبح بعد

۱۔ نائب مشیرِ مالیات (مراسلات) حکومتِ پاکستان، کراچی۔

شام کے وقت الگ الگ نشستوں کا اہتمام تھا۔ ایک مجبوری کے باعث میں
پہلے دن کے صبح کے اجلاس میں شریک نہ ہو سکا۔ میری گاڑی پانی پت میں
بعد دوپہر پہنچی جبکہ پہلی نشست ختم ہو چکی تھی۔ پانی پت پہنچنے پر معلوم ہوا
کہ اس نشست میں جس کی صدارت نواب حمید اللہ خان صاحب عالیِ
بھوپال نے کی تھی، علامہ اقبال بہ نفسِ نفیس موجود تھے۔ چونکہ اُن کے
گلے کی تکلیف بدستور قائم تھی اس لیے وہ اشعار جو انھوں نے حالی کی
برسی کے سلسلے میں کہے تھے کسی دوسرے صاحب نے اُن کی جانب سے
پڑھ دیے تھے۔ جب شام کے وقت پہلے دن کی دوسری نشست منعقد
ہوئی تو اہلِ مجلس کی نظریں پوری بے تابی کے ساتھ ڈائس کی جانب لگی ہوئی
تھیں کہ علامہ کب تشریف لاتے ہیں۔ جب پنڈال پُر ہو گیا اور جلسہ کی
کارروائی کی ابتدا کا وقت آیا تو ڈائس سے یہ اعلان ہوا کہ علامہ اقبال کی
طبیعت قدرے ناساز ہے اس لیے وہ اس اجلاس میں تشریف نہیں لا
سکے لیکن وہ کل صبح کے جلسہ میں ضرور تشریف آور ہوں گے۔ اس
اعلان نے بے تابیِ شوق کو تلخیِ انتظار کی دعوت دی۔ دوسرے دن صبح کے
اجلاس میں کشتگانِ انتظار کی نظریں پوری تیزی کے ساتھ پھر ڈائس کی طرف
میں منہمک تھیں۔ اُمید کو یہ سہارا تھا کہ کل کا وعدہ غلط نہیں ہو سکتا۔
لیکن آج بھی ہزارہا تمناؤں کا خون ہوا جب مسند کی جانب سے یہ آواز
آئی کہ علامہ اقبال ایک ضروری کام کے سلسلہ میں دہلی گئے ہیں، دوپہر تک
واپس تشریف لے آئیں گے اور شام کے اجلاس میں شرکت فرمائیں گے۔

شوق کہ اگرچہ خود فریبی کا شکار ہونے سے کبھی باک نہیں ہوتا تاہم آرزو مند دلوں کو محسوس ہوا کہ یہ سب اعلانات محض محفل کی رونق افزائی کے وسیلے یا حیلے ہیں، اقبال تو غالباً اب کسی نشست میں شریک ہونے والے نہیں۔ اس احساس کی رہنمائی میں میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب پانی پت میں رُکنا بے سُود ہے اور مناسب یہ ہے کہ بعد دوپہر کی گاڑی سے دلی واپس جایا جائے۔ میرے چند احباب نے جو دلی سے میرے ساتھ آئے تھے۔ میری رائے سے اتفاق کیا اور ہم گاڑی کی آمد سے کوئی بیس منٹ پہلے پانی پت ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ گاڑی کے انتظار میں ویٹنگ روم میں جو داخل ہوئے تو ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب ہم نے یہ دیکھا کہ علامہ اقبال وہاں پر تشریف فرما ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک گاڑی دلی کی جانب سے آنے والی تھی جس میں علامہ لاہور کا سفر اختیار کرنے والے تھے۔ علامہ موصوف کو دیکھنے کا عمر بھر میں میرا یہ پہلا اور آخری موقع تھا۔ جب میری نظر اُن پر پڑی تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے انسانی عظمت کا کوئی ہمالہ میرے سامنے آگیا ہو۔ اس وقت میری عمر کوئی ۲۴ برس کی تھی۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے علامہ سے مصافحہ کیا اور کوئی ڈیڑھ گز کے فاصلے پر ایک بنچ پر دم بخود بیٹھ گیا۔ کمرے میں چند نفوس اور بھی تھے۔ ایک صاحب نے جو غالباً ریلوے کے محکمہ میں ملازم تھے جرأت کر کے سلسلۂ گفتگو کا آغاز کیا۔ "ہم نے سنا تھا کہ جناب ڈاکٹر انصاری سے ملاقات کی غرض سے دلی تشریف لے گئے ہیں۔ آپ کے دلی تشریف لے جانے کا

اعلان تو آج صبح کے جلسہ میں بھی ہوا تھا"۔ اس سوال کے جواب میں علامہ نے اپنی میٹھی ہوئی مگر جلال آگیں آواز میں فرمایا "فقیر کا وائسرائے سے کیا کام"۔ اس کے بعد ایک صاحب نے علامہ کو ایک کاغذ پر لکھے ہوئے اُن کے چند شعر دکھائے جو اُن کی جانب سے برسی کے اوّلیں اجلاس میں پڑھے گئے تھے اور عرض کیا کہ یہ اشعار مَیں نے جلسہ میں سُن کر لکھے تھے۔ آپ انھیں ملاحظہ فرما کر یہ فرمائیں کہ مَیں نے لکھنے میں تو کوئی غلطی نہیں کی۔ علامہ نے سیّد نذیر نیازی کی جانب جو ایک گوشہ میں کُرسی پر بیٹھے ہاتھ میں تھامے ہوئے چند کاغذات کی طرف گھور رہے تھے، اشارہ کیا اور فرمایا کہ نیازی صاحب کو دکھا دیجیے۔ ادھر نیازی صاحب نے ان اشعار کی صحت پر صاد کیا اور اُدھر لاہور جانے والی گاڑی پلیٹ فارم پر آ پہنچی۔ علامہ وہاں سے اُٹھے اور آ کر گاڑی میں تشریف فرما ہوئے۔ چند منٹ بعد گاڑی جا چکی تھی لیکن اس اتفاقی ملاقات کے ناقابلِ فراموش تاثرات و تصوّرات اپنی جگہ پر قائم تھے۔

علامہ مرحوم کے وہ چند اشعار جنھیں مَیں نے بھی بعد میں لکھ لیا تھا یہ ہیں:-

مزاجِ ناقہ را مانند عرفی نیک می دانم
چو محمل را گراں بینم حدی را تیز تر کردم
حمید اللہ خاں اے ملک و ملت را فروغ از تو
ز الطاف تو موج لالہ خیزد از خیابانم

طوافِ مرقدِ حالی سزد ارباب معنی را
نوائے او بجانہا افگند شورے کہ من دانم
بیا تا فقر و شاہی در حضورِ او بہم سازند
تو بر خاکش گہر افشاں و من برگِ گل افشانم

جیسا کہ سب کو معلوم ہے صد سالہ برسی کی تقریب حالی مسلم ہائی اسکول میں منائی گئی تھی اور حضرتِ علامہ کے قیام کا انتظام بھی اسی مدرسے کی ایک عمارت میں کیا گیا تھا۔ صاحب نوائے فردا کا یہ کہنا ٹھیک ہے کہ شام کے اجلاس میں قدردانِ اقبال کی نگاہیں انھیں ڈھونڈتی رہیں۔ لیکن ہُوا یہ کہ والیِ بھوپال واپس تشریف لے گئے تو حضرتِ علامہ بھی جو ان دنوں خلافِ اُمید بہت زیادہ نقاہت اور ضُعف محسوس کرتے تھے جلسہ گاہ سے اُٹھ آئے۔ اُنھیں اس وقت بے حد آرام کی ضرورت تھی۔ چنانچہ حضرتِ علامہ نے اوّل تو کچھ آرام فرمایا پھر کھانا کھایا، علی بخش حُقّہ بھر کرلے آیا۔ چودھری صاحب مرحُوم، ماجد صاحب اور راقم الحروف خدمت کے لیے حاضر تھے۔ مجُھ سے حکیم صاحب قبلہ کے بارے میں استفسار فرمایا۔ اپنے خلل اور دوا و پرہیز کا ذکر کرنے لگے۔ میں حکیم صاحب قبلہ سے مل کر سب حالات عرض کر چکا تھا۔ دوائیں بھی اپنے ساتھ لایا تھا۔ دوا اور پرہیز کے بارے میں ان کا اطمینان ہُوا تو حسبِ معمُول کچھ نیند لی۔ پھر باتیں ہونے لگیں۔ سہ پہر میں دارالاقامے کے میدان میں نشست رہی۔ چائے کا اہتمام ہُوا۔ موسم بڑا خُوش گوار تھا، شام کو میدان سے اُٹھ کر پھر کمرے میں تشریف لے آئے۔ اس دوران میں بھی جو حضرات ملنے کے لیے آئے ان کی باتوں کا اپنی دھیمی اور کمزور آواز میں جواب دیتے رہے یا اس

اثنا میں ایک دلچسپ واقعہ یہ پیش آیا کہ ایک صاحب بار بار آتے اور ہم لوگ جہاں بیٹھے تھے وہیں پاس ہی کچھ کاغذ اور پمفلٹ پھینک دیتے۔ یہ صاحب شلوار کوٹ پہنے تھے خشخشی سی داڑھی تھی۔ سر پر چھوٹی سی پگڑی۔ ان کے انداز سے صاف معلوم ہوتا تھا کسی تبلیغی جماعت کے کارکن ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ جو پھر مسکراتے ہوئے نمودار ہوئے تو کسی نے کہا یہ آپ کیا پھینک رہے ہیں ـــــ ان کا بعجلت پمفلٹوں کو تپائیوں پر رکھنا اور اُلٹے پاؤں بھاگ جانا "پھینکنے" ہی کے مترادف تھا ـــــ کہنے لگے یہ ہماری جماعت کا لٹریچر ہے۔ حضرتِ علّامہ نے فرمایا یہ کون صاحب ہیں؟ کیا کہہ رہے ہیں؟ ہم نے عرض کیا مبلّغ ہیں۔ فرمایا یہ تو بڑی اچھی بات ہے اور پھر ارشاد ہوا ان سے کہیے ہم سے اتنے خائف کیوں ہیں۔ بار بار تکلیف فرماتے ہیں۔ کیوں نہ ہم سے بیٹھ کر بات کریں۔ ہمیں سمجھائیں۔ ہم ان سے کچھ سیکھیں۔ لیکن ہمارا ان سے یہ کہنا تھا کہ وہ مسکرائے اور پھر اسی تیزی سے جس سے اس مرتبہ انھوں نے جھلک دکھائی تھی غائب ہو گئے۔

شام کے اجلاس میں حضرتِ علّامہ کی شرکت ناممکن تھی۔ سفر کی کلفت سے ان کا ضعف و اضمحلال بہت کافی بڑھ گیا تھا بلکہ تشویش تھی کہ انھیں کوئی تکلیف نہ ہو جائے۔

## طلوعِ اسلام

طلوعِ اسلام کے سلسلے میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اس رسالے کا بجز اشتراکِ اسمی اس رسالے سے کوئی تعلق نہیں جو تقسیم (ہند) سے پہلے دہلی اور

بعد از تقسیم کراچی سے جناب پرویز صاحب کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں طلوعِ اسلام کا نام حضرتِ علامہ کی نظم طلوعِ اسلام کے عنوان پر تجویز کیا گیا تھا۔ اس کا پہلا پرچہ اکتوبر ۱۹۳۵ میں دہلی سے شائع ہوا اور اس کے بعد دو اور ۱۹۳۶ میں ـــ وہ بھی دہلی ہی سے ـــ باقی تین پرچے لاہور سے شائع ہوئے مگر کئی کئی مہینوں کے وقفے کے بعد لہٰذا ناچار اسے ہمیشہ کے لیے بند کر دینا پڑا جس کا حضرتِ علامہ کو بھی بڑا افسوس تھا۔

بہرحال طلوعِ اسلام بند ہو گیا لیکن ۱۹۳۷ کے اختتام سے کچھ پہلے لاہور اور دہلی کے بعض احباب کی طرف سے یہ تحریک اُٹھی کہ طلوعِ اسلام کا پھر سے احیا کیا جائے اور اس کی زمامِ ادارت بھی راقم الحروف ہی کے ہاتھ میں رہے۔ اس لیے کہ راقم الحروف ہی نے اس کی بنیاد رکھی تھی۔ لیکن شرط یہ تھی کہ رسالہ چونکہ ایک مجلس کی ملکیت ہے لہٰذا میرا کام صرف یہ ہوگا کہ مجلس کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کروں۔ راقم الحروف کو یہ تجویز پسند نہیں آئی لہٰذا اسے بافسوس اپنی معذوری کا اظہار کرنا پڑا۔ میں اپنے نقطۂ نظر کی ترجمانی تو کر سکتا تھا دوسروں کے نقطۂ نظر کی ترجمانی بڑی مشکل بلکہ ناممکن سی بات ہے۔ اِلّا یہ کہ ہم اپنی شخصیت اور انفرادیت کو بالکل نظر انداز کر دیں۔ یُوں بھی اس مجلس کو اگرچہ مولانا اسلم ایسے بزرگوں کا تعاون حاصل تھا بایں ہمہ اس کا ذہن اس معاملے میں صاف نہیں تھا کہ اگر کسی خالص اسلامی فکر کی تجدید ہمارا نصب العین ہے تو پھر ان مسائل کو جن کی حیثیت اصولی ہے ان مسائل سے جن کو فروعی کہا جاتا ہے کیسے الگ رکھا جائے۔ ہم ان میں تفریق کریں گے تو کیسے؟ بعینہٖ وہ کیا مسائل ہیں جن سے نزاع و جدال کا دروازہ

کھلتا ہے اور جن کو اس لیے چھیڑنا غیر مناسب ہوگا۔ مثلاً طلوعِ اسلام کی پہلی اشاعت ہی میں راقم الحروف نے ایک پارلیمنٹری بورڈ کی حمایت میں قلم اٹھایا تو بعض حضرات کو اس پر اعتراض ہوا کہ راقم الحروف قائدِ اعظم کے خیالات کی تائید کر رہا ہے حالانکہ بعض لوگوں کو قائدِ اعظم کی سیاسی روش سے اختلاف ہے۔ لہٰذا اس قسم کے مضامین رسالے میں شائع نہیں ہونا چاہئے نہ آئندہ ہوں گے۔ میرے لیے یہ امر ناقابلِ برداشت تھا اس لیے کہ یہ قائدِ اعظم ہی کی سیاسی روش تھی جس سے راقم الحروف کو آزادیٔ وطن کی جدوجہد میں مسلمانوں کا مستقبل اور سود و بہبود وابستہ نظر آتا تھا۔ پھر حضرتِ علامہ کی رائے بھی یہی تھی کہ مسلمانوں کو قائدِ اعظم کی قیادت قبول کر لینی چاہیے۔ ایسے ہی بعض تہذیبی اور تاریخی مسائل کے بارے میں بھی جن کی حیثیت راقم الحروف کے نزدیک اصولی تھی اختلافِ رائے کا اظہار کیا گیا۔ حاصلِ کلام یہ کہ طلوعِ اسلام کی مکرر اشاعت کا جو خیال از سرِ نو پیدا ہوا تھا پورا نہ ہو سکا۔

البتہ ۱۹۴۸ کی ابتدا میں جب پرویز صاحب یومِ اقبال کی تقریب میں شرکت کے لیے لاہور تشریف لائے تو انھوں نے مجھ سے اپنا یہ ارادہ ظاہر کیا کہ اگر وہ اسی نام کا ایک رسالہ دہلی سے شائع کریں تو مجھے اس پر کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔ انھوں نے کہا دہلی کا صوبہ چونکہ صوبہ پنجاب سے الگ ہے اور طلوعِ اسلام پنجاب منتقل ہو چکا ہے لہٰذا انھیں حق ہے کہ وہ اسی نام کا رسالہ دہلی سے نکال سکیں۔ اس پر میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ یہ ان کی بڑی عنایت ہے جو انھوں نے ایک قانونی حق کے بارے میں مجھ سے دوستانہ سوال

کیا۔ میں نے جس رسالے کی طرح ڈالی تھی اس کے احیا کا اب کوئی موقع نہیں۔ وہ شوق سے طلوعِ اسلام کا ڈیکلریشن لیں۔ لوگ بہت جلد اس اشتراکِ اسمی کو بھول جائیں گے۔ یوں طلوعِ اسلام کے نام سے پھر ایک نیا رسالہ دہلی سے نکلا۔ اسے طلوعِ اسلام کا دورِ ثانی کہنا غلط ہوگا۔ یہ ایک جداگانہ اور نیا طلوعِ اسلام تھا، حضرتِ پرویز اور ان کی جماعت کے خیالات کا حامل۔

میں سمجھتا ہوں طلوعِ اسلام کے متعلق یہ وضاحت نہایت ضروری تھی، گو عام طور پر لوگ اب اس بات کو بھول چکے ہیں کہ اس نام کا کوئی رسالہ اس سے پہلے بھی شائع ہو چکا ہے۔

## زمین پیوستگی

راقم الحروف نے اپرانٹ یا کانفرنس کے سلسلے میں ایک اصطلاح "زمین پیوستگی" استعمال کی ہے جو انگریزی ترکیب earth-rootedness کا ترجمہ ہے اور جسے حضرتِ علامہ نے اپنے خطبات میں یہ ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا ہے کہ جس قومیت ـــ یا سیاسی اجتماع ـــ کی بنا وطن اور نسل پر ہوگی اس کی دنیا لازماً اس سرزمین تک محدود رہے گی جس میں وہ قوم یا وہ نسل آباد ہے یعنی جسے ہم اپنا مرزوبوم گردانتے ہیں لہٰذا ناممکن ہے ہم اس مخصوص خطۂ ارض کی گرفت سے آزاد ہو سکیں۔ بالفاظِ دیگر ہماری اطاعت اور ہماری وفاداری کی مثال ویسی ہوگی جو کسی پودے یا درخت کی ہوتی ہے کہ جب تک کسی زمین میں گڑا ہے اس کی ہستی قائم ہے، یا یوں کہیے کہ وہ اپنی ہستی قائم رکھ سکتا ہے تو جب ہی کہ اس زمین

میں گزرا ہے۔ اب ایک طرف تو یہ مسلم ہے کہ اسلام کی دعوت عالمگیر ہے اور دوسری جانب کون انکار کریگا۔ کہ یہ تہذیب و تمدن ہو یا علم و حکمت، یا انسانیت کا حقیقی جوہر وہ کسی جغرافی، یا نسلی حد بندی کو تسلیم نہیں کرتا۔ ہمارے سامنے دو ہی صورتیں ہیں، انسان یا زمین۔ انسان کی خوبی اس میں ہے کہ زمین کی گرفت سے آزاد ہو اور اپنا مرتبہ و مقام پہچانے۔ یہی اصلِ تہذیب ہے اور اسی پر فرد اور معاشرے کی ترقی کا دارومدار۔ حضرتِ علامہ کا اپنا ارشاد ہے :

آدمیت احترامِ آدمی

باخبر شو از مقامِ آدمی

لہذا انھیں زمین پیوستگی" سے بڑی نفرت تھی۔ وہ یہ تو ضرور چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے ملک اور وطن کی اصلاح کریں۔ اس کے لیے آزادی اور ہر طرح کے سیاسی معاشی استخلاص کے طالب ہوں۔ لیکن اس جدّوجہد کی بنا عالمگیر اخلاقی اصولوں پر رکھیں —— یوں بھی عالمگیر اخلاقی اصول ہی اس جدّوجہد کی اساس ہیں۔ یہی علم و حکمت کا فتوٰی ہے اور یہی تاریخ کا فیصلہ —— یہ نہیں کہ ان کا مفاد اور مصارف مقامی اور وقتی نوعیت اختیار کرلے۔ یہ جو یونینسٹ پارٹی سے ان کو اختلاف تھا تو اسی بنا پر کہ اس کی نگاہیں بڑی محدود ہیں اور وہ زراعت پیشہ اور غیر زراعت پیشہ کی تفریق سے مسلمانوں کا اتحاد پارہ پارہ کر رہی ہے حالانکہ پنجاب اسلامی اکثریت کا صوبہ تھا اور قومی، یا ارضی، نقطۂ نظر سے بھی اس کے سیاسی مفاد کا تقاضا تھا کہ مسلمان باہم متحد رہیں۔ بہرحال یہ وطنیت ہو، یا نسلیت،

انھیں پر اُس خیال سے دُکھ پہنچتا تھا جس سے انسان اپنے حقیقی مطمحِ نظر کو بھول جائے اور اس کی نگاہیں صرف اپنے ذاتی یا جماعتی مفاد پر لگی رہیں۔ وہ گویا مولانا رُوم کے اس ارشاد کی ترجمانی

ہر نفس آوازِ عشق می رسد از چپ و راست
ما بفلک می رویم عزمِ تماشا کراست!

سیاسی اور اجتماعی رنگ میں کرنا چاہتے تھے۔ پنجاب کے دہقان سے انھوں نے یُونہی سوال نہیں کیا تھا:

بتا کیا تیری زندگی کا ہے راز        ہزاروں برس سے ہے تو خاک باز

اور یُونہی اس سے التجا نہیں کی تھی:

بخاکِ وطن دانہ دل فشاں
کہ ایں دانہ دارد ز حاصل نشاں

دراصل یہی وہ زمین پیوستگی ہے جس کو جناب فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ روکنا چاہتے تھے، ورنہ فلاحی میں فی نفسہٖ کوئی عیب نہیں۔ عیب ہے تو یہی کہ وہ فرد کے صحیح نشوونما یا عالمگیر اخلاقی کردار میں حائل ہو جائے۔ بعینہٖ جب کسی آزاد، یا کسی ایسی قوم کے راستے میں جس کو آزادی کی طلب ہے فلاحت اور کاشتکاری کا مفاد آسانی کی بجائے مشکلات پیدا کر دے تو اس سے بجا طور پر قوم کے لیے ذلت

اور نجبت کا خطرہ ہے۔ بخاری: کتاب المزارعت میں جو یہ روایت آئی ہے کہ جس گھر میں آلاتِ زراعت داخل ہو جاتے ہیں وہ ذلیل ہو جاتا ہے اس سے شاید اسی امر کی تنبیہ مقصود ہے کہ ایسا نہ ہو فلاحی کی زندگی سے کسی سیاسی انقلاب یا اعلیٰ عزائم کی پرورش نہ ہو سکے۔

## غیبتِ کبریٰ

غیبتِ کبریٰ کا ذکر حضرتِ علامہ نے اس سلسلے میں کیا تھا کہ مسلمانوں کے یہاں اگر کبھی اربابِ حکومت اور اربابِ مذہب کے درمیان تفریق کا خیال پیدا ہوا تو محض تقسیمِ کار کی بنا پر۔ اس لیے نہیں کہ مسلمان مذہب اور سیاست میں ویسی ہی تفریق پیدا کرنا چاہتے تھے جیسے ریاست اور کلیسا میں مسیحی دنیا اور مسیحی دنیا کے زیرِ اثر عہدِ حاضر نے پیدا کی ہے۔ یہاں اس امر کی تفصیلی بحث کا تو ــــ کہ اسلام نے ریاست اور کلیسا، یا دین اور دنیا، یا مذہب اور سیاست میں کیوں تفریق نہیں کی ــــ موقع ہے نہ محل۔ اس کے لیے حضرتِ علامہ کی تحریروں سے رجوع کرنا چاہیے۔ البتہ غیبت کبریٰ کے سلسلے میں راقم الحروف نے جو حاشیہ لکھا ہے اس کی کسی قدر توضیح غیر مناسب نہ ہوگی۔

اثنا عشری عقائد کی رو سے یہ صرف امام کی شخصیت ہے جو دینی اور دنیوی دونوں لحاظ سے واجب الاطاعت ہے۔ لیکن جب سے امام مہدی جن کا ظہور آخری زمانے میں کسی وقت ہوگا ــــ اور جن کو اس لیے صاحب الزمان اور امام منتظر کہا جاتا ہے ــــ شہر سامرہ کے غار میں غائب ہو چکے ہیں۔ ان کی

غیبوبت کا آغاز ہو چکا ہے۔ مگر اس کے دو حصے ہیں۔ ایک غیبتِ صُغریٰ دُوسرا غیبتِ کبریٰ۔ غیبتِ صُغریٰ ۶۹ سال کا زمانہ ہے جس میں چار باب یکے بعد دیگرے ظاہر ہوئے۔ غیبتِ صغریٰ کے بعد غیبتِ کبریٰ کا طویل زمانہ شروع ہوتا ہے جو اب تک قائم ہے اور جس میں شاید کسی باب کا ظہور نہیں ہُوا۔ لہٰذا جب تک امام منتظر ظاہر نہ ہو جائیں دُنیوی اُمور بادشاہ کے ہاتھ میں رہیں گے، دینی مجتہدین کے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ شیعہ حضرات نے مذہب کو سیاست سے الگ کر دیا ہے جیسا کہ پنڈت جی کے بیان سے مترشح ہوتا تھا۔

## تاریخِ مزارِ سلطان الھند

حضرتِ علّامہ نے اپنے انگریزی بیان میں لکھا تھا کہ سرنگاپٹم میں سلطان الہند کے مزار پر جو تاریخ کندہ ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"ہندوستان اور رُوم کی عظمت کا چراغ گُل ہو گیا۔"

اور جس کی بنا پر اُنھوں نے ایک شعر میں سلطانُ الہند کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

آں شہیدانِ محبت را امام!
آبروئے ہند و چین و رُوم و شام

لہٰذا راقم الحروف کو جستجو تھی کہ اس تاریخ کے اصل الفاظ معلوم ہو جائیں کیونکہ

اُوپر کے الفاظ حضرتِ علّامہ کی انگریزی عبارت کا ترجمہ ہیں۔ مگر پھر جیسا کہ قارئین ملاحظہ فرما چکے ہیں اصل تاریخ کے الفاظ جو عربی زبان میں ہیں حضرتِ علّامہ کو یاد نہیں رہ سکے اور نہ راقم الحروف تحقیق کر سکا کہ اُس کی اصل عبارت کیا ہے۔

## علمائے مصر

مَیں نے لکھا ہے علمائے مصر کے اس وفد میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس سے غلط فہمی کا احتمال ہے۔ مطلب یہ تھا کہ اس کی آمد سے کوئی خاص نتیجہ مُترتّب نہیں ہُوا۔

یہ وفد غیر منقسم ہندوستان میں کیوں آیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ۱۹۳۶ میں جب اچھوتوں کی ایک کانفرنس منعقد ہُوئی اور اُس میں یہ قرارداد منظور کی گئی کہ انھیں چاہیے ہندو دھرم چھوڑ کر کوئی دُوسرا مذہب اختیار کر لیں تو اس پر جمعیتِ تبلیغِ اسلام نے بھی اپنی یہ کوشش تیز تر کر دی کہ اچھوت دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں۔ لیکن ہندوستان میں اچھوتوں کے اس فیصلے پر لے دے ہونے لگی تو مصر کے پرچوں میں بھی یہ خبر شائع ہُوئی کہ اچھوت اپنا مذہب بدلنا چاہتے ہیں۔ اس پر جامعۃ ازہر نے طے کیا کہ عُلما کا ایک وفد ہندوستان بھیجا جائے تاکہ وہاں جو حالات ہیں وُہ خود ان کا مطالعہ کرے اور دیکھے کہ اچھوتوں میں تبلیغِ اسلام کا کوئی امکان ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں شیخ ازہر جناب مصطفٰی المراغی مرحوم نے حضرتِ علّامہ سے بھی دریافت کیا اگر ان کی رائے میں وفد کا بھیجنا مناسب ہے تو کیا وفد کو کچھ ترجمان مل جائیں گے؟ حضرتِ علّامہ نے المراغی

مرحوم کا یہ خط روزنامہ انصاف میں شائع کر دیا اور اس کی اطلاع سیّد غلام بھیک نیرنگ مرحوم و مغفور کو بھی کر دی جن کا جمعیت سے خاص تعلق تھا۔ لیکن اس دوران میں یہ مصری وفد ہندوستان آچکا تھا اور حضرتِ علامہ بھی سیّد صاحب مرحوم کو خطا پر خط لکھ رہے تھے۔ مکاتیبِ اقبال مرتبہ شیخ عطاء اللہ صاحب کے پہلے یا دوسرے مجموعے میں غالباً حضرتِ علامہ کے یہ خطوط سیّد غلام بھیک نیرنگ کے نام موجود ہیں جن سے اس سلسلے میں مزید معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ بہرحال وفدِ مذکور ۱۱ دسمبر ۱۹۳۶ کو بمبئی پہنچا۔ ۲۰ دسمبر کو دہلی اور شروع جنوری میں لاہور۔ وفد کا حقیقی مقصد تو یہی تھا کہ تبلیغ اسلام کے لیے مناسب مواقع پیدا کرے۔ چنانچہ معتمدِ وفد شیخ حبیب احمد آفندی اور نائب معتمد وفد شیخ صلاح الدین التجار جو انگریزی سے خوب واقف تھے۔ اس مسئلے پر معلومات جمع کرتے رہے اور جہاں کہیں گئے مقامی سربرآوردہ حضرات علیٰ ہذا تبلیغی انجمنوں سے اس سلسلے میں مشورہ بھی کیا۔ لیکن پھر جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں حضرتِ علامہ اپنے نقطۂ نظر سے مجبور تھے کہ ارکانِ وفد کو ان مسائل کی طرف متوجہ کرتے جو درحقیقت عالمِ اسلام کو درپیش ہیں، کیونکہ عالمِ اسلام کا مسئلہ محض تبلیغِ اسلام سے حل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا یہ جو مجھے اس سلسلے میں حضرتِ علامہ کی گفتگوؤں کی طرف مختصراً اشارہ کرنا پڑا تو اس کی وجہ بھی یہی تھی۔ چنانچہ ہوا بھی یہی کہ مارچ ۱۹۳۷ میں جب یہ وفد واپس مصر پہنچا تو ان تمام گفتگوؤں اور معلومات کے باوجود ارباب ازہر کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکے۔ حاصل کلام یہ کہ وفد کی آمد سے کوئی خاص نتیجہ مترتب نہیں ہوا۔

ہاں میں یہ لکھنا بھول گیا کہ اسپنسر ہوٹل کی دعوت میں لاہور کے بہت سے سربرآوردہ حضرات موجود تھے۔ کھانے کے بعد شرکائے دعوت کی تصویر بھی لی گئی جس میں حضرت علامہ کی تصویر نہایت صاف آئی ہے، مگر جس کو دیکھ کر فوراً اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس زمانے میں وہ کس قدر نحیف اور کمزور ہو گئے تھے۔ میرا خیال ہے اس کے بعد شاید ان کی کوئی تصویر نہیں لی گئی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ۱۹۳۷ کی اس تصویر کی اہمیت کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

## طباعتِ کلام اور ترجمۂ خطبات

ایک خیال جو ان مکتوبات کو دیکھ کر قارئین کے دل میں پیدا ہوگا وہ یہ کہ جب حضرتِ علامہ کی یہ خواہش تھی کہ ان کی تصنیفات مطبعِ جامعہ میں طبع ہوں اور مطبع بھی اسے اپنے لیے ایک سعادت تصور کرتا تھا تو پھر کیا وجہ ہے کہ پیامِ مشرق کے سوا حضرتِ علامہ کی اور کوئی تصنیف اس میں طبع نہ ہو سکی۔ میں سمجھتا ہوں مجھے اس امر کی کسی قدر صراحت کر دینی چاہیے۔

بات یہ ہے کہ مطبعِ جامعہ نے پیامِ مشرق کی طباعت جس حُسن و خوبی اور ذمہ داری سے کی تھی اس سے حضرتِ علامہ بہت خوش تھے، اتنے خوش کہ انھیں گویا اس سے ہمدردی سی ہو گئی تھی۔ اور اس لیے انھیں خیال پیدا ہوا کہ باقی سب کتابیں بھی وہیں طبع ہوں۔ پھر جب مجیب صاحب پیامِ مشرق کی طباعت کے سلسلے میں لاہور آئے اور حضرتِ علامہ سے جامعہ کے بدلتے ہوئے احوال اور آیندہ عزائم کے بارے میں باتیں کیں تو حضرتِ علامہ کی دلچسپی اس سے دفعۃً

بڑھ گئی۔ بہر حال راقم الحروف کی ہمیشہ سے یہ کوشش تھی کہ جامعہ کو کسی طرح حضرتِ علامہ کی سرپرستی حاصل ہو جائے اور وہ قومیت اور وطنیت کے اس تنگ حلقے سے باہر نکل سکے جس میں اس کا ذہن گویا اب تک محبوس تھا۔ چنانچہ اس کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ جامعہ اور حضرتِ علامہ کے درمیان کوئی اس طرح کا رابطہ قائم ہو جائے کہ جامعہ اور اربابِ جامعہ کو ان سے کچھ ذاتی تعلق محسوس ہونے لگے تاکہ اربابِ جامعہ بلا تکلف ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہیں۔ مگر پھر ہوا یہ کہ جامعہ کی مالی حالت دفعۃً خراب ہو گئی اور مجیب صاحب جیسا چاہتے تھے مطبع کو وسعت نہ دے سکے۔ جامعہ اور اہلِ جامعہ کے لیے یہ زمانہ بڑی عسرت کا تھا۔ لہٰذا باوجود مسلسل کوششوں کے نہ جامعہ کی مالی دشواریوں کا کوئی حل نکلا نہ مطبعِ جامعہ کی حالت سنبھل سکی۔ حضرتِ علامہ کے کلام کی جیسی طباعت ہونی چاہیے تھی اس کے لیے خاص اہتمام کی ضرورت تھی۔ لیکن حالات ایسے تھے کہ اس قسم کے اہتمام کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ اس لیے جب بھی حضرتِ علامہ یہ ارشاد فرماتے کہ ان کا ارادہ بانگِ درا یا بالِ جبریل یا کسی اور مجموعۂ کلام کو چھپوانے کا ہے تو صورت یہ ہوتی کہ اہلِ جامعہ بہ سبب ارادت مندی کھل کر بات نہیں کر سکتے تھے۔ حالانکہ یہ معاملہ ایک طرح سے کاروباری تھا۔ ان معنوں میں کہ کاروباری پہلو کو نظر انداز کر دینا نہ مطبعِ جامعہ کے لیے ممکن تھا نہ حضرتِ علامہ کے لیے۔ حضرتِ علامہ بھی گویا مروّۃً خاموش رہتے حتیٰ کہ آگے چل کر جب علالت کے باعث ان کے تمام ذرائعِ آمدنی مسدود ہو گئے تو ان کے لیے بھی کھل کر بات کرنا مشکل ہو گیا۔ لہٰذا طباعتِ کتب کے متعلق جو گفتگو

شنید سالہا سال سے جاری تھی بے نتیجہ رہی۔ پھر جب روز روز کی مالی مشکلات اور بعض دوسری مجبوریوں کے باعث جامعہ کا تعلق مطبعِ جامعہ سے برائے نام رہ گیا اور کاروباری غرضمندیوں نے شرائط اور معاہدوں کی جگہ لی تو یہ گفت و شنید ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی۔

## خطبات

ایک اور خیال جو شاید قارئین مکتوبات کے دل میں پیدا ہوگا وہ یہ کہ حضرتِ علامہ کے انگریزی خطبات کا ترجمہ جسے تشکیلِ جدیدِ الٰہیاتِ اسلامیہ کے نام سے شائع کیا جا رہا تھا آخر کیا ہوا۔ لہٰذا یہ امر بھی کسی قدر وضاحت چاہتا ہے۔

جیسا کہ مکتوبات میں راقم الحروف نے صراحت کر دی ہے خطبات کے ترجمے کی ابتدا ۱۹۳۰ میں ہوئی۔ ۱۹۳۱ میں جب اس کا معتدبہ حصہ مکمل ہو چکا تھا ایک ایسے حادثۂ الیمہ کے باعث جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے اس کا سلسلہ دفعۃً روک دینا پڑا۔ ۱۹۳۱، ۱۹۳۲ اور ۱۹۳۳ میں حضرتِ علامہ کا وقت زیادہ تر سفر میں گزرا۔ دو مرتبہ انگلستان تشریف لے گئے اور پھر اس کے بعد افغانستان۔ اس اثنا میں ترجمے کی تکمیل ہو چکی تھی لیکن ایک تو خطبات کے جدید نسخے کا جو آکسفرڈ میں چھپ رہا تھا انتظار تھا۔ حضرتِ علامہ چاہتے تھے اس میں جو معمولی تبدیلیاں کی گئی ہیں ترجمے میں ان کا لحاظ رکھ لیا جائے ثانیاً ۱۹۳۴ اور ۱۹۳۵ یہ دو سال جس حالت میں گزرے ان کا اندازہ قارئین نے مکتوبات سے کر لیا ہوگا۔ ۱۹۳۶

میں راقم الحروف دہلی سے لاہور منتقل ہوا تو حضرت علامہ کا مرض روز بروز
تشویش انگیز صورت اختیار کر رہا تھا۔ اندریں صورت اس بات کا موقع ہی
نہیں تھا کہ خطبات کی طباعت اور اشاعت کا اہتمام کیا جائے۔ یوں بھی
حضرت علامہ ایک زندہ انسان تھے اور ان کا فکری ارتقا تا دمِ مرگ جاری رہا۔
لہٰذا کچھ اس لیے کہ خطبات میں کئی ایک مباحث تشنہ رہ گئے ہیں اور کچھ
اس روش کو دیکھتے ہوئے جو علمی حلقوں نے خطبات کے بارے میں اختیار کی
ان کا جی چاہتا تھا کہ ان کی نظر فی الحقیقت جس مسئلے پر ہے اس سے تفصیل بلکہ
اور زیادہ شرح اور بسط سے بحث کریں۔ لیکن یہ خیال بھی بہ سبب علالت
پورا نہ ہو سکا اور خطبات کی اشاعت بھی رہ گئی۔

پھر جب ۱۹۳۸ میں حضرت علامہ کا انتقال ہو گیا تو خطبات کے اردو ترجمے
کی اشاعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ترجمہ حضرت علامہ کے ایما سے کیا گیا
تھا۔ اس کی طباعت اور اشاعت بھی سراسر حضرت علامہ کی مرضی پر موقوف تھی۔
راقم الحروف نے اس سلسلے میں جو کچھ کیا از رہِ امتثالِ امر کیا۔ لہٰذا ۱۹۳۸ کے بعد
جب کبھی احباب یا ناشر حضرات کی طرف سے اس کی اشاعت کی تحریک
ہوئی تو راقم الحروف نے اپنی معذوری کا اظہار کر دیا۔ یہ اس لیے کہ اخلاقاً اسے
ان کی اشاعت کا کوئی حق نہیں پہنچتا تھا۔ البتہ ۱۹۴۹ میں جب اُس وقت مجلس
لیکن اب بزمِ اقبال قائم ہوئی اور وہ سب مرحلے جو قانوناً اور اخلاقاً ان کی
اشاعت کے لیے طے کرنا ضروری تھے طے ہو گئے تو راقم الحروف نے پھر سے
مسودے کی نظرِ ثانی کی۔ چنانچہ یہ ترجمہ اب بزم کے زیرِ اہتمام شائع ہو رہا ہے۔

## علالت، علاج اور

طباعتِ کلام اور ترجمہ خطبات کی طرح ایک اور سوال جو شاید قارئین مکتوبات کے ذہن میں پیدا ہوگا وہ یہ کہ ۱۹۳۶ میں جب راقم الحروف دہلی سے لاہور چلا آیا تو پھر حکیم نابینا صاحب سے علاج معالجے کا سلسلہ کیسے جاری رہا۔ کیونکہ اپریل ۱۹۳۴ سے لے کر مارچ ۱۹۳۶ تک میری حیثیت حکیم صاحب مرحوم اور حضرتِ علامہ کے درمیان ایک واسطے کی تھی۔ قارئین کو شاید اس امر کی جستجو ہو کہ اس سلسلے میں پھر کوئی واسطہ قائم ہوا تو کیونکر۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک تو حضرتِ علامہ کے برادرِ نسبتی دہلی ہی میں موجود تھے۔ چنانچہ مکتوبات میں ان کے قیامِ دہلی کی طرف اشارہ بھی موجود ہے۔ آگے چل کر حضرتِ علامہ کے حقیقی بھتیجے شیخ اعجاز احمد صاحب بھی دہلی پہنچ گئے۔ لہٰذا حضرتِ علامہ کو حکیم صاحب کے علاج میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی۔ اس اثنا میں انھوں نے ایک مرتبہ دِلّی کا سفر بھی کیا اور حسبِ سابق حکیم صاحب سے مل کر دوا اور پرہیز کے بارے میں پھر اپنا اطمینان کر لیا۔ یوں بھی وہ حکیم صاحب مرحوم سے براہِ راست خط و کتابت کر لیتے۔ مختصراً یہ کہ دہلی سے دواؤں کی آمد کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ یہ سلسلہ جب ہی ٹوٹا جب حکیم صاحب مرحوم حیدرآباد تشریف لے گئے اور گو ڈاکٹر مظفر الدین قریشی مرحوم، پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی کے توسط سے اس زمانے میں بھی دوائیں برابر حضرتِ علامہ کی خدمت میں پہنچتی رہیں، لیکن اس آسانی سے نہیں جیسے دہلی سے یعنی جب حکیم صاحب مرحوم کا

مطلب دہلی میں تھا اور دہلی سے لاہور یا لاہور سے دہلی آنا جانا، یا کسی چیز کا منگوانا ایک معمولی سی بات تھی۔

گو یا ۱۹۳۸ آیا تو حکیم صاحب مرحوم کا سلسلۂ علاج ٹوٹ گیا اور اس کی سب سے بڑی وجہ حکیم صاحب مرحوم کی ضعیف العمری اور بڑھتا ہوا ضعف و انحطاط تھا۔ علیٰ ہذا حیدر آباد اور لاہور کا فاصلۂ عظیم۔ اب یہ ناممکن تھا کہ حضرتِ علامہ جس طرح دہلی تشریف لے جایا کرتے تھے حیدر آباد بھی تشریف لے جاتے یا حکیم صاحب مرحوم ہی کو لاہور آنے کی دعوت دیتے۔ خط کا جواب بھی معمولاً ہفتہ عشرہ میں آتا تھا۔ ٹیلیفون خارج از بحث تھا اور تار سے کام نہیں چل سکتا تھا۔ لہٰذا حکیم صاحب سے خط و کتابت کا سلسلہ اگرچہ برابر جاری رہا اور اُن کی دوائیں بھی پہنچتی رہتیں لیکن علاج معالجے کا سلسلہ اب فی الحقیقت مقامی اطبا کے ہاتھ میں تھا۔ اِس دوران میں ایک مرتبہ یہ بھی تجویز ہوئی کہ حکیم صاحب سے لاہور تشریف لانے کی درخواست کی جائے مگر پھر اس کا پورا ہونا ممکن نظر نہیں آتا تھا اس لیے یہ تجویز بھی رہ گئی۔ حضرتِ علامہ کی البتہ یہ خواہش ضرور تھی کہ حکیم صاحب اگر کسی طرح لاہور آسکیں تو بہت خوب ہو وہ انھیں پھر سے دیکھ لیں۔

'حکیم صاحب لاہور آسکیں اور انھیں دیکھ لیں' اس خواہش کا اظہار حضرتِ علامہ نے الفاظ میں تو کبھی نہیں کیا لیکن ان کے تیمار داروں کے لیے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں تھا کہ ان کی یہ خواہش ضرور تھی کہ حکیم صاحب لاہور آتے اور ان کی حالت دیکھتے۔ یہ ویسے بھی ایک قدرتی امر تھا، کیونکہ انھیں جتنا بھی

فائدہ ہُوا تھا حکیم صاحب ہی کے علاج سے ہُوا تھا اور ان کے تیمار دار بھی محسوس کرتے تھے کہ حکیم صاحب ہی کا علاج باقی سب معالجات سے زیادہ کامیاب اور موثر ثابت ہُوا۔ مگر پھر اس کے علاوہ حکیم صاحب کا زہد و تقویٰ ان کی عبادت و ریاضت بھی حضرتِ علامہ کو بہت پسند تھی اور وہ ان کے خلوص و توجہ کے دل سے قدر دان تھے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود حضرتِ علامہ نے اپنی بیماری کو کبھی وہ اہمیت نہیں دی جو عام انسان دیا کرتے ہیں۔ بے شک انھیں اپنی صحت کا بڑا خیال تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس سلسلے میں جو خطوط لکھے ہیں، یا ان میں جس طرح ایک ایک بات کو بہ تفصیل بیان کیا، یا ان کی وضاحت چاہی ہے اس سے کسی کو انکار نہیں۔ لیکن علاج معالجے پر ان کی توجہ کا حقیقی محرک زندگی کی حرص اور طمع نہیں تھی۔ یہ ساری کاوش اس لیے تھی کہ وہ زندگی کے قدر دان تھے اور اسے اللہ کی نعمت سمجھتے تھے۔ لہٰذا دوا اور پرہیز یا غذا کے بارے میں ان کا اہتمام قدرِ نعمت کی بنا پر تھا۔ ان کا جی چاہتا تھا وہ پھر سے تندرست اور صحت یاب ہوں اور ان ارادوں کی تکمیل کر سکیں جو اسلامی فکر اور اسلامی فقہ کی تشکیلِ جدید، علیٰ ہذا تعلیماتِ قرآنی کی تشریح کے متعلق ان کے دل میں پیدا ہو چکے تھے۔ رسالہ اردو کے اقبال نمبر میں راقم الحروف اس امر کی طرف اشارہ کر چکا ہے کہ ان کے ذہن میں کس طرح بعض نئے نئے افکار اُبھر رہے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ ان کے پیشِ نظر اسلامی تعلیمات کو ازسرِ نو اُجاگر کریں۔

یہ حالات تھے جن میں اگر کوئی انھیں دیکھتا جیساکہ دیکھنے والے دیکھتے تھے تو اسے معلوم ہو جاتا کہ حضرتِ علامہ ایک زندہ اِنسان ہیں اور اِس لیے زندگی سے انھیں جو ذوق و شوق ہے اس میں کوئی اِضمحلال پیدا نہیں ہُوا۔ نہ طرح طرح کے عوارض اور مرض کی روز افزوں شدت سے ان پر یاس و نااُمیدی کی کوئی کیفیت طاری ہوئی نہ اس سے گھبرا کر انھوں نے کسی تلخی اور افسردگی کا اِظہار کیا۔ وہ ہر لحظہ 'زندہ' تھے اور اس سے کہیں بڑھ کر یہ کہ ان کا دل زندہ تھا۔ دورانِ علالت میں بھی ان کے افکار میں وہی تازگی، جذبات میں وہی نزاکت اور طبیعت میں وہی شگفتگی قائم رہی جو شروع ہی سے ان کے اندر چلی آرہی تھی۔ مگر پھر ان سب باتوں کے باوجود اس زمانے میں ان کا بدن جس طرح ایک لاعلاج بیماری کی نذر ہو رہا تھا ویسے ہی ایک دوسری بیماری نے جس کا علاج ممکن بھی تھا اور مطلوب بھی ان کے دل و دماغ کو پریشان کر رکھا تھا۔ اس بیماری کا تعلق ان کے ذاتی جسد سے نہیں تھا، بلکہ اس جسد سے ـــ ملی و اسلامی ـــ جس کا وہ خود بھی ایک حصّہ تھے اور جس کے علاج کی فکر انھیں شب و روز دامنگیر رہتی تھی۔ یہ شعر انھوں نے دورانِ علالت ہی میں کہا تھا:

دلِ مُردہ دِل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ!

کچھ ایسے ہی یہ:

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر    تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ

دراصل ان کی آنکھیں ایک آنے والے انقلاب کو دیکھ رہی تھیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ان کی نگاہیں اس نہایت ہی اندوہناک اخلاقی اور ذہنی انحطاط پر بھی لگی تھیں جس میں مسلمان شاید آج بھی گرفتار ہیں اور جس کی وجہ سے ان کا شیرازۂ ملی درہم برہم ہو رہا ہے۔ وہ جب یہ سوچتے کہ عالمِ انسانی ایک کروٹ لے رہا ہے تو اپنے اس اضطراب اور تشویش کو مخفی نہیں رکھ سکتے تھے کہ ہم مسلمان ان بدلتے ہوئے حالات میں اپنے مرتبہ و مقام پر شاید ہی قائم رہ سکیں۔

اس اضطراب اور پریشانی میں ان کی نگاہیں کبھی تو اس تہذیب و تمدّن کی طرف اُٹھ جاتیں جس کا نشو و نما ایک فیصلہ کُن مرحلے میں داخل ہو چکا ہے اور جس سے نوعِ انسانی کو طرح طرح کے خطرات درپیش ہیں؛ کبھی وطن اور وطن سے باہر بلادِ اسلامیہ کی جانب جہاں مسلمانوں کی ہستی طرح طرح کے آلام و مصائب میں گرفتار ہے۔ پھر یہ مغربی استعمار اور شہنشاہیت کا ریلا ہو یا وطنیت پسندی اور نئی نئی سیاسی معاشی قدروں کا طوفان جس نے ان کے لئے ہزاروں فتنے پیدا کر رکھے تھے اور جن کو دیکھتے ہوئے حضرت علامہ کی رائے تھی کہ اگر اس خلفشار میں عالمِ اسلام نے اپنے لئے کوئی سہارا تلاش نہیں کیا تو اس کی ہستی اور بھی مخدوش ہو جائے گی۔ وہ فرماتے یہ سہارا بجز اسلام کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا حضرت علامہ ایک بیماری کے ذکر سے فارغ ہوتے ـــــ وہ ذکر جو خیریتِ مزاج یا دوا اور پرہیز کے بارے

معمولی استفسارات، یا کسی نئے اور پُر لطف عارضے کے بیان میں چند ساعتوں سے زیادہ جاری نہ رہتا ـــ تو دوسری بیماری کی داستان چھیڑ دیتے۔ اس کے اسباب و علل، ظاہری اور باطنی عوارض، اثرات اور نتائج، اس کے دکھ درد، علاج اور معالجے، دوا اور پرہیز کا۔ اس حالت میں ان کے خیالات کہیں سے کہیں پہنچ جاتے اور ان کا ذہن کیا کچھ نہیں سوچتا۔ وطنی سیاست اور اس میں مسلمانوں کے صحیح موقف کو، عالم اسلام کی مشکلات، اُمم اسلامیہ کے اجتماعی شئون، دول فرنگ کی سیاست کاریاں، جمہوریت، عمومیت، اشتراک، اتحاد آزادی، استخلاص بالفاظ دیگر تہذیب جدید یا دنیا کے بدلتے ہوئے احوال یہ سب باتیں ان کے سامنے ہوتیں۔ وہ ان کا تجزیہ کرتے، تبصرہ فرماتے، لوگوں کی رائے سنتے، خود اپنے خیالات کی وضاحت، علیٰ ہٰذا مخالف و موافق، ہر طرح کے خیالات اور ہر طرح کے نظریات کی بحث و تمحیص میں ایک غیر متزلزل یقین اور غیر متزلزل اعتماد کے ساتھ یہ کہتے کبھی نہ تھکتے کہ اس صورت حالات میں امت اسلامیہ کیا عالم انسانی کا کوئی موقف ہے تو صرف اسلام۔ اس کی وجہ تھی ان کی غیر معمولی فراست اور پختگی ایمان جس سے پھر ان کے اندر رہ رہ کر یہ ولولہ پیدا ہوتا کہ مسلمانوں کا ذہن صدیوں سے جن تاریکیوں میں الجھ گیا ہے ان کو دور کیا جائے۔ ان کی تمنا تھی کہ اسلام، اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب و تمدن کے صاف و سادہ حقائق پر ہماری اپنی جہالت اور بے خبری یا زوال و انحطاط نے جو پردہ سا ڈال دیا ہے اسے چاک کر دیں۔ بغیر اس کے یہ کیسے ممکن ہے کہ اسلام کے پیش نظر حیات فرد اور جماعت کا جو نصب العین اور تقدیر انسانی کا جو تصور ہے اس کی ترجمانی ہو سکے۔

یہ آرزو تھی جس میں کبھی وہ یوں سوچتے کہ یہ شاید ایک ادارہ ـــ معارف ـ ہوگا جس سے مسلمانوں کی تجدیدِ فکر ہو سکے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ کس کس سے دریافت نہیں کرتے ـــ علما سے، فقہا سے، حضرات صوفیہ سے، اربابِ علم و حکمت اور فرہنگ و سیاست سے ـــ کہ ان کی معلومات اور ان کا مشورہ ان مسائل کے بارے میں کیا ہے جو ماضی اور مستقبل کی تعبیر میں مسلمانوں کو درپیش ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ فقہِ اسلامی کی تشکیلِ نو میں قدیم و جدید کی کوئی جماعت مل کر کام کر سکے کیا اہلِ علم اس امر پر غور کریں گے کہ تاریخ کی اس حرکت میں جو عبارت ہے معاشرے کے پیہم رد و بدل، ارتقا اور نشو و نما سے ہم اپنے آپ کو اسلام کے سانچے میں کیسے ڈھال سکتے ہیں۔ ہم اپنے فکر اور عمل کی ترجمانی بحالت موجودہ کس رنگ میں کریں۔ ہماری انفرادیت اور ہماری اجتماعیت کا تقاضا کیا ہے۔ ہم اپنی سیاست اور اپنی معاشرت میں کیا راستہ اختیار کریں۔ ہم اپنی حیاتِ ملی اور وطنی میں جس مرحلے پر آ پہنچے ہیں اس میں زندگی کا رخ کس جانب ہو کہ ہم اپنا مقصود و منتہا حاصل کر لیں۔ آج جو مسئلہ ہمیں درپیش ہے یہی ہماری اس سرزمین سے باہر ہر اس ملک اور قوم کو جو اسلام سے وابستہ ہے اور اس لیے یہ مسئلہ سارے عالمِ اسلام کا ہے، مگر جس کو اصولاً یا عملاً کسی لحاظ سے دیکھیے ایک دوسرے یعنی عالمِ انسانی کے مسئلے سے جو گویا اسلام کا حقیقی مسئلہ ہے الگ نہیں رکھا جا سکتا۔ وہ یہ سوچتے اور بظاہر اس سوچ میں اپنے آپ کو تنہا پاتے۔ لیکن وہ تنہا نہیں تھے، بلکہ درحقیقت ساری امت سے سرگرمِ سخن معلوم ہوتا تھا ان کا ذہن دنیا بھر کے مسائل میں الجھ گیا ہے اور وہ ان کے قریب سے قریب اور راستے سے اور نئے پہلوؤں کے ساتھ ان کے بعد سے بعید اور اعلیٰ سے

اعلیٰ مظاہر کو یوں واشگاف دیکھ رہے ہیں کہ یہ عالم اسلام بلکہ عالم انسانی اس کا ماضی بہ مستقبل ایک وحدت بن کر ان کے سامنے آجاتا ۔ اللہ اکبر یہ کیا دل تھا اور کیا دماغ کہ جسے یہ کہ کر بھی "مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو" سارے جہان کی فکر تھی ۔ ان کے نکتہ چیں کہتے: انہیں اس بات کا علم نہیں، وہ اس بات سے بے خبر ہیں، مگر انہیں خود ان باتوں کی اتنی بھی خبر نہیں تھی جتنی حضرت علامہ کو ان کے نزدیک "بے خبری" کے باوجود ان کی اپنی باتوں کی۔ وہ نہیں سمجھتے تھے کہ اس ساری کاوش اور دلسوزی کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ عالم اسلام پھر کلمہ توحید پر جمع ہو جائے کہ یہی اس کی جمیعت کا راز ہے۔ وہ سمجھ لے یہ صرف حضور رسالتمآب صلعم کی ذاتِ گرامی ہے جس کا عشق ہمارے لیے سرمایۂ زندگی ہے۔ لیکن اس کے لیے ہمیں اس کی اندرونی گہرائیوں اور باطن کا رخ پڑے گا، پھر فرد اور جماعت کی ہستی ہیں اس کے مظاہر کا تارجہ ایک ہر لحظہ فعّال اور سر تا سر خلاقِ وجود کی حیثیت سے اس کے استحکام اور نشو و ارتقا کا عمل جاری رہے ۔ یہ ہوگا تو ہم پر یہ حقیقت بھی منکشف ہو جائے گی کہ ہماری سعادت اور کامرانی کا فی الواقعہ کوئی راستہ ہے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی کے اسوۂ حسنہ کا اتباع ۔

اللّٰھمّ صلّ علیٰ سیّدنا و مولٰینا محمّدٍ و بارک وسلّم

○

# اشاریئے

## اشاریہ الف ... فہرست مکتوبات



## اشاریہ ب ... فہرست عنوانات

## اشاریہ ج . . . فہرست مقامات و ادارات

## اشاریہ ... فہرست اسما

PRINTED AT
FUNOON PRESS LAHORE